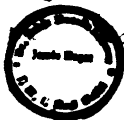


DUE DATE

Cl. No.________ Acc. No. 123217

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

عصری ادب



جس شمارے میں

- گوشہ [illegible] یوسفی
- خوشامدی ادب کا عروج
- میری بڑی مصیبتیں۔





ساہتیہ اکادمی کی نئی اردو کتابیں

ہندوستانی ادب کے معمار سیریز

		روپے
محمد قلی قطب شاہ	مسعود حسین خاں	۱۰
راجندر سنگھ بیدی	وارث علوی	۱۰
مصحفی	نورالحسن نقوی	۱۰
حیدر علی آتش	محمد ذاکر	۱۰
تلوک چند محروم	[illegible]	۱۰

انگریزی انتھالوجی

راجندر سنگھ بیدی کے منتخب افسانے	گوپی چند نارنگ	۶

تراجم

[illegible]	[illegible]	۱۰
[illegible]	[illegible]	۱۰
ٹی پی کیلاسم	[illegible]	۱۰
فقیر موہن سیناپتی	[illegible]	۱۰
ویمنا	[illegible]	۱۰

فہرست مطبوعات اور تجارتی کمیشن کے لیے لکھیے:

ساہتیہ اکادمی سواتی بلڈنگ نزد برلا مندر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Asaf Ali Road Delhi

عصری ادب

شمارہ ۶۶ [illegible]

نگران

محمد حسن

مدیران

ڈاکٹر روشن آرا

سید بہاءالدین احمد

قیمت فی شمارہ ۔ بیس روپے

ادارۂ تصنیف

ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹

فون ۔ ۷۲۳۴۴۷۳

• ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سید بہاءالدین احمد نے [illegible] سے چھپواکر ادارۂ تصنیف، ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن دہلی ۹ [illegible]
(ساہتیہ کلا پریشد [illegible])

ترتیب

[illegible] BSIDIZED BY THE SAHITYA KALA
[illegible] PARISHAD FOR 200 COPIES

حرفِ آغاز

وقت شاید ایک نقطے پر آکر تھم گیا ہے۔
زمین، آسمان، موت، دن گردش میں ہیں مگر اسی طرح، بلکہ اس سے کہیں زیادہ گردش میں ہیں ہمارے روز و شب

۱۹۴۷ء میں زمین خون سے رنگین ہو گئی قصور ہمارا تھا تو اتنا کہ ہم نے ووٹ کی پرچی شاید غلط بکس میں ڈال دی اور نتیجے کے طور پر ہمارے جو نمائندے منتخب ہوئے انھوں نے ہمیں بیچ کھایا، بانٹ کھایا، ہمیں گھر سے بے گھر کر دیا، اپنے وطن میں اجنبی بنا دیا۔ لاکھوں مر گئے کروڑوں مہاجر ہو گئے، ہم نے صبر کر لیا چلو یہی قسمت کا لکھا تھا۔ حکومتیں جب بدلتی ہیں، ملک جب آزاد ہوتے ہیں تو زلزلے آتے ہیں، کھوپڑیوں کے مینار بنتے ہیں، چلو ہمارے بیٹوں کی کھوپڑیاں بھی تاریخ کے اس بے درد بے رحم مینار میں لگ گئیں دل کا کیسا ہی خون کیوں نہ ہوا ہو ہم نے صبر کی سل سینے پر رکھ لی۔

... پھر اس دن سے آج تک ہر مہینے کبھی کبھی بڑھتے فسادات کی آگ روشن رہی۔ گھر اجڑتے رہے بچے یتیم ہوتے رہے، بے زبان قتل ہوتے رہے اور ظلم کی تلوار کبھی فسادیوں کے ہاتھ میں تھی تو کبھی محتسبوں کے، کبھی گھر کو آگ لگانے والی مشعل غنڈوں نے جلائی تو کبھی انتظامیہ، لوگوں اور پولیس نے۔ ہم نے قتل و خون کے اس منظر میں ان روزانہ صبح و شام کی ذلتوں اور لعنتوں کا شمار بھی بھلا دیا جو مدتوں سے معمول بن چکی تھیں۔ زبان ہماری دیس بدر کر دی گئی تہذیب ہماری بے لباس ہوئی اور ہمارے بچے ہم سے ایسے بچھڑے کہ اپنے سگے ماں باپ نے خط لکھے تو وہ اسے پڑھ بھی نہ سکے کہ وہ مادری زبان پڑھنے سے محروم کیا جا چکا ہے۔

زمینِ وطن رنگ بدلتی رہی مگر ان سب رنگوں میں سب سے گہرا، سب سے دائمی رنگ ہمارے بہتے ہوئے خون ہی کا تھا جو ہماری رگ رگ سے ٹپک رہا تھا اور روش روش صحن صحن لالہ و گل کی آبیاری کر رہا تھا۔

— اسی طرح ۱۹۹۰ء آگیا اور اب کے برس کچھ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ منافرت کی

مستقل بنیادوں پر کھڑی کی جانے لگیں مذہبی بنیادوں پر جو ۱۹۴۷ء کو بھی فراموش کر دیں پانچ سو سال کے پرانے واقعات اور کہانی قصوں کی بنیاد پر تاریخ جھٹلائی اور فرضی تاریخ گڑھی جانے لگی کہ ہندوستان کے رہنے والے سیکولر شہری اور دیہاتی ایک دوسرے کو پھر کبھی آنکھ ملا کر دیکھ سکیں۔

بے شک یہ بھی پہلی بار ہی ہوا کہ ایک گاندھی نے نہیں ملک کے تمام سیکولر عناصر نے مل کر اس افکار کا مقابلہ کیا پہلی بار ہی، یہ بھی ہوا کہ حکومتِ وقت نے تمام مصلحتوں کو نہ سہی بہت سی مصلحتوں کو طاق پر رکھ کر اپنا کچھ فرض ادا کیا، مجرموں کی نشان دہی ہوئی جو دوسروں کو جیل بھیجا کرتے تھے۔ یا فساد کر کے دوسروں کے ہاتھ پاؤں تڑوایا کرتے تھے انھیں بھی جیل خانے کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا اور فسادیوں کے بھی کچھ ہاتھ پیر ٹوٹے۔ یہ بھی ہوا کہ سیکولرازم کے مسئلے پر سمجھوتہ کرنے کے بجائے حکومتِ وقت نے اپنی کرسی تیاگ دینے کی ہمت کی ـــــ یہ سب ہوا، مگر مستقل نفرت کا بیج تو بو ہی دیا گیا جس کی فصل وقتاً فوقتاً کاٹی جاتی رہے گی۔

ـــــ اور یہ المیہ اس ملک کے لیے بہت بڑا ہے جس کی آبادی میں صرف ۲۰ فیصد پڑھے لکھے ہیں جو اپنے دستخط کر سکتے ہیں، جہاں مہنگائی قحط کی سرحدوں کو چھو رہی ہے جہاں مفلسی ہے بھکمری ہے بے روزگاری ہے، جہالت اور بیماری ہے اور پانی کا قطرہ تک نایاب ہے۔

مگر کیا کریں خوابوں کے قافلے تو روکے نہیں رکتے۔ اس دھرتی سے جو پیار ہے وہ تو اندازہ ہی آتا ہے یہاں کے رہنے والوں پر جو بھروسہ ہے وہ ایسا اندھا ہے کہ اور کسی بات پر کان نہیں دھرتا، میرے لوگ ایسے پیارے ہیں بہک جاتے ہیں مگر ہمارے لیے سنگ نہیں ہو سکتے۔ رات ان کی آنکھوں پر بھی اترتی ہے مگر رات کا انجام بھی تو سب ہی کو معلوم ہے آخر اجالا تو آکر ہی رہے گا، ڈر یہ بات ہے کہ ہم صبح نہ دیکھ پائیں اور رات کی اسی تیرگی میں گم ہو کر رہ جائیں ـــ

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

باعثِ تاخیر



عصری ادب ۹ کا یہ شمارہ کوئی سال بھر بعد چھپ رہا ہے۔ معذرت واجب ہے۔ اس دوران لگ بھگ آٹھ مہینے بیرونِ ہند کے سفر میں گزرے ۔۔۔ یورپ اور مغربی ایشیا کے ملکوں میں۔ سفر پر روانگی سے قبل رسالے کی کتابت کرا کے ایک کرم فرما سے گزارش کر گیا تھا کہ براہِ کرم کاغذ خرید کر پریس بھجوا دیجیے گا، کاغذ کا بل وہاں سے ادا کر دوں گا۔ انھوں نے ہامی بھری مگر کچھ نہ کیا۔ نتیجہ تاخیر اور مزید تاخیر۔

لندن جانے کی داستان یہ ہے کہ خبر ہے بی سی سی آئی (بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل) نے اپنے دورِ اول میں جناب آغا حسن عابدی کی سربراہی میں لندن کے مرکزی مقام پکاڈلی سرکس میں بڑی دھوم دھام سے اردو مرکز کھولا تھا۔ کار پردازوں کو بھی معقول مشاہرہ ملتا تھا۔ لندن پہنچنے والے ادیبوں کی مہمان داری بھی ہوتی تھی اور جلسے بھی بڑے دھوم دھام سے ہوتے تھے مگر دروغ بر گردنِ راوی اخباروں سے اور برطانیہ اور امریکہ کی عدالتوں نے یہ دریافت کیا کہ بینک کا سارا کاروبار بیرونِ اور منشیات کے حاصل کردہ کالے دھن کو سفید بنانے کا تھا اور اس میں بڑے بڑے ملوث تھے حد یہ ہے کہ مجلس اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کا جہاز اس دھندے میں استعمال ہوا۔

— بینک کا کاروبار بند ہوا۔ سب سے پہلے امریکہ اور برطانیہ میں پابندی لگی

اور جنگ دوسروں کے ہاتھ فروخت ہو گیا۔ مگر اس سے قبل ہی الیگ کی سرپرستی سے محروم ہو۔ اردو مرکز لندن بند ہو گیا اور وہ بھی اس رسوائی سے کہ قرق امین سارا اثاثہ بمع قیمتی کتابوں کے اٹھالے گیا۔

لندن کی اردو برادری کے لیے یہ حادثہ سخت تھا۔ مجاہد ترمذی نے ہمت کی اور کسی طرح اردو سینٹر کا ڈول ڈالا۔ بیکر اسٹریٹ میں ایک دفتر کا انتظام کیا گیا۔ مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی کہ اردو سینٹر لندن کے ریڈنگ روم کا افتتاح کروں اور سنٹرل کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے اردو سنٹر کی سرگرمیوں کا خاکہ تیار کروں اور اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کردوں۔ سنٹرل کمیٹی کی دوسری رکن ماسکو کے مشرقی انسٹی ٹیوٹ کی اردو کی پروفیسر اینا سوورووا مقرر ہوئیں۔ غرض اردو سنٹر لندن کی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ سے ایک معاہدہ ہوا اور دونوں اداروں نے باہمی اشتراک سے کتابوں کی تصنیف ترجمے اور طباعت کے پروگرام بنائے اور ماہانہ جلسے ہونے لگے۔ مئی ۱۹۹۲ء میں عالمی اردو کانفرنس کا بھی منصوبہ بنایا گیا۔

یہاں سے نمٹ کر اور خلیجی جنگ نمٹا کر مغربی ایشیا پہنچا۔ یہاں بھی اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام پایا۔ جشن مجروح بھی اسی زمانے میں ہوا۔ یہ پہلا نہیں دوسرا جشن ہوگا جو کسی ہندستانی اردو شاعر کے اعزاز میں منعقد ہوا۔ خوشی ہوئی مگر اس کا افسوس بھی ہوا کہ اب عالمی سطح پر پاکستان کے اردو والوں اور ہندستان کے اردو والوں میں خلیج بڑھتی جارہی ہے اور ترقی پسند تحریک کے ادیبوں والی یگانگت اور محبت اب ختم ہو رہی ہے۔

اس سارے عرصے میں دو باتوں کا شدید احساس رہا۔ ایک یہ اتفاق کہ اردو دنیا کے ۳۲ ملکوں میں پڑھی اور پڑھائی جارہی ہے۔ یورپ، ایشیا اور امریکہ کے کم سے کم ایک درجن ملکوں سے اردو کے رسالے اور اخبار نکل رہے ہیں اور کم سے کم دو درجن ٹیلی ویژن اور ریڈیو اسٹیشن اردو پروگرام پیش کرتے ہیں روزنامہ

میگزین لندن کی اشاعت چالیس ہزار سے زیادہ ہے۔ غرض عالمی سطح پر اردو کا کام کرنے والوں کا ان ملکوں میں مرکزیت پیدا کرنے کے مواقع بھی ہیں اور امکانات بھی لیکن اس بات کا رونا کہ اردو کی سرپرستی اب ناجائز کاروبار کے ہاتھ میں آتی جا رہی ہے گویا ادب بھی شاعری تو صرف سامانِ تجارت بنتی جا رہی ہے۔ اس سے ہونے والی آمدنی کا بہت تھوڑا سا حصہ بچارے شاعروں کو ملتا ہے جو غیر ملکی زرمبادلہ میں ہونے کی وجہ سے ہندستانیوں اور پاکستانیوں کو بہت معلوم ہوتا ہے مگر دراصل اس کی منفعت اشتہاروں کی بدولت منتظمین کو جاتی ہے اور ان کے زمرے میں رشتے خاصے قابل اعتراض ہوتے ہیں۔

• عصری ادب کا یہ شمارہ اس لیے بطور خاص غیرتِ فن کی نذر ہے۔ آج سے پہلے شاید فن کو شاید ہی کبھی ایسے نازک مراحل سے گزرنا پڑا ہو۔ ایک طرف بیرونی اور منشیات کا دھندہ کرنے والوں نے ادب کی سرپرستی کی ٹھانی ہے اور اس طرح اپنے غیر قانونی دھندوں کو خاصہ قابل احترام بنانے کا منصوبہ پورا کر لیا ہے۔ بھولے بھالے انقلابی شاعر اور ادیب بھی اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ دوسری طرف انعامات، کرسیاں، تمغے اور چھوٹے بڑے ایسے لالچ ہیں کہ اچھے خاصے بیدار مغز اور محتاط اہل فن بھی دام ہم رنگ زمیں کو نہیں دیکھ پاتے۔
عصری ادب کا یہ شمارہ اسی دام ہم رنگ زمیں کی نشان دہی کی کوشش ہے۔
پہلا اور دوسرا اہم گوشہ شخصیات سے متعلق۔ اس بار اس شمارے میں گوشۂ مشتاق یوسفی کے علاوہ مجاز پر ان کے رفیق دیرینہ نصیر حیدر کا مضمون عظیم بیگ چغتائی پر ان کے صاحب زادے کا مضمون اور بلراج ساہنی پر کنول نین پرواز کے مضمون کی قسط شامل ہے۔ مجاز نے اردو شاعری میں پہلی بار جدید اور سائنسی مزاج کو عام کیا اور وسیع تر حسیت اور جدید تہذیبی طرز کو نظم کیا اور پھر مجاز کی طرحدار زندگی جو مسلکوں کو خاطر میں لائے بغیر قلندرانہ گزری۔

عظیم بیگ چغتائی کی زندگی کے وہ گوشے مذکورہ مضمون میں سامنے آئے ہیں جو ابھی تک نظروں سے پوشیدہ تھے عصمت کے خاکے دوزخی میں بھی ان کا ذکر نہیں۔ اس اعتبار سے یہ خاصے کی چیز ہے۔

اس بار یورپ کا سفر بڑا سبق آموز اور عبرت خیز تھا۔
جو کچھ پڑھا اور دیکھا، اس سے یہ عقیدہ پختہ ہوا کہ دنیا کے چلانے والے تو دراصل ہیروئن اور ڈرگ کا دھندہ کرنے والے ارب پتی ہیں، جو ملکوں ملکوں راج کرتے ہیں۔ بش اور گریا چیف ہوں یا نواز شریف اور نرسمہاراؤ، یہ سب تو محض کٹھ پتلیاں ہیں ان کٹھ پتلیوں کو نچانے والے کوئی اور ہیں۔ کٹی کیلی نے صدر ریگن کی اہلیہ محترمہ کی سوانح حیات چھاپی، اس میں صاف صاف درج ہے کہ امریکہ میں مافیا کے سربراہ اور ہیروئن کے کاروبار کے سرپرست مالی وڈ کے مشہور گلوکار فرینک سانٹرا کے تعلقات مسز ریگن سے اس قدر قریبی تھے کہ جب یہ دونوں یکجا ہوں تو خود صدر ریگن خوابگاہ میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے اور امریکہ کے سیاسی اور تجارتی فیصلوں پر مسز ریگن کے ذریعے فرینک سانٹرا اثر انداز ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان ہیروئن کے سوداگروں ہی نے اسمگلرلہ کے سے عبدالقادر سائنس داں کے ذریعے ایٹم بم بنانے کا نسخہ پار کروایا اور حکومت تک پہنچایا۔ دوبئی ٹیلی ویژن پر تھائی لینڈ اور برما کی سرحد پر ہیروئن کے کاروبار کرنے والے سربراہ کی پرائیویٹ فوج کو مسلح پریڈ کرتے اور خطرناک دھندے کو چلاتے دیکھا اور اس فوج میں سو سے لے کر ۱۲ سال تک کے بچے بھی وردی پہنے شامل تھے۔ یہ اسمگلر اور اس کی فوج برما میں کمیونسٹ انقلابیوں کو کچلنے کے لیے بھی کام آتی ہے اور خود حکومت برما اور امریکی سلطنت اس سے ساز باز کرتی ہیں۔
چنانچہ ادب کیا چیز ہے زندگی پر اسمگلروں اور ہیروئن کے شہنشاہوں کی عملداری ہے۔ حکومتوں کو دولت اور خطے چاہئیں اور ان دونوں کا انتظام

انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ قتل بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور رشوت ستانی اور غیر کی طرح جاری عام ہے۔ فلم گوڈ فادر GODFATHER کی قسطیں افسانہ نہیں حقیقت کی محض دھندلی سی جھلک ہیں ۔۔۔ جس لیے زندہ رہنا ہے تو مافیا سے معاملہ کرو ورنہ کناڈا ہو چلے جاؤ۔

لندن میں نعیم اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اردو کو کب تک حسن و عشق، سیاست اور انقلاب تک محدود رکھو گے، رسالے ہیں تو محض ادبی اخبار ہیں تو ان پر مذہب اور سیاست کا سایہ، آج دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے اور اردو والوں کو۔ اس کی اطلاع خاص کی طرف توجہ، عدیہ ہے کہ اس قسم کے مضامین تک رسائی حاصل کرنے کے وسیلے بھی نہیں۔ سائنس کو ہم اردو والوں نے منہ ہی نہیں لگایا ہے۔ یوں بھی مجموعی طور پر ہم ماضی اور ادبیات کی رومانیت میں ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ حال اور مستقبل کے نئے سائنسی تقاضوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ سائنس اور سائنسی فکر سے اردو والے اپنی مشعلوں کے لیے نیا اجالا حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ "عصری ادب" کو اس باب میں کیا کرنا چاہیے؟

محمد حسن

رخصت ہونے والوں کو سلام عقیدت

سنہ [illegible] جناب بیکل عکبرآبادی، استاد ہلال احمد خاں، ڈاکٹر ظ انصاری، انور حسن نعیم، سراج انور، ملا عزیز مدنی، شعری بھوپالی، حامد الہ آبادی، حسین تاج مہ [illegible] العریاں خاور، کیف بھوپالی ہم سے رخصت ہو گئے۔ ادارہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور انھیں سلام عقیدت پیش کرتا ہے۔

ادارہ

آڑے ترچھے آئینے

خوشامدانہ ادب کا عروج

ایک اہم حادثہ ہوا بلکہ پچھلے بیس سال سے برابر ہو رہا ہے جانے انجانے اور اب تو یہ حادثہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ہمارے ذہنی اور جذباتی عمل کا حصہ بنتا جاتا ہے ستم یہ ہے کہ یہ حادثہ نہ توصرف اردو ادب تک محدود ہے نہ محض ہندوستان تک ـــــ کہ اس کا دائرہ سرطان کی طرح بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔

یہ حادثہ ہے ـــــ خوشامدانہ ادب کا عروج۔

اب اگر کوئی کہے کہ صاحب، میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور ذوقؔ نے بھی شاہوں کے قصیدے لکھے اور ایسے ایسے بادشاہوں کو رستم و افراسیاب سے آگے بڑھا دیا جنھیں زندگی بھر تلوار پکڑنی اور میدان جنگ کی زیارت کرنی بھی میسر نہ ہوئی تھی، تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس دور میں یہ طبقاتی شعور تھا نہ یہ انقلابی فکر اور نہ جمہور کی یہ اہمیت۔

ہمارے آپ کے دور میں جب شاعر اور ادیب کے لیے نوابوں، راجاؤں اور اہل اقتدار کی فوری اور عملی سرپرستی کم سے کم ناگزیر نہیں رہ گئی ہے یہ دلیل سند نہیں ہو سکتی بےشک اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی سیاسی رہنما، کسی صدر ریاست، کسی وزیر اعظم یا کسی صاحب اقتدار کی شخصیت اور اس کے کارناموں سے واقعی متاثر ہوتا ہے یا ان کا ہم خیال ہے یا ان سے نظریاتی ہم آہنگی رکھتا ہے تو اسے بےشک یہ حق حاصل ہے کہ ان کا قصیدہ لکھے یا ان کی شان میں مضامین تحریر کرے لیکن یہ کام محض مطلب برآری کے لیے خوشامد کے طور پر کیا جاتا ہے تو ادیب اور ادب دونوں کے لیے شرمناک ہے

جاتی ہیں ہو کہ بیماری آزادی سے پہلے ہندستان میں موجود نہ ہو حفیظ جالندھری
میں تو بھوبے کو بھرتی کروا تا رہے کیونکہ جے جیسے ان کی معاشی مجبوری تھی مگر
بہرحال انگریز وائسرائے کا کوئی قصیدہ جب لکھا تھا دبا کی شکل اس بیماری نے آزادی
کے بعد ہی حاصل کی

گاندھی جی تو کسی اقتدار میں رہے نہیں، جواہر لعل نہرو یوں بھی ایک زمانے میں
محبوب رہنما تھے آزادی کے بعد ہندستان کے وزیر اعظم بنے تو کچھ شاعروں نے بطور
عقیدت یا بطور خیر خواہی کے بھی ان پر نظمیں لکھیں مگر زیادہ نہیں۔ پھر جب ترقی پسندوں
میں بھی مہرو پرستی کی وبا پہلے ہی پھیلی ہوئی ہے۔ ورٹ بیٹن اور پامیلا ماؤنٹ بیٹن اور
جواہر لعل کے ربط وضبط پر فخر کرنے والے سردار جعفری تک جواہر لعل کا قصیدہ لکھنے لگے

دختر دشمن جمہور کا بیجے بوسہ
اور اس کو مدح خون شہیداں کہیے

تو یہ وبا عام ہو گئی۔ شروع شروع میں تو جواہر لعل کی مدح وستائش کی بنیاد
نظریاتی تھی مگر دھیرے دھیرے یہ دوسرے کانگریسی لیڈروں تک جا پہنچی اور ہر قسم
کا نو ہلی یا کانگریسی رہبر اس طرح کی مدح سرائی کا مستحق ٹھہرا۔ کتابوں کی اجرا کی رسم
ہونے لگی پھر بلائے جانے لگے یا ماشے تولے کے سیاسی لیڈر جن بچاروں کو رفیع احمد
قدوائی اور محمد رفیع سودا کا فرق تک معلوم نہیں جنہوں نے زندگی میں کبھی غالب کا
نام سنا نہ اقبال کا، ادبی مذاکروں کی صدارت اور ان کا افتتاح کرنے لگے اور جھوم
جھوم کر اردو کو میٹھی اور پیاری زبان ہونے کا سرٹیفکٹ عطا کرنے لگے اور واپس
دفتر پہنچ کر اردو کشی کے مقدس فرض انجام دیتے رہے۔

پھر یہ ہوا کہ گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، پولیس افسر، انکم ٹیکس کے کارگزار سب
فضل وکرم سے آقائے ولی نعمت ٹھہرے۔ اگر کسی کو خوش قسمتی سے دو جملے اردو کے
لکھنے آتے تھے یا شعر موزوں کرنے کی صلاحیت تھی تو وہ محمد حسین آزاد اور غالب سے
بھی آگے گیا اور اردو کا بابائے آدم اور سرپرست اعلیٰ قرار دے دیا گیا کوئی یہ کہنے والا بھی

بھی نہیں رہ گیا کہ بھیا، تو ڈھنگ سے شاعری کر، تجھے ادب سے کیا کام !
خیر یہ بھی زیادہ قابل اعتراض نہیں، کمال تو یہ ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر
اس منزل تک جا پہنچے کہ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے اور لگے آواز
لگانے کہ کوئی خوشامد کرا لو کوئی بھٹی کرا لو۔ اس راستے میں آگے بہت سے پڑاؤ،
اردو اکادمیاں ہی نہیں حکومتوں کے انعام و اکرام، راجیہ سبھا کی رکنیت، باہر کے
سفر اور دورے، عہدے، تقررات، گرانٹ، مفت کے مکانات؛ دھیرے دھیرے
غیرت فن چھنتی گئی اور خوشامدانہ کج روی پاتا گیا اور اس نے اس حد تک ترقی کی
کہ نظریہ اور خیال، اعمال و افکار سب باطل ہو گئے، اپنا تو مسجود محض کرسی ہے
جو اس پر بیٹھا ہے اسی کے گیت گانا ہے۔ شاعر اور ادیب اس پر فخر کرنے لگے کہ
ان کے مجموعہ کلام کا اجرا فلاں صدر، نائب صدر، وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ یا گورنر نے کیا
یا اس قسم کی کسی تقریب میں بلا کر انھوں نے کسی صاحب اقتدار سے گرانٹ لے لی
یا کسی کالونی کے لیے زمین حاصل کر لی ـــــ غرض ادب بے آبرو ہوا، فکر
ذلیل ہوئی اور اہل فن رسوا ہوتے۔ ایک زمانے میں غالب نے کہا تھا جی ہاں اسی
غالب نے جس نے بہادر شاہ ظفر سے ملکہ وکٹوریہ تک کا قصیدہ لکھا ہے اور لکھنؤ کے
امجد علی شاہ کے نام کا قصیدہ باپ کا نام کاٹ کر بیٹے واجد علی شاہ کے نام کر دیا
تھا کہ اس سے زیادہ اہل اقتدار کی بے دفتری اور کیا ہو گی۔)

جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز

مگر اب یہ رسوائی بھی ہوئی تھی کہ القاب اور خطابات، عہدے اور مصلحتوں
[کی] نہیں، انسان کی امید اور ارمان کی صلیب پر غیرت فن چڑھائی جائے اور خوشامد
[ا]ت کا دستور بن گئی۔
پھر دور آیا ایمرجنسی کا جب اندرا گاندھی نے ملک کو دستور زباں بندی دیا ۔
[ز]باں بندی کیسی؟ زبان تو آزاد تھی شرط تھی تو صرف اتنی کہ اس سے حکومت
[ا]ت کی تعریف کے جملے اور مرثیے ہی نکلیں ورنہ قلم کر دی جائے گی اور شورش

بات یہ ہے کہ دو دہائیوں میں بہت کم تھے جن کی زبانیں کم سے کم خاموش ہی
رہی ہوں۔ پھر خطابات تھے جن کے طوق اچھے اچھوں کی گردنوں میں لٹکے ہوئے
تھے۔ "دورِ غم برگِ درِ دادی"۔ ایک بار ساحر لدھیانوی نے جاں نثار اختر سے کہا
"اب تو تمہیں پدم شری مل جانا چاہیے"۔
جاں نثار اختر نے معصومیت سے پوچھا "کیوں؟ خیر تو ہے؟"
ساحر نے جواب دیا "اب ہم سے یہ ذلت اکیلے برداشت نہیں ہوتی"۔
حد یہ ہو گئی کہ اب کسی ادیب کو کچھ کہتے یا کسی کو کہتے۔ دیکھتے یا سنتے ہیں تو
پہلی بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ آخر یہ کس مصلحت سے یا کس عہدے یا اعزاز کی
خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ گمان صحیح بھی نکلتا ہے کہ یہ کچھ اس
طرح ہماری رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا ہے کہ فن محض ایک ضمنی بہانہ سا ہو کر
رہ گیا ہے اور اصل مقصد اس کے ذریعے کچھ حاصل کرنا ہوتا جا رہا ہے۔
ایک سوال جو اکثر ادیبوں کے ہونٹوں پر جانے انجانے میں آجاتا ہے، یہ
ہے کہ اتنے سال سے ادب کی خدمت کرتا آ رہا ہوں آخر مجھے اس سے کیا حاصل
ہوا؟ مراد ہے کوئی اعزاز، کوئی انعام، کوئی عہدہ، کوئی وظیفہ، رقم، کوئی اعتراف
خدمات کا سرٹیفکٹ۔ اس سوال کے سوقیانہ پن پر غور کرنے کی مہلت چاروں
طرف پھیلا ہوا خوشامدانہ کلچر انھیں نہیں دیتا۔ کیا فن اپنا خود انعام نہیں ہے یا
طبیعت فن اتنی سستی ہے کہ معمولی سے منافع کی خاطر صلیب پر چڑھا دی جائے
اور اگر واقعی ایسا ہی ہے تو ایسی گھٹیا چیز کے لیے زندگی جیسی متاعِ بےبہا وقف
کرنا محض حماقت ہی تو ہے۔
حکومت بدل گئی، اندرا جی چلی گئیں، ان کے بیٹے کی حکومت ختم ہوئی ان
کی پارٹی کی حکومت کا سورج غروب ہو گیا۔ مگر خوشامدیوں کی کرتب بازیاں نہ
تھمیں۔ عام یادداشت کمزور ہوتی ہے وی پی سنگھ کی حکومت نے اور کچھ کیا
ہو یا نہ کیا ہو اتنا ضرور کیا کہ سیاست کو ایک شخصیت کے گرد گھومنے سے بچا لیا

کل تک ہر عورت مرد ہندوستانی مجبور تھا کہ ایک ناتجربہ کار لڑکے کے وعظ و نصیحت سنے اور اس کی ہاں میں ہاں ملائے۔ ٹی وی پر ہر منظر میں اسے یا اس کے کسی متوفی کو یا اس کے کسی بچے کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھے، ریڈیو پر اس کے بنائے ہوئے پروگرام اس کے خوشامدیوں کے ذریعے پیش کیے جائیں اور سنے جائیں۔ رتناکر پانڈے اور کے کے تیواڑی (اور ان دنوں ایم جے اکبر) جیسے کھلے خوشامد کرنے والے بالکل بے لگام ہوں اور عام آدمی ان کی بے تکی باتوں پر سر ہلائے جس کا جی چاہے اس کی زبان کھینچ لیں اور جس پروگرام کو چاہیں (مثلاً بوند بوند سیریل) اس کو بالکل آخری وقت میں بھی ٹیلی ویژن پر پیش ہونے سے رکوا دیں —

وی پی سنگھ نے سیاست کو ہیرو بنانے کے تماشے کے بجائے مسائل حل کرنے کا وسیلہ بنا دیا۔ مگر خوشامدیوں کی پوری فوج ابھی مایوس نہیں ہے کیا بس نہیں چلتا کہ وہ وی پی سنگھ کے گرد جمع ہو جائے اور ان کی شاعری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے یا پھر ان کی مصوری کے کمال کو پکاسو اور وان گو سے جا ٹکرائے۔ ان خوشامدیوں کی فوج کی بہت رسائی ہوئی ہے تو گجرال صاحب تک۔ ان کو جامعہ اردو دکتورالادب کی ڈگری دیتا ہے، دلی اردو اکادمی ان کے اعزاز میں جلسے کرتی ہے۔ کبھی کسی اور ترکیب سے انھیں رجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ خوشامدی ان کے گرد اپنا جال پھیلا سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ گجرال صاحب اس جال سے اور جال پھیلانے والوں، دونوں سے ہوشیار رہیں گے اور دام میں نہیں پھنسیں گے۔ مگر اس سے خوشامدانہ کلچر کے زندہ رہنے اور نئی کروٹ لینے کا ثبوت تو ملتا ہی ہے۔ نرسمہا راؤ حکومت پر بھی ہم شاعر و ادیب مہربان ہیں خوشامد جاری ہے۔

اور سب سے بے غیرتی، یہ خوشامدانہ کرتب بازی، علم و دانش اور شعر و ادب کے لیے مہلک ہے۔ پہلے ضمیر کی خریداری کی شکل کچھ اور تھی، اب کوئی خریدے یا نہ خریدے خوشامدی ادیبوں کو ایسی عادت ہو گئی ہے کہ بیچاروں کے ذہن [illegible] ہیں۔ پاکستان کا ذکر یہاں کرنا بے محل ہوگا کہ وہاں تو خیر سے آمریت اور فوجی

حکومت کا بول بالا رہے البتہ وہاں کے جمہور فروخت شدہ اور گردن زدنی ادیبوں کو جاسوسوں سے کہیں زیادہ پہچانتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں کے ایک مقتدر اور مستند ادیب نے کراچی سے بذریعہ طیارہ جا کر سرکاری ادبی انجمن کے جلسے میں بزبانِ صاف اس حرکت کی تھی۔ اس واقعے سے مستند ادیبوں میں بے دلی پھیلی اور جب کراچی پریس کلب میں انقلابی شاعر حبیب جالب کے اعزاز میں جلسہ ہوا تو جاسوس اور مقتدر ادیب کے بیٹھنے کے لیے کسی نے بھی اپنی کرسی خالی نہیں کی۔ یہاں ضمیر فروش کی سزا تھی۔ ہندوستان میں بھی بیدار جمہوری ضمیر کو خوشامدی ادیبوں سے کسی نہ کسی طریقے سے کم از کم ایسی برأت کا اظہار تو کرنا ہی چاہیے کہ یہ ادب کے سب سے بڑے نقب زن ہیں۔

کبھی ایسا نہ ہو کہ ہمارے ادیب ہی نہیں (کہ وہ ملک کی تہذیبی امانت اور اس کے صورت گر ہوتے ہیں) ہمارا ادب بھی عرصۂ زیست پر نظر ڈالے تو تلوک چند محروم کے لفظوں میں یہ شکوہ کرنے پر مجبور ہو جائے کہ عہدِ جوانی گدھوں کو سلام کرنے اور کتوں کا ادب و احترام کرنے میں گزر گیا ؎

شرمم بعہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی
بسگاں ادب نمودن بخراں سلام کردن

آئندہ شمارے کی ایک جھلک

مقالات: ادب پر [illegible] کا تسلط [illegible] کے [illegible] مسائل پر حضرت جوش ملیح آباد [illegible] پیغمبر۔ احمد خان [illegible] کے افسانے۔ افضل تبریک — تاثرات۔ مشرق عالم ذوقی [illegible] [illegible]۔ نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے۔

محمد حسن

ست رنگے لموں کا تاجدار مشتاق احمد یوسفی

اردو نثر نے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ وجہی، غالب، سرور اور میر امن سے قطع نظر کیجے سرسید احمد خاں کی سادگی سے نظیر احمد لیجیے پھر بھی محمد حسین آزاد کے اسلوب کے شکوہ ابوالکلام آزاد کی پتھروں کو ہلائے جانے والی نثر اور رشید احمد صدیقی کی کیفیت زانی سے کیسے منہ موڑلیں گے کہ انھوں نے نثر کو آرٹ بنا دیا اور لفظوں میں وہ توانائی رنگا رنگی اور قرمزیت پیدا کر دی کہ ہر جملے کے ساتھ جیسے آسمان پر ست رنگی دھنک جگمگا اٹھتی ہو۔

بے شک جدید دور بھی بقدر استطاعت اپنی کامرانیوں سے خالی نہ تھا رشید احمد صدیقی، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کی نثر کا ذکر نہیں کرتا گوان میں سے ہر ایک نے وہ طرز و اسلوب نکالا کہ نثر کو نئی بالیدگی، روانی اور کھلاہٹ ملی۔ جدید دور میں آل احمد سرور، خورشید الاسلام، ظ انصاری اور قاضی عبدالستار کے جملوں نے ہندوستان میں اور ابن انشا کی تحریروں نے پاکستان میں اردو نثر کو ایسا سجایا سنوارا بنایا کہ اس میں ایک جہان معنی سمٹ آیا اور جلنے بجنے لفظوں پر صاحب تحریر کی مہر ثبت ہو گئی، ہر ایک اسلوب جداگانہ کہ ہر لفظ لکھنے والے کی ذات پات اور شخصیت کی گواہی دے وہ بھی ایسی بلند آہنگی سے جیسے سیالاب کا آبشار گر رہا ہو۔

مگر اس سب کے باوجود حق یہ ہے کہ جدید نثر کے بے تاج بادشاہ مشتاق احمد یوسفی ہی قرار پاتے ہیں۔ اردو نثر کو جو تہہ داری، بلاغت، دردمندی اور کیفیت آفرینی کی قوت

یوسفی کی تحریروں سے ہی اس کی نظیر کم سے کم اردو کی ادبی تاریخ میں موجود نہیں۔ تفصیل میں
کی طوالت طلب بھی ہے اور شاید ناممکن بھی کہ یہ نثری اسلوب بقول رشید احمد صدیقی
آرکسٹرا کی موسیقی ہے اور اگر کوئی آرکسٹرا کے کس کس ساز کی اور اس ساز کے کس کس
سُر کے طالع بیان کرے اور کرے بھی تو کب تک! یہ تو ایک کیفیت ہے کہ لفظوں سے پیدا
ہوتی ہے، جملوں میں پھیلتی اور انگڑائی لیتے چلی جاتی ہے، کبھی پیراگراف اور مضمون بن
جاتی ہے، کبھی مجلے کی پھلواری سجاتی ہے اور کردار کے باغ و بہار کی شکل اختیار کر لیتی ہے
اور یوسفی کی نثر کو اس سارے انداز و اسلوب کو اپنے ڈھنگ سے برتنے پر پورا اختیار و
اقتدار حاصل ہے۔ یوسفی کا قلم چاہے تو ہنسنے کے مار ڈالے اور چاہے تو عین اس وقت
جب قہقہہ پوری طرح ختم بھی نہ ہوا ہو لفظوں کو وہ موڑ دے کہ آنکھیں اشکبار ہو جائیں
دل درد سے دو نیم ہو کر رہ جائے۔ یہ قدرت قضا و قدر کے علاوہ کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔
پیدائش ہندوستان کی ریاست راجستھان کے علاقہ مارواڑ کی ہے جو بقول خود ان

۱؎ تاریخ پیدائش و مقام پیدائش کی تعیین واجب تھی یوسفی صاحب سے بار بار درخواست
کی گئی کہ کم کو الف ذاتی کی فراہمی میں تعاون کریں۔ مگر ہم نہ کما پایا، دیگر ذرائع سے تحقیق کی جرأت
اس لیے نہیں کرتا کہ محققین کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے۔

"علمی خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونڈنے کی اجازت صرف دو صورتوں میں
ملنی چاہیے اول اس موقع پر جب دونوں میں سے ایک وفات پا چکا ہو
دوسرے اس صورت میں جب دونوں میں سے ایک اردو نقاد ہو جس پر
تھوک دینا فرض ہی نہیں ذریعہ معاش اور وجہ شہرت بھی ہو۔" (آبِ گم ص۱۵۲)

ویسے نقادوں کے بارے میں بھی ان کی رائے اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔

"مگر ہم اس غرض سے پالتے ہیں کہ اس کی مینگنی میں دودھ ملا کر جوان اردو
نقادوں کو پلائیں گے۔" ص۲۰۳

مگر کیا کریں مرزا غالب نے ایسے موقعوں ہی کے لیے تو کہا تھا، گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
(باقی اگلے صفحہ پر)

کماونٹ دیشماں اور مہدی حسن کے بیاہ مشہور ہے۔ بس یہی کوئی ۱۹۱۴-۱۵ کا ہو گا جس
سے متتبعین ان کا سالِ پیدائش نکال سکتے ہیں (کیونکہ اپنی خود نوشت سوانح عمری "سر
گزشت" لکھنے کے باوجود اپنے حالات زندگی کی تدوین میں کسی قسم کا تعاون کرنے
سے سختی کے ساتھ گریزاں ہیں) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں زیر تعلیم رہے اور اس کے باوجود
حس مزاح بچا کے لے آئے (ایم اے او کالج کی بات دوسری تھی جس نے رشید احمد صدیقی
کو پیدا کیا تھا) پاکستان بنا تو پہلے وہاں پھر لندن میں بقول ان کے کوچۂ سود خواراں یعنی

حاشیہ گزشتہ سے آگے ۔ بہرحال ان کی تحریر سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ درج ذیل ہیں

"آپ نے راجستھان میں جہاں آپ نے جوانی گنوائی اونٹ ہی اونٹ دیکھے، جن کی پیٹھ پر کلندار
راجپوتنی سانڈنی چوٹیاں داڑھیاں نو نو فٹ لمبی نال والی توڑے دار بندوقیں بھی ہوتی ہیں
اونچے کنٹوپ، پر کبھی لاٹھی کے سرے پر تیل پلائے ہوئے کچے چمڑے کے جوتے لگائے ہلدی میں
رنگے پیرہاٹ۔ گھوڑا تو آپ نے پاکستان میں آن کر دیکھا ہے۔ میاں احسان الٰہی گواہ ہیں ابھی کے
کے سامنے آپ نے ان ٹھاکر صاحب کا قصہ سنایا تھا جو مہاراجہ کی شتر نال پلٹن میں رسالدار تھے جب
ریٹائر ہو کر اپنے آبائی قصبے، کیا نام تھا اس کا.. ..اودے پور تورا وائی پہنچے تو اپنی گڑھی میں
ملاقاتیوں کے لیے دس بارہ مونڈھے ڈلوا دیے اور اپنے لیے اپنے سرکاری اونٹ جنگ بہادر کا
پرانا کجاوہ۔ اسی پر اپنی پلٹن کا شنگرفی رنگ کا صافہ باندھے سینے پر تمغے سجائے صبح سے شام تک
بیٹھے ہلتے رہتے۔ ایک دن ہل ہل کر جنگ بہادر کے کارنامے بیان کر رہے تھے اور میڈل چھن
چھن کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا، کجاوے پر ہی طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے
ابدی سفر پر روانہ ہو گیا"

۲ خود نوشت سوانح عمری میں یوسفی لارڈ کوکن کے ہم خیال ہیں جو ٹرینیٹی کالج آکسفورڈ کا صدر
بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیئرمین ہے وہ کہتا ہے کہ میں خود نوشت سوانح عمری کو سوانح عمری
کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں۔
یوسفی کا تبصرہ ملاحظہ ہو: "عاجز اس کی ذہانت پر مدتوں عش عش کرتا رہا لندن گزشتہ
بیہودہ ریک اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا۔ ع ابھی کچھ ظرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں"

ملک کی ملازمت میں۔ یوسفی صاحب کو اپنے پروفیشن کے ادارے بینکنگ آف گریجویٹ اینڈ لندن انسٹیٹیوٹ سے سکالرشپ حاصل کرکے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ چار کتابوں کے مصنف ہیں جنہوں نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی ہیں۔ چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور ایک کوئی اور ——— اور اب تازہ تصنیف "آب گم"

یوسفی صاحب کی طرز نگارش پر اصرار کرنا چاہتا ہوں جس سے اردو نثر کے ساتھ ساتھ خود پڑھنے والے کی بھی بڑی سرمایہ کاری ہوتی ہے کیونکہ اس طرز یا مزاج کے پیچھے عصر حاضر کی ساری حسیت اور دانش وری اس طرح سمٹ آئی ہے جیسے السن اور برنارڈشا کے طرح میں تجربہ حیات اور بڑی محرومی ہوگی اگر کوئی اس تہہ دار اور خیال انگیز نثر کو محض ظرافت نوازی سمجھ کر قناعت کر لے اور ہنسی ہنسی میں ٹال دے۔ یہ ٹپکنے والی نثر نہیں۔ یہ چپک جانے والی اور رگ و پے میں اتر جانے والی نثر ہے۔ یہ احساس سے ہو کر گزرتی ہے اور فکر و دانش کو اپنی گرفت میں لیتی چلی جاتی ہے

یوسفی کی ابھی تک چار تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ ابھی بہت سے مضامین اور کتابوں کے مسودے درازوں میں اور آستینوں میں چھپائے ہوں گے اور ان کی جگالی کرتے ہوں گے یا ان کو بقول کسی عربی شاعر کے بلی کے بچے کو ریچھنی کی طرح چاٹتے ہوں گے کہ جب چاہیں تو سامنے لائیں۔ قباحت ان کی کتابوں کے بارے میں یہ ہے کہ ان کی ہر کتاب کا حال ان کے مضمون کی عنیزہ (کتیا) کا سا ہے جو ہاتھ آئے تو بھی اٹھا کر لے جانے والوں کے لیے اتنی اشتیاق انگیز ثابت ہوتی ہے کہ چند ہی دن میں ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے تا آنکہ مغویہ مذکورہ کو کوئی دوسرا اغوا کنندہ نہ مل جائے۔ حاصل مطلب یہ کہ جب یوسفی پر کچھ لکھنا چاہا ہو اور ارد گرد نظر ڈالو تو معلوم ہوتا ہے سوائے یادداشت اور آب گم کے سب تصانیف گم ہیں ویسے رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے غلط شعر پڑھنے کا جواز یہ پیش کیا تھا کہ اچھا شعر وہ ہے جس کے الفاظ بھول جائیں اور کیفیت خوشبو کی طرح یادوں میں مہکتی رہ جائے خیر قصہ مختصر مجبوراً

ساری بحث "آب گم" کے حوالے ہی سے ہوگی اس لیے بھی کہ باقی تصانیف قرض خواہوں کے قبضے میں ہیں اور یوں بھی کہ "آب گم" بہرحال تازہ ترین تصنیف ہے جس میں ان کے قلم کی سبھی ادائیں دو آتشہ، سہ آتشہ ہو کر سامنے آئی ہیں۔

بے شک یوسفی نے طنز و مزاح کے مضامین سے سفرِ تحریر شروع کیا اور جملوں کی ساخت پر رشید احمد صدیقی اور سجاد حیدر یلدرم کے اثرات مدتوں نمایاں رہے پھر اس پر اضافہ ہوا فکری تہہ داری کا اور افتادِ طبع کا درد مندی کا کائنات کی آگہی کا اور ان تینوں کا حق ادا کرنے کے لیے انھوں نے جملوں کی کوٹھیاں تیار کیں کردار اور قصے کی، شروع ہی سے پطرس بخاری کے مضمون "مرحوم کی یاد میں" کے مرزا صاحب کو انھوں نے بڑا بھاری بھرکم اور حسبِ حیثیت نام مرزا عبدالودود بیگ دے کر "آب گم" کے ایک چھینٹے سے زندہ کر لیا اور ان پر دانائی، دانش مندی اور فراست کی سبھی کلاہ ہائے شاہ کار لٹکا دیے (آخر وہ بھی ایک کھونٹی ہی تو تھے یوسفی کے خیالات کی) اور پھر اس میں اضافہ کیا اس درد مندی کا جس کی جیتی جاگتی مثال (غالباً چراغ تلے میں [illegible]) سارے طنز و مزاح کا بوجھ اٹھاتا ہے اور آخر کار پڑھنے والے کی آنکھوں کو نم چھوڑ کر چلا جاتا ہے اس سے واقعہ طرازی کی شروعات ہوئی۔

"زرگزشت" میں تو کچھ زیادہ کرنا نہیں پڑا خود اپنے اور اپنے اردگرد کے دوستوں، دشمنوں ہی پر مشقِ جفا کرنی تھی سو کی جس میں ان کے بینک کا انگریز افسر بھی شامل تھا جو باہر سے سخت اندر سے نرم اور خود ان کی اپنی ذات بھی مگر "آب گم" میں یہ داستان اتنی بے منطق نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء آیا ایک ملک کے دو ملک اور پھر دو کے تین ملک بن گئے کروڑوں لوگ اجل ہوئے کچھ کرپان اور تلوار سے مرے، کچھ غم و اندوہ سے کچھ [illegible] ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچے، وطن سے بے وطن ہوئے اور اپنے وطن کو اجنبی دیس اور اجنبیوں کو ہم وطن کہنے لگے، آدمی کٹتا مگر اس سے کہیں زیادہ اس کے اندر کا سرمایہ کٹتا۔

آبِ گم میں بڑی چالاکی اور چابک دستی سے ۱۹۴۷ء کے 'تہذیبی' المیے کے اس سلسلے کے کل پیکر کو پانچ مضامین اور پانچ کرداروں کے وسیلے سے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس طرح کہ از اول تا آخر پڑھنے والے کے لبوں پر قہقہہ آنکھوں میں آنسو اور دل میں دھڑکا رہے کہ یوسفی سیدھی راہ چلتے چلتے نہ جانے کس موڑ مڑ جائیں۔

ایک ہیں میاں بشارت، کہ اصلاً کانپوری ہیں اور تقسیم ہندوستان کے ریلے میں ہندوستان سے پاکستان کی راہ لیتے ہیں گویا معروف اصطلاح میں مہاجر ہیں، دوسرے ہیں ان کے خسر، ان پر بھی یہی گزری ہے مگر ڈھلتی عمر میں جب وہ ہندوستان میں اپنا وجود اس طرح جما چکے تھے کہ جس کو چاہے بتی پر لٹکا دیں۔ تیسرے ہیں بشارت کے مہمان عزیز خاں صاحب جنھوں نے کبھی ہندوستان کی شکل نہیں دیکھی اور بقول خود ان کے اپنی رقم کی وصولیابی کے لیے بشارت کے یہاں سیدھے پشاور سے آ گئے تھے اور چوتھے ہیں ملا عاصی بکشو جو گویا ہندوستان میں رہنے بسنے والے مسلمانوں کی نمایندگی کر رہے ہیں گویا "آبِ گم" داستان ہے زبانی اس مہاجر کی جو یہاں سے رہتے بستے پاکستان چلا گیا تھا۔ ایک باب اس بارے میں ہے کہ یہاں اس پر کیا گزر رہی تھی (دھن گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ) دوسرا باب اس بارے میں کہ پاکستان میں اس پر کیا بیتی (حویلی) تیسرا اس باب میں کہ اس کی وہاں کے آبائی رہنے والوں سے کیسی بنی یا ان کی تہذیبی شخصیت سے اس کی میزان بیٹھی (کار — کابلی والا اور الہ دین بے چراغ) اور چوتھا باب اس بارے میں کہ جب میاں بشارت پیار وطن سے بے قرار ہو کر واپس کانپور پہنچے تو انھوں نے اس نگر کو کیسا پایا جو کبھی ان کا اپنا دیار تھا۔ (شہر دو قصہ) گویا چار پانچ مضامین میں یوسفی نے پورے برعظیم کے تہذیبی المیے کو گٹھڑی بھر میں موزے کی طرح الٹ کے رکھ دیا کہ طنز اور دردمندی کی خاصیت گرم ہوتی ہے۔ (ص ۱۰۰)

اس گٹھڑی میں صرف زندہ اور مردہ انسانوں کے کرداری کام نہیں آئے بلکہ سب سے دلدوز کہانی جانوروں نے رقم کی ہے اور ان میں سرفہرست ہے

بلین نام کا ایک لنگڑا گھوڑا اور ویلزلی لقب پانے والا ایک بازاری کتا دیکھنے کا انتخاب پھر پطرس کے اثر کی یاد دلاتا ہے جن کے ایک مضمون "کتے" نے اسے غیر فانی کر دیا گو یہاں بھی یوسفی کتے کی دریافت میں بہت آگے تک گئے ہیں۔ اسی طرح رشید احمد صدیقی کے خاکے "کندن" کی گونج یوسفی کے اسکول کے گھنٹہ بجانے والے ریٹائرڈ چپراسی بشیر چاچا کے یہاں صاف سنائی دیتی ہے۔ صـ۲۹۳

"یکہ ۲۰ کا بیان بھی اسی قبیل کی اثر پذیری ہے۔ صـ۲۰۳۔ مگر گھوڑے اور کتے کے ضمن میں جن بلاغتوں کے ساتھ یوسفی تاریخ سے لے کر عمرانیات تک اور شاعری سے لے کر فلسفے تک کی ست رنگی کائناتیں اجالتے چلے جاتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے مثلاً کتے کے بارے میں یہ خیال کہ

"برصغیر کے کتے سو سال تک سلطان (ٹیپو) شہید کے نام سے پکارے جاتے رہے کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آزمائش، عقوبت مطہرہ اور شہادت عظمیٰ ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی رب جلیل انھیں شہادت جاوید کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔" صـ۳۰۲

اور اسی ترنگ میں اس لینڈی کتے کا نام ویلزلی رکھنا تاریخ کے کتنے ورق ایک ساتھ الٹ دیتا ہے۔ اسی راستے سے ہوتے ہوئے وہ پورے برِ اعظم کی تشخیص مرض تک پہنچتے ہیں :

"غور کیجیے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ویلن ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پس ماندہ اور پست حوصلہ ہو اس کو اپنا ماضی معکوس اقلیدسی تناسب میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے ہر آزمائش اور ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب رجوع ہوتی ہے اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتہً تھا بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق اس نے

از سر نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔ ماضی تمنائی، اس پاستان طرازی

عرصہ میں منظر میں بحروبر تا حد نگاہ ذی روح دیتی ہوئی ہے کہ جو فقط
پہاڑ ملکی ہی نہیں عقل کی موت بھی پیدا کرتا ہے: (ص ۳)
قوموں کی بحروبر اتنی ان بیانگاہوں کے سراغ یوسفی کی تحریروں میں ملیں گے
مگر اس باؤ آپ گم میں یہ سراغ کچھ زیادہ واشگاف طور پر موجود ہیں ان میں ایک
ہے یوسفی کے ہاں یہ ایک یا ستبنی وطن پاکستان میں فوجی آمریت کے "دورِ ضیاع"
کا ذکر جو بڑی خوبی سے تحریر میں در آیا ہے اور شاید ان مضامین کی پہلی اور
آخری معاصر شہادت (زمانی) ہے۔ یاد رہے کہ صورت حال محض پاکستان تک
محدود نہیں کسی بھی ملک پر یہ افتاد پڑ سکتی ہے بلکہ پڑتی رہتی ہے کبھی کبھی ان
ملکوں پر بھی جہاں فوجی حکمراں نہیں، آمریت البتہ حکمراں ہے۔

"لیڈر خود غرض، علما مصلحت بین، عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم،
دانشور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں تو جمہوریت
آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے پھر کوئی طالع آزما آمر
ملک کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے ... ڈکٹیٹر
خود نہیں آتا، لایا اور بلایا جاتا ہے اور جب آ جاتا ہے تو قیامت
اس کے ہم رکاب آتی ہے پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو
خیمے سے باہر نکال باہر کرتا ہے باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدو
ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں...... انصاف کی خود ساختہ
ترازو کے اونچے نیچے پلڑوں کو اپنی تلوار کا پاسنگ کبھی اس پلڑے
اور کبھی اُس پلڑے میں ڈال کر برابر کر دیتا ہے۔ ع
ہر کہ آمد عمارت نو ساخت" ص ۱۳-۱۵

مرزا عبدالودود بیگ (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے
حمایت اور آخر میں اتنی ہی شدومد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے

میں اپنے کان پکڑ تعوذ یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے مجھ کو جب اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رجیم سے بھی REGIME مراد ہے نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ۔ ص۳۱

اور اب اس بھی سہانی غزل کا بیت الغزل ملاحظہ ہو بقول غالب ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پھر جیسے جیسے امور سلطنت پر وفور تمکنت اور ہوس حکمرانی غالب آتی ہے۔ آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے نکتہ چینوں کو وطن کا غدار اور دین سے منحرف قرار دیتا ہے اور جو اس کے دست آہن پوش پر بیعت میں عجلت سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ کی زمین کا رزق اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دیتا ہے۔

ادیبوں اور تلامیذ الرحمٰن کو شاہی مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتلاتا ہے کہ لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور نمک حرامی کسے کہتے ہیں اور وہ یہ جانتا ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروش سے بھی زیادہ مفید مطلب ایک اور قبیلہ ہوتا ہے جسے فانی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق کرواتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں مطلب یہ کہ جس کا جی چاہے جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں بلکہ وزن، بحر اور عقل سے بھی خارج ہو تب بھی ہم خارج نہیں ہوں گے۔" ص۳۱

کچھ لوگ تو ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کرنے کے عادی ہو گئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے سر جھکائے رہتے

ــه زرد ہندستان میں راجیو گاندھی کے زوال کے بعد کی صورتحال نظر میں ہے (م ۔ ح)

"باہر سے اور گھر سے نکل تنے کبھی کسی نے کوئی بھرکے زبردستی گھر لا کرنا
چاہا بھی تو معلوم ہوا کہ گھرانے نہیں ہو سکے۔ جوڑ مذہب اکڑ اکر رہ گئے
ہیں اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائض منصبی وغیر منصبی حالت بعد
ہی تنہا اکیلے کے عادی و خوگر ہو گئے ہیں۔" ص ۱۶

(اس مضمون آتا جیاں ملتا ہے انداز بیان ایسا بانے جانے والا کر پڑھنے والے لمحہ شاید نشان زدہ الفاظ کے ذریعے ادا ہونے والے موڑ پھیر ادبی رنگینی اور ہم جہتی پر محرومی محسوس کیا ہوگا۔ یہ الفاظ کے ... نشے وفاں کی دریافت کا ذکر آگے آئے گا، یہاں صرف نشان دہی مقصود ہے)

لیکن اس ضمیر فروشی اور ہمانی الضمیر فروشی سے بڑا بھی ایک حادثہ ہوا، وہ ہے پورے برِ اعظم کے ملکوں کی ادبی تہذیبی وراثت سے محرومی جسے سیاست نے کبھی مذہب کے نام پر یا خالص علاقے کے نام پر تاراج کیا اور جو وراثت صدیوں نے ساری تقسیموں کی سرحدوں پر سلگی تھی وہ اسی روایتی بچے کی طرح تکا بوٹی ہو کر رہ گئی جس کی ماں ہونے کا دعویٰ دو عورتوں نے کیا تھا۔ یوسفی اس تکا بوٹی ہونے والے بچے کے داد گیسو ہیں جب کہ اس کے بہان کی آنکھوں میں آنسو ہیں جس کے لیے ہر آنکھ پتھر کی ہو چکی ہے محروم آداب عرض کے مشترک طرزِ تسلیم سے خفا ہیں (ص ۲۲۲) اور کمیونسٹوں اور انقلابیوں سے کہیں خفا (ص ۱۸۲) مگر پھر بھی اس صدیوں کی کمائی سے روگردانی نہیں جس پر کسی ایک فرقے کا اجارہ نہیں۔ شاید کسی ایک علاقے کا بھی نہیں اور جسے ہندوستان کے ہندو اور پاکستان کے مسلمان دونوں نے راندۂ درگاہ کر دیا ہے کہ یہاں کی تنگ نظری کے خانے کے لیے موزوں نہیں ٹھہرتی۔ ملا عاصی اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

ملا عاصی حسبِ عادت مذہبی مادۂ بدھ مت کے پیرو تھے۔ خواہش کو گناہ جانتے تھے عمر بھر کنوارے رہے اور کنوارے ہی مرے۔ بدھ مت کے پیرو ہوئے تو کسی نے پھبتی کسی کہ مرتد ہو گئے، دوسرے نے کہا مسلمان تھے کب جو مرتد ہوتے۔ میاں بشارت نے تحقیق کی کہ مولانا بدھ ازم میں تمہیں اس کے سوا اور کون سی خوبی نظر آئی کہ ہاتھا بدھا بھی بیوی

بشو دھرا کو سوتا چھوڑ کر راتوں رات سٹک گئے تو مسکرائے۔ کہنے لگے "میری بشو دھرا تو
میں موجود ہوں وہ بھاگ بھری تو اب اگلے جنم میں جاگے گی۔" میاں بشارت کا بیان ہے
کہ ایک محرم راز نے یہاں تک کہا کہ ملا عاصی نے وصیت کر رکھی ہے کہ میری لاش تبت
لے جائی جائے۔ حالانکہ بچارے تبت والوں نے ان کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔
نابیناؤں کے اسکول میں مفت پڑھانے جاتے ہیں" لہجے میں مٹھاس، ملائمیت اور
دھیرج بلا کا ہے۔ ہمیشہ سے تھا۔ الفاظ سے بات سمجھ میں آتی ہے، لہجے سے دل میں
ترجاتی ہے، جادو الفاظ میں نہیں لہجے میں ہوتا ہے؟ غالب نے کیسی ظالم بات کہی
ہے حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن۔ یعنی پروردگار! مجھے کافروں کی طرح
مرنے اور مسلمانوں کی طرح جینے سے بچا۔ سب کچھ سات لفظوں کے ایک مصرعے میں
سمو دیا۔" (ص ۳۱)

اس تمہید کی غرض یہ تھی کہ جب میاں بشارت مدتوں بعد کراچی سے اپنے سابق
وطن کانپور کی زیارت کو جاتے ہیں اور ملا عاصی کی چھوٹے دم اور عسرت گزیدہ
زندگی دیکھتے ہیں تو انھیں پاکستان لے آنے پر اصرار کرتے ہیں۔ جواب ان کا بعد کو
سنیے گا فضا البتہ ایک نظر دیکھ لیجیے:۔

"اتنے میں ایک چتکبری بلی اپنا بچہ منہ میں دبائے ان کے کمرے میں داخل
ہوئی، نعمت خانے میں بند کبوتر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ بلی کے
پیچھے ایک پڑوسی کی بچی مینا کا پنجرہ ہاتھ میں لٹکائے اور اپنی گڑیا
دوسری بغل میں دبائے آئی اور کہنے لگی کہ صبح سے ان دونوں نے
کچھ نہیں کھایا بولتے بھی نہیں، دوا دے دیجیے۔ انھوں نے بیمار
گڑیا کی نبض دیکھی اور مینا سے اسی کے لہجے میں بولنے لگے۔ انھوں نے
ایک لفافے میں سے لیمن ڈراپ نکال کر بچی کو دی۔ اس نے چوسا
تو گڑیا کو آرام آگیا۔ وہ مسکرا دیئے...... کہنے لگے یہاں میں سب
کے دکھ درد میں ساجھی ہوں۔ وہاں میری ضرورت کس کو ہوگی؟

یہاں سے مغرب جاتی کرن، جو یہاں سے بھی قریب ہیں.....
کون پہچانے گا کون جانے اس ......
...... سامنے جو جامن کا پیڑ دیکھ رہے ہو، میرے دادا نے لگایا تھا
جس کے پھل پکتے ہیں تو اس مزے کی ہے مٹھاس کا سلسلہ نظر آئے منہ بھر جاتا
تھا جب دونوں وقت ملتے ہیں اور شام کا جھٹ پٹا سا ہونے لگتا
ہے تو اس پر بے شمار چڑیاں جی جان سے پہلے چہچہاتی ہیں کہ دل کو
کچھ ہونے لگتا ہے اس جامن کے پیڑ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ (ص ۳۲۵-۳۳۶)

۳ دسمبر ۱۹۸۸ء کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ محلے کی مسجد کے پیش امام نے کہلا بھیجا کہ ملحد کی صلوٰۃ الجنازہ جائز نہیں جس کے وجود ہی کے آنجہانی قائل نہ تھے اس سے رحمت و بخشائش کی دعا کیا معنی۔ بڑی دیر تک جنازہ جامن کے پیڑ کے نیچے پڑا رہا بالآخر ان کے ایک عزیز شاگرد نے امامت کے فرائض انجام دیے[ص ۳۴۵] اور ان کے یہ الفاظ جو میاں بشارت کی دعوت ہجرت کے جواب میں تھے الہامی ثابت ہوئے

"ابھی میرے ساتھ چلنے میں کیا قباحت ہے؟"
"ان بچوں کا کیا ہوگا؟"
"ہوتا کیا، بڑے ہو جائیں گے تمہیں کوئی MISS نہیں کرے گا مگر
تم مر گئے تب کیا ہوگا؟"
"تو کیا ہوا، یہ بچے، اور ان بچوں کے بچے تو زندہ رہیں گے، سینوں
میں اُجالا بھر رہا ہوں، مر گیا تو ان کے منہ سے بولوں گا، ان کی آنکھوں سے دیکھوں گا۔" (ص ۳۴۶)

کاش کہا ہوتا مشتاق احمد یوسفی نے:

"مرد کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے۔ اس
سچائی کا اعلان و ابلاغ بھی صرف اسی اور صرف اسی کے لئے واجب ہوتا ہے
سو جو جیسا ہوا اس نے اس کے لئے سولی سے آپ کیسی رہائی؟" (ص ۳۱۱)

ہندوستان میں رہنے بسنے والوں کو اپنے بارے میں پاکستانی مہاجر کے تاثرات سے دلچسپی ہوگی لہٰذا یوسفی کی زبان میں ان تاثرات کی صرف دو جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں: "رہن سہن کے معاملے میں ہندوؤں میں اسلامی سادگی پائی جاتی ہے۔" (ص۲۲۳)

"ہندو رشوت لینے میں ایسی نمرتا (انکساری) ایسا اخلاق اور اعتدال برتتا ہے کہ والتد دوبارہ دینے کو جی چاہتا ہے۔" (ص۲۲۵)

اور کہیں انہی صفحات میں یہ بھی پڑھا تھا کہ میاں بشارت تم تو پاکستان جاکر مہاجر ہوئے ہم یہیں بیٹھے بیٹھے مہاجر ہو گئے۔

غرض دیکھا آپ نے ہر لمحے کی دہی اپنے لمحے کی سچائی صلیب اور تلخی کی گہرائی مشتاق یوسفی کس دردمندی اور کس دقیق نظر سے دیکھی اور دکھائی ہے بلکہ یہاں ہے اسی سے ایک راہ ANTIQUE کی طرف جاتی ہے۔ یہ آثار قدیمہ نہیں، اس تہذیب کے حصے ہیں جو صدیوں کی کمائی تھی ہندوستان پاکستان کے ہندو مسلم، سکھ عیسائی، بدھ اور بے مذہبوں اور لا مذہبوں کی جن کے نام و نشان تک محفوظ نہیں اور یہ آثار قدیمہ کا خزانہ صرف لفظوں تک محدود نہیں کہ بقول یوسفی کے دوست جمیل صاحب کے:

"تعس برطرف، اگر ان میں سے ایک لفظ بھی ہاں صرف ایک لفظ، بھی دوبارہ رائج ہوگیا تو سمجھوں گا عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی۔" (ص۳۰)

لفظوں سے ہوتی ہوئی یہ روشنی کی لکیر تہذیب اور معاشرے کے دل دوز اور نظر فراز گوشوں تک پہنچتی ہے اور بقول یوسفی اس طرح کہ صحبت یاراں کا ہر لمحہ ایک جشن میں تبدیل ہو جاتا ہے (ص۱۲۱) اور فضا میں دیرتک شرار جستہ اور فقرہ ہائے برجستہ کوندتے رہتے ہیں۔

جی ہاں، صرف نظر فروزی نہیں دل دوز گوشے بھی اور یہ دل دوزی ایسی ہے جس کی تصویر کشی کے لیے خود بقول مصنف:

مفلسی کا میدی، ایسی بے بسی، ایسے اندھیرے اور اندھیر کی
تصویر کھینچنے کے لیے تو دانتے کا قلم چاہیے: (مش)

اور دانتے کا یہ قلم مشتاق یوسفی کے ہاتھ آگیا ہے۔ ممکن ہے انٹیک ANTIQUE کے ذریعے سے مل گیا ہو۔ یقین نہ ہو تو دو منظر دیکھتے چلیے:

جب میاں بشارت کو سواری کا شوق ہوا تو ایک گھوڑا اپنی غذا ہم کرنے لکڑیوں کے علاوہ میں سدا نے مگر جب کوچوان نے سے تانگے میں جوتا تو "بے رحمی" والوں نے قانون انسداد بے رحمی جانوران کے تحت چالان کر دیا کہ گھوڑا لنگڑا کے چلتا تھا۔ آخر رشوت دے کر جان چھوٹی۔ اب یہ معمول بن گیا کہ جہاں "بے رحمی" والے چالان کرتے اور رشوت وصول کرتے۔ یہی سہی اور نہ ہو تب تو یہ دی رشوت خود بے رحمی والے سے باز پرس کرنے میاں بشارت اس کے نوکر جا بیٹھے۔ اب جو اس گھر کی جو تصویر مشتاق یوسفی کے قلم ہلکو قلم نے کھینچی ہے وہ دانتے کی جہنم سے زیادہ حقیقی اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ تو وہ ایک طنز و مزاح والی کتاب کا ہے جو مجھے پہلے آپ کو ہنسا رہی تھی۔ تصویر یہ ہے

عجیب کسمپرسی کا عالم تھا۔ کہیں عثمانی ... کی اور اخبار کی ردی سے بنی ہوئی چھتوں کے پیلے پانی کے مارے بوجھ سے لٹکے پڑ رہے تھے اور کہیں گھر کے مرد پھٹی ہوئی چٹائیوں میں دوسری پھٹی چٹائیوں کے پیوند لگا رہے تھے۔ ایک شخص ٹاٹ پر گھسا ہوا تارکول پھیلا کر چھت کے اس حصے کے لیے ترپال بنا رہا تھا جس کے نیچے اس کی بیماریاں کی چارپائی تھی۔ دوسرے کی جھگی بالکل ڈھیر ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مرمت کہاں سے شروع کرے۔ چنانچہ وہ ایک بچے کی پٹائی کرنے لگا۔ جگہ جگہ لوگ نالیاں بنا رہے تھے جن کا مقصد بظاہر اپنی غلاظت کو پڑوسی کی غلاظت سے علیحدہ رکھنا تھا۔ ایک صاحب تانگے کی بیٹھی بوری میں بغل تک ہاتھ ڈال کر دیکھ رہے

تھے کہ اندر کچھ بچا بھی ہے یا سارا ہی پیڑ جلنے کے لائق ہو گیا۔ ایک جھگی کے باہر بکری پر برساتی مکھیاں جو مصاحبوں کی طرح چپکی اور لدھڑ ہو گئی تھیں، خارشی کتے کے اڑانے سے نہیں اڑ رہی تھیں۔ یہ اس دودھ دینے والی مگر بیمار اور دم توڑتی ہوئی بکری کی اوجھڑی تھی جسے تھوڑی دیر پہلے اس کے دو مہینے کے بچے سے ایک گز دور تین پڑوسیوں نے مل کر تڑت پھڑت ذبح کیا تھا تاکہ چھری پھرنے سے پہلے ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس کا خون معاون نالوں اور نالیوں کے ذریعے دور دور تک پھیل گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ ایک بھائی کی حق حلال کی کمائی کو ضائع ہونے سے بچا لیا، موت کے منہ میں سے کیسا نکالا تھا۔ انھوں نے بکری کو! چند جھگیوں میں مہینوں بعد گوشت پکنے والا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انھیں اس وقت ہوئی جب وہ اس جھگی کے سامنے سے گزرے جس میں لڑکیاں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ باہر لگی ہوئی کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں تو اب نظر آ رہی تھیں لیکن ان کے کچے رنگوں کے باؤلے ریلوں سے ٹاٹ کی دیوار پر PSY CHEDLIC PATTERNS بن گئے تھے۔ ایک لڑکی آٹا گوندھنے کے تسلے پر سنگت کر رہی تھی کہ بارش سے اس کی ڈھولک کا گلا بیٹھ گیا تھا:

اماں! میرے بابا کو بھیجو ری کہ ساون آیا!
اماں! میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا!
کہ ساون آیا

ہر بول کے بعد لڑکیاں بے تحاشا ہنستیں، گاتے ہوئے ہنستیں اور ہنستے ہوئے گاتیں تو رنگ اپنی سرحد سیما پار کر کے جوانی کے دوانے میں مل جاتے ہیں اور نکل جاتا۔ سچ پوچھو تو کنواری چھاتی کی کلکاری گھنگھرالی ہنسی کی مرکی ہی گیت کا سب سے البیلا ہرا بھرا انگ تھا۔"

" ایک جگی کے سامنے میاں بیوی لحاف کو رسّی کی طرح بل دے کر نچوڑ رہے تھے بیوی کا پیٹ سامنے کو نکلا ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹک رہا تھا۔ بیس ہزار کی اس بستی میں دو دن سے بارش کے سبب چولہے نہیں جلے تھے۔ نشیبی علاقے کی کچھ جگیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا۔ جگیوں کی پچھلی قطار کے سامنے ایک نیک نیت مولوی قسم کا آدمی بڑے گھی والی تنوری روٹیاں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو وہ رکشا میں رکھ کے لائے تھے۔ تین لحاف بھی مستحقین میں بانٹنے کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ گھر سے چلے تو انہیں نہیں تھا کہ بیس ہزار کی بستی میں تین لحاف لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی انجکشن کی سرنج سے آگ بجھانے کی کوشش کرے پھر یہ بھی تھا کہ کسی بھی جھگی میں دو گز زمین کا ایسا خشک جزیرہ نہ تھا جہاں کوئی یہ لحاف اوڑھ کر سو سکے۔ اس بزرگ کے چاروں طرف کوئی لگ بھگ سو ننگ دھڑنگ بچوں کا ہجوم تھا جسے وہ کیو بنانے کے فوائد سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان اَن پڑھ ٹھوٹ بچوں کی عقل حساب دان سے کہیں بہتر تھی کیونکہ ان کے اندر والا بھوکا حساب داں خوب جانتا تھا اگر تیس روٹیوں کو دو سو ننگے بھوکوں اور تین لحافوں کو بیس ہزار مستحقین میں تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم میں کچھ بزرگ کے تن پر ایک دھجی بھی باقی نہ رہے گی۔ اور اس وقت یہی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ بشارت آگے بڑھے تو دیکھا کوئی جھگی ایسی نہیں جہاں سے بچوں کے رونے کی آواز نہ آ رہی ہو۔ پہلی مرتبہ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ بچے رونے کی ابتدا ہی انترے سے کرتے ہیں۔ جگیوں میں آدھے بچے تو اس لیے پٹ رہے تھے کہ رو رہے تھے اور بقیہ آدھے اس لیے رو رہے تھے کہ پٹ رہے تھے۔

"وہ سوچنے لگے تم تو ایک شخص کو پُرسا دینے آئے تھے یہ کس دکھ ساگر میں آ نکلے طرح طرح کے خیالوں نے گھیر لیا جیسے یہاں کو تو کسی کو بھی ایسا ہی نصیب ہوا ہوگا۔ یہ کیسی بستی ہے جہاں بچے دو گھر میں کھیل سکتے ہیں نہ باہر جہاں بیٹیاں دو گز زمین پر ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے درختوں کی طرح بڑی ہو جاتی ہیں جب یہ دلہن بیاہ کے پردیس جائے گی تو اس کے ذہن میں بچپن اور میکے کی کیا تصویر ہوگی؟ پھر خیال آیا کیسا پردیس، کہاں کا پردیس! یہ تو بس لال کپڑے پہن کر یہیں کہیں ایک جھگی سے دوسری جھگی میں پیدل چلی جائے گی۔ یہی یکساں سہیلیاں "کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے!" گاتی ہوئی اسے دو گز پرائی زمین کے ٹکڑے تک چھوڑ آئیں گی۔ پھر ایک دن مینہ برستے میں جب ایسا ہی سماں ہوگا اس سے آخری دو گز زمین کی جانب ڈولی اٹھے گی اور زمین کا بوجھ زمین کی چھاتی میں سما جائے گا۔ مگر سنو! بندۂ خدا! تم کاہے کو یوں جی بھاری کرتے ہو؟ کہیں اس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کے دنیا کو دیکھا کرتے ہیں! درختوں کو کیچڑ گارے سے گھن تھوڑا ہی آتی ہے۔ کبھی پھول کو بھی کھاد کی بدبو آئی ہے؟

انھوں نے ایک پھریری لی اور ان کے ہونٹوں کے دائیں کونے پر ایک کڑوی سی، ترچھی سی مسکراہٹ کا بھنور پڑ گیا جو جینے کا یارا نہیں رکھتے وہ اس طرح مسکرا دیتے ہیں۔

انھوں نے پہلے پہلی اس محمود بستی کو دیکھا تھا تو کیسی ہول آئی تھی۔ ڈر خوف آ رہا تھا۔ بھیگی بھیگی چاندنی میں یہ جھملکا سا آسیب لگتا تھا جو کسی طور پر کراچی کا حصہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ حد نگاہ تک اونچے نیچے بانس ہی بانس، اور لٹکتی چٹائیوں کی گپھائیں۔ بستی

یہی بستی ہو بجز کی تھا جسے رنجی دھما کے کے بعد بچ جانے والوں
نے کلہا ہو۔ ہر محلے میں چاند نکلا ہوا تھا اور جیب دلدلوں پر
آسیبی کرنیں اپنا جلالی ناچ ناچ رہی تھیں۔ جھینگر جگہ جگہ بولتے سنائی
دے رہے تھے کوئی کسی جگہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ جھینگروں کے ڈر سے
لوگوں نے لالٹینیں گل کر دی تھیں عین تارت کے
سرے اور سے چاند کو کاٹتی ایک طیری ہوتی ہوئی گزری۔ اور
مجھے ایسا لگا جیسے اس کے سر پر کی ہوا سے ان کے سر کے بال
اُڑے ہوں۔ نہیں یہ ایک بھیانک خواب ہے۔ جیسے ہی وہ موٹے
مٹالے گرتیوں ہو، وہاں بی ایک سو گوار لیٹ آئی اور آنکھیں
ایکا ایکی چکا چوند ہو گئیں۔ یا خدا! ہوش میں ہوں یا عالم خواب ہے؟
کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا کرامت حسین کی حویلی کے دروازے پر
ایک میٹر ڈیکس جل رہی ہے۔ چار پانچ پُرسا دینے والے کھڑے
ہیں اور باہر راستوں کے ایک چبوترے پر ان کا سفید براق گھوڑا
بن کھڑا ہے!

مولانا کا پولیو زدہ بیٹا اس کو پڑوسی کے گھر سے آئے
ہوئے موت کے کھانے کی نان کھلا رہا تھا۔"

اور تصویریں اکلوتی تصویریں نہیں جا بجا ایسے مرقع اور ایسے آئینہ خانے پڑے
جگمگاتے ہیں کہ ان پر ٹھہر کر کوئی رو قہقہہ لگانے والا یا دو آنسو بہانے والا بھی نہیں،

"بشارت نے حویلی کے باہر کھڑے ہو کر مولانا کو آواز دی حالانکہ
اس کے "اندر" اور "باہر" میں کچھ ایسا فرق نہیں تھا بس چٹائی ٹاٹ
اور بانسوں سے اندر کے کچرا اور باہر کے کچرے کے درمیان حد بندی
کر کے ایک خیالی PRIVACY (تخلیہ) اور ملکیت کا حصار کھینچ کیا تھا،
یہ میری لحد، وہ تیری ہے

کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے حیدرآبادی انداز میں تالی بجائی جس کے جواب میں اندر سے چھ بچوں کے تلے اوپر پتیلیوں کا سا سیٹ نکل آیا جن کی عمروں میں بظاہر نو نو مہینے سے بھی کم فرق نظر آرہا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے نے کہا مغرب کی نماز پڑھنے گئے ہیں تشریف رکھیے۔ بشارت کی سمجھ میں نہ آیا کہاں تشریف رکھیں، ان کے پیر تلے اینٹیں ڈگمگا رہی تھیں۔ تعفّن سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ جہنم اگر روئے زمین پر کہیں ہو سکتا ہے تو

ہمیں است و ہمیں و ہمیں است

وہ دل ہی دل میں مولانا کو ڈانٹنے کا ریہرسل کرتے ہوئے آئے تھے "یہ کیا اندھیر ہے مولانا!" کچھ کہا کہ مولانا کہنے کے لیے انھوں نے بڑے طنز و تلخی سے وہ لہجہ کمپوز کیا تھا جو بہت بڑی گالی دیتے وقت اختیار کیا جاتا ہے لیکن جھگی اور کیچڑ دیکھ کر انھیں اچانک خیال آیا کہ میری شکایت پر اس شخص کو بالفرض جیل ہو جائے تو اس کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مولانا پر پھینکنے کے لیے طعن و تشنیع کے جتنے پتھر وہ جمع کر کے لائے تھے ان پر داڑھیاں لگا کر جانماز پر لپیٹ دی تھیں تاکہ چوٹ بھلے ہی نہ آئے، شرم تو آئے۔ وہ سب دھرے رہ گئے۔ ان کا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ اس شخص کو گالی دینے سے فائدہ؟ اس کی زندگی تو خود ایک گالی ہے۔ ان کے گرد بچوں نے شور مچانا شروع کیا تو سلسلۂ ملامت ٹوٹا۔ انھوں نے ان کے نام پوچھنے شروع کیے۔ تیمور، بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب۔ یا اللہ! پورا دودمانِ مغلیہ اس جھگی میں تاریخی تسلسل سے ترتیب وار اترا ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے ناموں کا اسٹاک ختم ہو چکا مگر اولادوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ چھٹے بیٹوں پر آکر رک گئے تھے

مثلاً ایک دفعہ اکبر کا پیارا نام (مرزا) کوکا تھا جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا جس کو اس نے قلعے کی فصیل پر سے نیچے پھنکوا دیا تھا۔ اگر حقیقی بھائی ہوتا تو اس سے بھی زیادہ سخت سزا دیتا یعنی قزاقوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے حج پر بھیج دیتا یا آنکھیں نکلوا دیتا وہ بھی پہل کرتا تو از راہ ترحم خسروانہ وشفقت پدرانہ جلاّد سے ایک ہی وار میں سر قلم کروا کے اس کی مشکل آسان کر دیتا۔ جو شیرخوار یا کمسن بچے بچ رہ گئے تھے ان کے ناموں سے بھی شکوہ شاہانہ ٹپکتا اور تاج و تخت سے وابستگی کا نشان ملتا تھا حالانکہ یاد نہیں آرہا تھا کہ ان میں سے کون تخت پر متمکن ہونے کے بعد قتل ہوا اور کون پہلے۔ بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد انتزاع سلطنت اور طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ بارہ سال میں آٹھ بادشاہ اس طرح سریر آرائے سلطنت ہوئے کہ ایک بادشاہ ٹھیک سے بیٹھ نہیں پاتا تھا کہ اس کا تختہ الٹ دیا جاتا۔ تاج اور سر ہوا میں بازی گر کی گیندوں کی طرح اچھلتے تھے ہر چند کہ اورنگ زیب کو موسیقی سے نفرت تھی لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی تخت و تاج کے دعویداروں نے شاہی تخت کے گرد میوزیکل چیئرز کھیلنا شروع کر دیا اس ادنیٰ تصرف کے ساتھ کہ میوزک بجانے شاعر لہک لہک کر قصیدے پڑھتے اور جب پڑھتے پڑھتے اچانک رک جاتے تو ایک نیا شہزادہ جھٹ سے تخت پر بیٹھ جاتا۔ نادر شاہ کو یہ مغلئی کھیل ایسا بھایا کہ تخت طاؤس اٹھوا کے وطن لے گیا۔ اس کے باوجود کھیل جاری رہا۔ تخت اٹھوانے کے ضمن میں ہم نے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری کا محاورہ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا اس لیے کہ چین کی بانسری بجانے کے لیے بادشاہوں اور آمروں کو بانس کی محتاجی کبھی نہیں رہی شاہوں

کا ناز پانے ہی کی نہیں، پانے کی بھی نہیں ہوتا۔

"ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ خانوادۂ تیمور کے جو باقی ماندہ چشم و چراغ جگی کے اندر تھے ان کے نام بھی تخت نشینی بلکہ تختہ اُلٹنے کی ترتیب کے اعتبار سے درست ہی ہوں گے اسی لیے کہ مولانا کا حافظہ اور تاریخ کا مطالعہ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گویا عمل بیانیہ وقت انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کو تاریخِ مغلیہ کے تقاضوں اور تخت نشینی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے تابع رکھا ہے۔ بشارت نے پوچھا تم میں سے کسی کا نام اکبر نہیں؟ بڑے لڑکے نے جواب دیا نہیں جی وہ تو دادا جان کا تخلص ہے۔

گفتگو کا سلسلہ انھوں نے کچھ بچوں سے شروع کیا۔ انھوں نے دریافت کیا، تم کتنے بھائی بہن ہو؟ جواباً ایک بچے نے ان سے پوچھا آپ کے کتنے چچا ہیں؟ انھوں نے دریافت کیا کہ تم میں سے کوئی پڑھا ہوا بھی ہے؟ بڑے لڑکے تیمور نے ذرا اٹھلا کر کہا، جی ہاں! میں ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی، مسجد میں بغدادی قاعدہ پڑھ کر کبھی کا فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ تین سال تک پنکھے بننے کی ایک فیکٹری میں مفت کام سیکھا، ایک سال ہوا داہنے ہاتھ کا انگوٹھا مشین میں آگیا، کاٹنا پڑا۔ اب مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا ہے۔ ہمایوں اپنے ہم نام کی طرح ہنوز خواری و آوارہ گردی کی منزل سے گزر رہا تھا۔ جہانگیر تک پہنچتے پہنچتے پاجامہ بھی بالیدگی کی نذر ہوگیا۔ البتہ شاہ جہاں کا ستر پھوڑوں، پھنسیوں، پیوندوں اور پٹیوں سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ اورنگ زیب کے تن پر صرف اپنے والد کی ترکی ٹوپی تھی۔ بشارت کو اس کی آنکھیں اور ان سے شرارت نظر آئی۔ سات سال کا تھا مگر بے حد آتونی [illegible]

تو میں نے ساری زندگی میں نہیں دیکھی۔ ہاتھ پیر ماچس کی تیلیاں۔ پیٹ اس کے غبارے کی طرح پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ کہیں پھٹ نہ جائے۔ کچھ دیر بعد ننھی نوجوان آئی۔ اس کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں میں کاجل اور کلائی پر نظر گزر کا ڈورا بندھا تھا۔ سارے منہ پر میل، کاجل، ناک اور گرد لپی ہوئی تھی۔ سوائے ان حصوں کے جو ابھی ابھی آنسوؤں سے دُھلے تھے۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سنہری بالوں میں میلی لکڑیوں کے کڑوے کڑوے دھوئیں کی بو بسی ہوئی تھی۔ ایک بھولی سی صورت کا لڑکا اپنا نام شاہ عالم بتا کر چل دیا۔ آدھے راستے سے واپس آکر کہنے لگا میں بھول گیا تھا کہ شاہ عالم تو بڑے بھائی کا نام ہے۔ یہ سب مغل شہزادے کیچڑ میں ایسے مرے سے بھاگ چل رہے تھے جیسے ان کا سلسلۂ نسب امیر تیمور صاحبقراں کے بجائے کسی راج ہنس سے ملتا ہو۔ ہر کونے کھدرے سے بچے اُبلے پڑ رہے تھے۔ ایک ہکلانے والا اور یہ شبر! دماغ چکرانے لگا

عالم تمام حلقۂ دامِ عیال ہے

کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

کچھ دیر بعد مولانا آتے ہوئے نظر آئے۔ کیچڑ میں ڈگمگ ڈگمگ کرتی اینٹوں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہے تھے۔ اس ڈانواں ڈول پگڈنڈی پر اس طرح چلنا پڑتا تھا جیسے سرکس میں کرتب دکھانے والی لڑکی تنے ہوئے تار پر چلتی ہے لیکن اس کی کیا بات ہے۔ وہ تو خود کو کھلی چھتری سے بیلنس کرتی رہتی ہے۔ ذرا ڈگمگا کر گرنے لگتی ہے تو تماشائی پلکوں پر جھیل لیتے ہیں۔ مولانا خدا جانے بشارت کو دیکھ کر بوکھلا گئے یا اتفاقاً ان کی کھڑاؤں اینٹ پھسل گئی

وہ دائیں ہاتھ کے بل جس میں دم کے پانی کا گلاس تھا گرے۔
ان کا تہمد اور داڑھی کیچڑ میں لت پت ہو گئی اور ہاتھ پر کیچڑ کا
موزہ سا چڑھ گیا۔ ایک بچے نے بدقلعی لوٹے سے پانی ڈال کر ان
منہ ہاتھ دھلایا، بغیر صابن کے۔ انھوں نے انگوچھے سے تسبیح، منہ
اور ہاتھ پونچھ کر بشارت سے مصافحہ کیا اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے
بشارت ڈھے چکے تھے۔ ریہرسل کیے ہوئے طعن آمیز ابتدائیہ
فقرے جو داڑھی نماز اور سٹے سے متعلق تھے اس کیچڑ میں غرق ہو گئے
قصرِ تقدس کا چھجا والی پھبتی بھی اسی بیچ بھاتی دلدل میں دھنستی
چلی گئی۔ ان کا بے اختیار جی چاہا کہ بھاگ جائیں مگر دلدل میں آدمی
جتنی تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اتنی ہی تیزی سے دھنستا
چلا جاتا ہے۔

" ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب شکایت و فہمائش کا آغاز کہاں سے
کریں۔ اسی شش و پنج میں انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے جس سے
ذرا دیر پہلے بکراہت مصافحہ کیا تھا، ہونٹ کھجایا تو ابکائی آنے
لگی۔ اس کے بعد انھوں نے اس ہاتھ کو اپنے جسم اور کپڑوں سے
ایک بالشت دور رکھا۔ مولانا غایتِ آمد بھانپ گئے۔ خود پہل کی
اس اعتراف کے ساتھ کہ میں آپ کے کوچوان رحیم بخش سے پیسے
لیتا رہا ہوں۔ پڑوسن کی بچی کے علاج کے لیے انھوں نے یہ بھی
بتایا کہ میری تعیناتی سے پہلے یہ دستور تھا کہ آدھی رقم آپ کا
کوچوان رکھ لیتا تھا۔ اب جتنے پیسے آپ سے وصول کرتا ہے وہ
سب مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اس کا حصہ ختم ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن
وہ مجھ سے اپنی بیوی کے لیے تعویذ لے گیا۔ اللہ نے اس کا مرض
دور کر دیا۔ وہی شافی و کافی ہے۔ وہی چلاتا اور بلاتا ہے۔ اس

کے بعد وہ میرا مقدر ہو لیا۔ بہت دکی اللہ۔

مولانا نے یہ بھی بتایا کہ پہلے آپ چالان اور رشوت سے بچنے
جب بھی بعد دستہ بدے کا حکم دیتے وہ محکمہ والوں کو اس کا پیشگی
نوٹس دے دیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑھا و زحمت پکڑا جاتا تھا بلکہ یہاں
تک ہوا کہ ایک دفعہ انسپکٹر کو نمونیہ ہو گیا اور وہ تین ہفتے تک ڈیوٹی
پر نہیں آیا تو محکمہ ہمارے آفس میں یہ دریافت کرنے آیا کہ اتنے
دن سے چالان کیوں نہیں ہوا، خیریت تو ہے؟

بشارت نے تین سوال کو حوالہ ان سے متعلق تو کیے لیکن مولانا
کو کچھ کہنے سننے کا اب ان میں یارا نہ تھا۔ ان کا بیان جاری تھا۔ وہ
بجوب خاموشی سے سنتے رہے۔

"میرے والد کے کولہے کی ہڈی ٹوٹے دو سال ہو گئے۔ وہ
سامنے پڑے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ چارپائی کاٹ دی ہے۔ مستقل
لیٹے رہنے سے ناسور ہو گئے ہیں۔ ایک تو اتنا گہرا ہے کہ پوری انگلی
اندر چلی جائے۔ انگلی برابر موٹی ایک رگ اندر نظر آتی ہے۔ پیپ
رستی رہتی ہے۔ زخم صاف کرتے ہوئے مجھے کئی دفعہ قے ہو چکی ہے۔
ڈالڈا کے ڈبوں میں پانی بھر کے چاروں پایوں کے نیچے رکھ دیے
ہیں تاکہ دو موہے لال چیونٹے زخموں میں نہ گھسیں۔ پڑوسی آئے دن
جھگڑتے ہیں کہ تمہارے بڑے میاں دن بھر تو خراٹے لیتے ہیں اور رات
بھر چیخیں کرتے ہیں۔ ناسوروں کی سڑاند کے مارے ہم کھانا نہیں
کھا سکتے۔ وہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ فقط چٹائی کی دیوار ہی تو بیچ میں
ہے۔ چار مہینے قبل فضلِ ایزدی سے ایک اور فرزند تولد پذیر ہوا۔
اللہ کی دین ہے۔ بن مانگے موتی ملیں، مانگے ملے نہ بھیک۔ اللہ میاں
کی امت کو بڑھا رہا ہے۔ زچگی کے بعد ہی بیوی کو (WHITE LEG .

ہو گئی، ہل نہیں سکتی۔ مرضیٔ مولا۔ رکشا میں ڈال کر ضلع اسپتال لے
گیا۔ کہنے لگے فوراً اسپتال میں داخل کراؤ۔ مگر یہاں کوئی بیڈ خالی نہیں
ہے۔ ایک مہینے بعد پھر لے گیا۔ ابکی دفعہ کہنے لگے، اب لائے ہو! ایسی
بیماری ہے، ہم ایسے مریض کو ایڈمٹ نہیں کر سکتے۔ صبر کیجیے۔ راضی ہیں
ہم اُس میں جس میں رضا ہو تیری۔ فجر اور مغرب کی نماز سے پہلے دونوں
مریضوں کا گوہ موت کرتا ہوں۔ نماز کے بعد خود روٹی ڈالتا ہوں تو کچھ
کمر پیٹ میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک دفعہ نورجہاں نے ماں کے لیے بکری
کا دودھ گرم کیا تو کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر
ہے میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں:"

بشارت اب کہیں اور پہنچ چکے تھے۔ اب انھیں بدبو آرہی
تھی نہ متلی ہو رہی تھی۔ سناٹے میں آ گئے تھے:

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانۂ دہر
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

مولانا نے کہا کہ "دائی کا علاج ہے۔ عرق مکو، رومی مصطگی، مغز بنفشہ اور
افیم کا لیپ بتایا ہے۔ بڑی ہمدرد عورت ہے۔ فجر اور مغرب کی نماز
کے بعد مسجد سے پانی دم کروا کے لاتا ہوں، سو ڈیڑھ سو نمازیوں
کے انفاس متبرکہ بڑے بڑے رئیسوں کو نصیب نہیں ہوتے مگر شاید
مولا کو شفا منظور نہیں۔ مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ:"

مشیت ایزدی اور مرضیٔ مولا کے جتنے حوالے اس آدھ گھنٹے
میں بشارت نے سنے اتنے پچھلے دس برسوں میں بھی نہیں سنے
ہوں گے۔ مولانا کی باتوں سے انھیں ایسا لگا جیسے اس بے نوا نگری
میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کی عین مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔
انھیں اس سرنگ کے دوسری طرف بھی اندھیرا ہی اندھیرا نظر

زیادہ بسی ناامیدی، بےبسی، بےکسی، مایوسی، جیسے اور اندھیرے کی تصویر
کھینچنے کے لئے تو دانتے کا قلم چاہئے۔

پلیدیانہ

مولانا کو جیسے کوئی بات یاد آگئی اور وہ معذرت کرکے
کہ نماز کا وقت ہے مسجد چلے گئے۔ بشارت اپنے خیالات میں کھو گئے
اس ایک آپارٹمنٹ میں جس میں نہ کمرے ہیں، نہ پردے، نہ دیواریں
نہ دروازے، جس میں آواز، بیس اور سوچ تک ننگی ہے۔ جہاں لوگ
شاید ایک دوسرے کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ایک کونے میں
بوڑھا باپ پڑا دم توڑ رہا ہے، دوسرے کونے میں زچگی ہو رہی ہے اور
درمیان میں بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ بھائی میرے! جہاں تنخواہ ثبوت
ملتی وہاں تھوڑی سی اور ٹ کر بیوی کو اسپتال میں داخل کرا لیتے
تو کیا حرج تھا۔ جان پر بنی ہو تو شراب تک حرام نہیں رہتی۔ لیکن
پھر ماندی، جو ہاڑ جھاڑ دوبارہ کون کرتا؟ اس ڈبر کا پیٹ کیسے بھرتا۔
مولانا نے بتایا تھا کہ زچگی کے دوسرے ہی دن بیوی نے بچوں کے
لئے روٹی پکائی اور کپڑے دھوئے تھے۔ بشارت سوچنے لگے کہ ان چنگیز
تاتاری عورتوں کے قصیدوں سے تو تاریخ بھری پڑی ہے جو عرب
شام کے بیان کے مطابق تیمور کی فوج کے شانہ بشانہ نیزوں اور
تلواروں سے لڑتی تھیں۔ اگر کوچ کی حالت میں کسی عورت کے درد زہ
ن شروع ہو جاتا تو وہ دوسرے لشکر سواروں کے لئے راستہ چھوڑ کر
ایک طرف کو کھڑی ہو جاتی، گھوڑے سے اتر کر بچہ جنتی، پھر اسے کپڑے
میں لپیٹ کر اپنے گلے میں حمائل کرتی اور دوبارہ گھوڑے کی ننگی
پیٹھ پر سوار ہو کر لشکر سے جا ملتی۔ مگر جھگیوں میں چپ چاپ جان
سے گزر جانے والی ان بے نام بی بیوں کا نوحہ کون لکھے گا؟ بشارت

ادم ہلنے لگا۔ اب تک مولانا نے کل ملا کر یہی سو ڈیڑھ سو روپے وصول کیے ہوں گے وہ ناحق یہاں آئے۔ انھوں نے موضوع بدلا اور دیہ کے پانی کی تاثیر کے بارے میں سوچنے لگے کہ ابھی تو یہ بےچاری ایک بیماری میں مبتلا ہے، سو آدمیوں کا بھوکا ہوا پانی پی کر سو نئی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گی۔

کچھ دیر بعد مولانا نے اندر پردہ کرایا یعنی جب نورجہاں نے اپنی بیماریاں کو سر سے پیر تک چیکٹ لحاف اُڑھا کر لٹا دیا تو مولانا نے بشارت کو جنگلی میں چلنے کو کہا۔ دونوں ایک چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئے۔ ادوان پر ایک نقشین سینی میں تام چینی کی نیلی چینک اور دو کپ رکھے تھے کپ کے کناروں پر مکھیوں کی کلبلاتی جھالر مولانا نے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈالی اور انگلی سی اچھی طرح رگڑ کر دھویا، پھر اس میں چائے بنا کر بشارت کو پیش کی۔ اگر وہ انگلی سے نہ دھوتے جو کچھ دیر پہلے کیچڑ میں سنی ہوئی تھی تو شاید اتنی اُبکائی نہ آتی۔ مولانا چائے دینے کے لیے جھکے تو اُن کی داڑھی سے گڑ کی بو آ رہی تھی۔

مولانا کا بیان جاری تھا۔ بشارت میں اب اتنا حوصلہ باقی نہ تھا کہ نظر اٹھا کر ان کی صورت دیکھیں۔ مجھے فکر۔ انسداد بے رحمی جانوران ساٹھ روپے تنخواہ دیتا ہے۔ ایک بیٹا سات سال کا ہے۔ ذہین ذیل اور شکل و صورت میں سب سے اچھا، چار پانچ مہینے ہوئے اسے تین دن بڑا تیز بخار رہا، چوتھے دن بائیں ٹانگ رہ گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا، بولا پولیو ہے، انجکشن لگا دیے۔ مولا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ میرا صرف ایک ہی ٹانگ سے معذور ہوا۔ محلے میں چار بچوں کو چھوڑ کر ایک بچی کی دونوں ٹانگیں رہ گئیں۔ مولا کی

ہوتی ہے جس کو جب چاہتا ہے عطا ہوتی ہے۔ بن باپ کی بچی ہے گھر
کا نہیں کہاں سے عقد میں نے اپنے بیٹے کے ممبی جگہ جن اس بچی
کو تو دیکھا بتاؤں اس بیوی بی بی نے کیسی دعائیں دی ہیں
ابھی اس وقت اس بچی کے لیے بھی دعا کرتا ہوں۔ ہر جمعہ کو جنگلی کبوتر
کے خون اور لونگ اور بادام کے تیل سے بیٹے اور اس بچی کی ٹانگوں
کی مالش کرتا ہوں۔ ویسے اس ڈاکٹر کا علاج بھی جاری ہے۔ آپکے
کوچوان سے جتنی بار پیسے لیے ہیں علاج معالجے کے واسطے لیے۔
بشارت کو ایسا محسوس ہوا جیسے دماغ سن ہو گیا ہو۔ بیماری
بیماری، بیماری، یہاں لوگ کیا گمان بچے پیدا کرنے اور بیمار پڑنے
کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اس آدھ گھنٹے میں ان کے
منہ سے بمشکل دس بار جملے نکلے ہوں گے۔ مولانا ہی بولتے رہے۔
بشارت کی زبان پر ایک سوال آ آ کر رہ جاتا تھا کیا سب جھگیوں میں
یہی حال ہے؟ کیا ہر گھر میں لوگ اسی طرح ریجھ ریجھ کر جیتے ہیں؟
مولانا تمہاری تھے میں سے قرض حسنہ سمجھ کر معاف کر دیجیے۔ آپکے
کوچوان نے دھمکی دی تھی کہ ہمارا صاحب کہتا ہے داڑھیل کو بول
دینا کہ ایسا ذلیل کروں گا، ایسا ملیا میٹ کروں گا کہ یاد کرے گا
یہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ برستا بادل ہمارا اوڑھنا اور کیچڑ ہمارا بچھو
ہے اس کے آگے اب کیا اور ہو گا؟ مولانا سے دعا کی تھی کہ اکل حلال
اور صدق مقال عطا ہو عزت کی روٹی ملے، گناہ گار ہوں، دعا
قبول نہ ہوئی۔ اس پر سب کچھ روشن ہے۔ آج صبح ناشتے میں ایک
روٹی کھائی تھی اس کے بعد ایک کھیل کا دانہ بھی منہ میں گیا ہو تو
لحم الخنزیر ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ وہ کہتا
ہے کہ تم تھکے ہو بس اور حاضر ہو کر تمہارے ہاتھ سے ایک کوڑی ایک

معدہ اٹھا کر لے جائے تو تم اس سے چھین نہیں سکتے:"

مولانا نے کرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھایا جس میں غار پڑ ہوا تھا دھونکنی سی چل رہی تھی۔ بشارت نے نظریں جھکالیں۔

"مدت سے حضرت ذہین شاہ جی سے بیعت ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک پڑوسی نے جو اس بیوہ بی بی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور مجھے اس میں حارج سمجھتا ہے پیر و مرشد کو ایک گمنام خط بھیجا کہ میں رشوت لیتا ہوں۔ اب حضرت فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمتہ نے رزق حلال کو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا ہے ارشاد فرمایا کہ جب تک تم رشوت کا ایک ایک پیسہ واپس نہ کردو گے پلید ہاتھ سے بیعت نہیں لوں گا۔ خدا مجھ پر رحم فرمائے میرے حق میں دعا کیجیے:"

مولانا ان کے سامنے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ ان کے ملیشیا کے کرتے پر جذب ہوتے آنسوؤں کا ایک سیاہ زنجیر سا بن گیا تھا۔ بشارت نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا:"

ایک اور تصویر ملاحظہ ہو۔

"کراچی کی سڑکیں جاگ رہی تھیں۔ سینما کا آخری شو ابھی ختم ہوا ہی تھا کاروں کے شیشوں پر اوس کے ریلے بہہ رہے تھے اور اس کی کیفیت بھیگ چلی تھی۔ پیلس سینما کے پاس بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک جوان نیم برہنہ پاگل عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی بچے کی آنکھیں دکھنے آئی ہوئی تھیں اور سوجن اور چیپڑوں سے بند ہو چکی تھیں۔ ننگی چھاتیوں پر بچے نے دودھ ڈال دیا تھا جس پر مکھیوں نے چھاؤنی چھا رکھی تھی۔ ہر گزرنے والا ان حصوں کو جو کھیوں سے بچ رہے تھے صرف خوف سے دیکھتا بلکہ مڑ مڑ کے ایسی نظروں سے گھورتا چلا جاتا کہ بہ

پہلا مشکل تھا کہ دوسرا بھکاری کون ہے پاس ہی الومینیم کے
بھٹے ہوئے پیالے میں منہ ڈالے ایک کتا اسے زبان سے چاٹ چاٹ
کر صاف کر رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک سات آٹھ سال کا لڑکا
موتیا کے گجرے بیچ رہا تھا۔ انھوں نے ترس کھا کر ایک گجرا لیا اور
بالشل کو دے دیا۔ اس نے اسے انگلی کی نال پر لپیٹ لیا۔
بشارت سر جھکائے خیالوں میں گم بندر روڈ، عیدگاہ، صدر اور
نرسری ہوتے ہوئے پی ای سی ایچ ایس پہنچے تو ایک کا عمل ہوگیا
انھوں نے دو لیس کا ڈی کے نوٹ ... کھڑی اور اس کی زندگی
میں لکڑی جو چھڑوں سے بچ گئی تھی اپنے ہاتھوں سے تھانیدار
کے پلاسٹر پر ڈال آئے
ہے کہانی دور مکافاتِ عمل نظر آئے دیگر" (صفحہ ۱۹)"

اس درد مندی کا ایک پہلو یہ ہے کہ یوسفی کے ہاں ملتو کے گھے فرشتوں کا گزر
ہی یہاں تو ایسے لوگ ہیں جو سنگ دل جس کا جگر رکھتے ہیں مگر ان کے اندر کچھ ایسی
ہی گداز ہے کہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر فرشتہ ہیں۔ حویلی والے بشارت علی فاروقی
خاص طور پر بشارت علی کے خیرخواہ جہاں صوبہ سرحد کے حاجی اورنگ زیب خاں اور ملا
ہی کا ذکر آچکا ہے۔ کراچی پیر خاں صاحب کا تبصرہ اپنی جگہ، مگر ذرا اس بیان کے
آخری حصے کی درد مندی کا رشتہ شروع کے خشونت سے توجوڑ کر دیکھیے:

"اس سے پہلے ماموں نے ۱۹۲۰ء میں بنوں کے نزدیک کاطوری خیل
علاقے میں ایک پہاڑی کوہ کی کمین گاہ سے تین گورے مار گرائے تھے
ان میں ایک کپتان تھا۔ اس کی صورت بلڈاگ جیسی تھی یہاں خنزیر
کے بچے نفرت ہی کے بے شمار مرید شہید کیے تھے۔ ماموں نے کپتان کے
کان اور ناک کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دیے۔ دوسرے گورے کی

جیب سے جو معمولی سپاہی تھا اس کی قمیص کی جیب میں مع گھڑی ماں اور ایک
سال کی بڑی پیاری سی بچی کے فوٹو نکلے۔ بچی کے ہاتھ میں گڑیا
تھی۔ فوٹو دیکھ کر میرا ماموں بہت رویا۔ لاش کے ہاتھ پر سے جو
سونے کی گھڑی اُس نے اُتاری تھی وہ واپس باندھ دی میت
کو سلائے میں کر کے واپس جا رہا تھا کہ چند قدم بعد کچھ خیال آیا۔ وہ
پلٹا اور اپنی چادر اُتار کر اس پر ڈال دی۔" (صفحہ ۲)

خاں صاحب ——— بظاہر اس لکڑی کے دام وصول کرنے پشاور سے
کراچی آئے تھے جو بشارت نے ان کے ہاتھ فروخت کی تھی اور جو بقول ان کے دلفگار
تکلی دن بھر لڑتے تھے اور حلوہ کھاتے تھے اور پورے گھر کو سر پر اٹھائے رہتے تھے
آخر یہ طے پایا کہ بشارت اپنی سیکنڈ ہینڈ قابل مرمت کار اس رقم کے بدلے ان کے
حوالے کریں اور خلیفہ ڈرائیور ہمرکاب رہے جو حجامت سے لے کر ڈرائیوری تک کے
سبھی فرائض انجام دیتا تھا۔ مگر پشاور پہنچنے کے بعد خاں صاحب کا جو خط آیا اس نے
کچھ اور ہی حقیقت بیان کی۔ بات یہ تھی کہ تین ہفتے پہلے ڈاکٹروں نے خاں صاحب کو
جگر کا سرطان بتایا تھا دوسرے درجے میں جس کا کوئی علاج نہیں۔ ڈاکٹروں کے مشورہ
دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔ خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں
کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو جن کی صحت تمہیں بشاش رکھے۔ ...

"میں نے لنڈی کوتل سے لانڈھی تک نگاہ ڈالی۔ آپ سے زیادہ بھی
خود گرسند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہ
آیا۔ چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آگیا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ
طبیعت کا زنگ اُتارنے کا بہانہ تھا۔" (صفحہ ۳۳۴)

گویا وہ روزانہ کے جھگڑے، وہ ڈوبی ہوئی رقم وصول کرنے پر اصرار، وہ پشتو کی
یہاں سب کچھ محض ڈھونگ تھا۔ محض خوش وقتی سے زندگی گزارنے کا بہانہ اور زندگی
بھی وہ جس کے آخری چند دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ یہی خوش وقتی زندگی کا اصل عرفان

کو ہندو کو جشن کے محلوں میں سو کر ایک مشعلوں کے جلوس کی طرح اس سے گزر جاتا ہے
یہ تماشائی ہو سکتی کی تحریروں کا حاصل ہے یہاں دتمنا دامن گیر ہوتی ہے نہ خواب
ستاتے ہیں ایک خاموش مگر نہایت عمیق دردمندی ہے جو دل کا دامن تھام لیتی ہے
اور جو ٹھہر جاتا ہے۔ اور جب زندگی کا یہ رُخ سامنے آجائے تو انسان کی ہر کمزوری اس
کو پیار کرنے کا ناحیلہ بن جاتی ہے

اعلیٰ آرٹ کی پہچان بھی یہی بتائی گئی ہے کہ وہ ہم میں یہ صلاحیت پیدا کرے کہ ہم زندگی کو اپنا سکے حیات
کو مکمل شکل میں دیکھ اور اختیار کر سکے اس کے جگر سوز زہر اور نشاط انگیز سرمستی کے
ساتھ TO SEE LIFE STEADILY AND AS A WHOLE
اور یہ سمائی محض تماشائی کی غیر جانبدارانہ کیفیت سے نہیں، زندگی میں شرکت اور
گہری شرکت، دردمندی اور گہری دردمندی، عرفان اور گہرے عرفان ہی سے پیدا
ہو سکتی ہے

ہ "سنتری بادشاہ بھی تو طرہ ہے۔ وہ ریڑھی والے کو کب بخشتا ہے، اور غریب ریڑھی والے
کے پاس شام آکر بھاگ ایک سیر سیبوں میں دو دامداد سیب ملا کر تول دیے۔ اس کی ترازو صرف ایک
چھٹانک کم تولتی ہے۔ صرف ایک چھٹانک۔ اس لیے کہ ایک من تولنے کی گنجائش نہیں۔ اسکول ماسٹر
لائق صد رحم و احترام ہے۔ ماسٹر نجم الدین برسوں سے چیتھڑے لٹکائے ظالم سماج کو کوستے
پھرتے ہیں۔ انہیں ساڑھے چار سو روپے کھلائے جائیں تب جا کے بیٹے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور
ہم حیش کہ جو ان سے زیادہ مسکین کون ہوگا، ظلم، ظالم مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا
پیہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے
ساتھ کیا گیا تھا۔ زندہ سالم نکلتا ہے۔ شارک دانتوں سے خون خون کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے
بتلائے ہوئے اصولوں کے مطابق اچھی طرح چبا چبا کے کھاتا ہے۔ بلی چھپکلی، مکڑی اور پھر سب حسب
مقصد و مقدار ضرورت کی گنجائش نکالتے ہیں۔ بھائی میرے، دنشا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ انہیں
انہیں اپنے اکم ٹیکس کے بل بھی کھلنے یاد آگئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔ بھائی میرے! بخشتا
کوئی نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا رزق ہیں۔ بڑے حسن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔
تب نظر آتی ہے اک تو ز ترکی صورت "

ای سبب مشتاق یوسفی کا شمار بھی ان میں ہو گا جن کے سر پر وقت کی اُلٹی موج نے اپنے حباب کا تاج رکھا اور ساعت گزراں نے اپنے تختِ رواں پر بٹھایا (ڈ)

اور سب پھر جانے دیجیے۔ ایسی بے بدل اور بے مثل تصویریں اور کیفیتیں بھلا اس زہر نوشی اور امرت چشی کے بغیر کیونکر ممکن ہو سکتی ہیں:۔

"وہ بھی کیسے ارمان بھرے دن تھے جب ہر دِن ایک نئے کنول کی مانند کھلتا تھا" جب سائے دھانی ہوتے تھے جب دھوپ گلابی ہوتی تھی؟ ان کے تصور ہی سے سانس تیز تیز چلنے لگتی۔ بیتے ہوئے روز و مہ و سال خزاں کے پتوں کی مانند چاروں طرف اڑنے لگتے۔ ہائے! وہ استاد فیاض خاں کی وحشی بگولے کی طرح اٹھتی ہوئی الاپ، وہ گوہر جان کی ٹھنکتی ٹھسکارتی آواز اور مختار بیگم کیسی بھری بھری آسودہ آواز سے گاتی تھی۔ اس میں اُن کی اپنی جوانی تان لیتی تھی۔ پھر خواب جیسے پھسلنے لگتے۔ یادوں کا دریا بہتے بہتے خواب سراب کے آبِ گم میں اُترتا چلا جاتا۔ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگتیں۔ زمین سے لپٹ اٹھتی اور بدن سے ایک گرم مدماتی مہکار پھوٹتی۔ بارش میں بھیگتے تر و تر بہیں گرتے کبھی تو نہ چھپا پاتے پھر بادل باہر بیتر ایسا ٹوٹ کے برستا کہ سب کچھ بہلے جاتا۔

سینے سے گھٹا اٹھے آنکھوں سے جھڑی برسے
پھاگن کا نہیں بادل جو چار گھڑی برسے
برکھا ہے یہ بھادوں کی برسے تو بڑی برسے

چھاجم مینہ برستا رہتا اور وہ ہارمونیم پر دونوں ہاتھوں سے کبھی بین کبھی استاد جھنڈے خاں کی چھپا تی دھوم مچاتی سلامیاں بجانے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ کالے ناگ بلوں سے نکل کے جھومنے لگتے۔ دیکھیں

؎ انشاءاللہ خاں انشا

میں بہار فصل نے کہیں دور سے بہار لا کو سر پٹخ سی طرح سنسنی
پھولوں پر روشنی اس دھنک کو دیکھ دیکھ کر اس کے رنگ اپنے لہولہان
آنکھیں اور کہیں چندن ناموں پر بے چھٹی اور کہیں بجری کے رنگ
بچھانے نہیں بچھے تھے۔ آتش کی لے تیز ہوتی تو فضا کیسی جھنجھنا اٹھی
تو بجلی سی تھی جیسے کسی نے مستی میں زمین اور آسمان کو اٹھا کے پھیر
کی طرح گھما دیا ہو اور اب رنگ تاروں میں جھنک جھنکار ہے کہ کسی طور
تھمنے کا نام نہیں لیتی۔

ہوتی تصویریاں بہت ہیں مگر ان سنوری دھلی شفاف تصویروں کو کوئی کہاں تک دیکھ سکے، ایسی دریا بہت ایسا برکھا پیار (ت) ان سے ٹوٹا پڑتا ہے ٹپکا پڑتا ہے پڑھنے والا حیران ہوتا ہے کہ وہ اب تک زندگی میں کیا کرتا رہا کہ اس کے حسن کی روشنی اور دل و دماغ و جستجو و آرزو کے ان زاویوں سے بے خبر رہا۔ آنکھیں نئے منظروں سے سیراب ہوتی ہیں اور تخیل نئی کائناتی افقوں تک پرواز کرتا ہے لفظوں کی دھنک کھلتی ہے اور لفظ اور لہجہ ان رنگوں کے سمندروں میں کشتی کے بادبان اڑاتے گرتے ہیں۔ غرض یوسفی کا جہاں ان جانی دولتوں اور ثروتوں کے سنہرے لاوے بادلوں میں اُمڈ بہتا چلا جاتا ہے۔

مشتاق یوسفی کے احساس کو نئی دھنک اور فکر کو نیا گداز ہی نہیں بخشا اردو نثر کو ایک نیا لہجہ منفرد دیکھا انہیں اسلوب کی بخشا اور اتنی صفات کے باوجود یہ جملہ کھسلا ہوتا ہے اور صحیح مفہوم کی ادائیگی سے عاری۔ یہ سچ ہے کہ الفاظ کے تلازمے اور مفاہیم کی نئی سرحدیں مشتاق یوسفی کی تحریر سے متعین ہوتی ہیں میر تقی میر نے شاعری میں جس انداز کو ایہام کے بدلے شیوہ بیانی کے نام سے اختیار کیا تھا مشتاق یوسفی نے اس کا نادر نثری بکھر دکھایا ہے لفظ کو نئی جہت دے کر اسے نئی قوت اور نئی توانائیوں اور تلازموں کی جہتوں سے مالا مال کرنا یوسفی کا کمال ہے۔ یہاں لفظ لفظ کے دست ہنر

میں رنگ بولنے لگتے ہیں بلکہ یوں کہیے تہذیب کی نئی سرحدیں ان کی زبان سے بولنے لگتی ہیں۔ لکھا تو انھوں نے کسی اور کے لیے ہے مگر خود ان پر صادق آتا ہے کہ

"مطربِ یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈبل ان کے جملوں
ہی میں نہیں فقروں میں بھی پڑتا تھا۔" (ص ۱۱)

اور ایسے ایسے نازک موقعوں پر وہ ڈبل ڈالتے ہوئے لفظوں اور فقروں کا استعمال کرتے ہیں کہ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی ہے۔ بھلا ذرا اجنتا کی تصویروں کا بیان تو دیکھیے اور اس بیان کے پیچھے ان تصویروں کے بنانے والے بودھ بھکشوؤں کی آرزومندی کی بنتے بگڑتے پہلوؤں پر تو نظر کیجیے کہ لفظ سے کیسے کیسے کام لیے جاسکتے ہیں:۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ ایسی ہی تصویروں کے رنگ زیادہ چوکھے اور خطوط کہیں زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ عیاں ہوتے ہیں اجنتا اور ایلورا کے غاروں کے FRESCOES (دیواری تصویریں) اور مجسمے اس کی کلاسیکی مثال ہیں۔ کیسے بھرے بھرے بدن بنائے گئے ہیں بنانے والوں نے۔ اور بنانے پر آئے تو بناتے ہی چلے گئے۔ گداز پیکر تراشنے چلے تو ہر SENSUOUS خم بل کھاتی، گدراتی چلی گئی۔ سیدھی سپاٹ لکیریں آپ کو مشکل ہی سے نظر آئیں گی۔ مدبر کا کہیں بھی نہیں۔ بھاری بدن کی ان عورتوں اور اپسراؤں کے نقوش اپنے نقاش کے آشوبِ تخیل کی چغلی کھاتے ہیں۔ نارنگی کی قاش ایسے ہونٹ سہار سے زیادہ بھری بھری چھاتیاں جو خود سنگ تراش سے بھی سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ باہر کو نکلے ہوئے بھاری کولہے جن پر گاگر رکھ دیں تو ہر قدم پر پانی دیکھنے والوں کے دل کی طرح بالشتوں اچھل جائے۔ ان کولہوں کے خم و پیچ کے بیچ بل کھاتی کمر الٹی ہیٹ جیسے جوار بھاٹا میں پیچھے ہٹتی لہر۔ پھر وہ ناف جس کی تشبیہ کے لیے سنسکرت شاعر کو کنول کے تنے کا سہارا لینا پڑا...... اس وصل آشنا اور نامحجوب بدن کو اور اس کے

مرقع نگاری EXAGGERATED خطوط اور کھل کھیلتے ابھاروں کو ان ترچھے ہوئے برہمچاریوں اور بھکشوؤں نے بنایا اور نوایلے جن پر کھوگ بلاس حاوی تھا اور جنھوں نے عورت کو صرف جبلتی اور سپنے میں دیکھا تھا اور جب کبھی وہ سپنے میں اتنے قریب آ جاتی کہ اس کے من کی آنچ سے بدن میں الاؤ سا دہک اٹھتا تو فوراً آنکھ کھل جاتی اور وہ جھنجھلی سے آنکھیں ملتے ہوئے سنگلاخ چٹانوں پر اپنے اپنے خواب کھنے شروع کر دیتے:

اور ایسے ہی لمحات میں مورنیں جنگل کا جنگل ناچتا نظر آتا ہے

لفظوں کا یہی ساحرانہ استعمال ہو رہا ہے کبھی سنگیت اور کبھی رقص بن کر فضا پر چھا جاتا ہے کبھی سواریوں کے بیان میں ظاہر ہوتا ہے کبھی پولیس تھانے کی چیرہ دستیوں کے تذکرے ہی کبھی یکہ کی سراپا نگاری میں کبھی کبوتر بازی کی تفصیلات میں اور دوکے پرندوں

۱ اور پاتھوا اور غیر پالتو حیوانوں کے ذکر میں تو کبھی موسیقی اور مجرے کی تصویر کشی میں

"تو صاحب منی بیگم کا چہرہ اور سرے سرے بازو دکھا ایسے تھے کہ کچھ بھی بچپن سے نظمی نظمی سی لگتی تھی۔ ــــ منی بیگم فارسی غزلیں غضب گاتی تھی۔ لوگ بار بار فرمائش کرتے، وہ بھی عموماً بیٹھ کر گاتی تھی کبھی داد کم ملتی یا یوں ہی ترنگ آ جاتی تو یکایک اٹھ کھڑی ہوتی دونوں سارنگیے اور طبلچی بھی اپنے اپنے زرین پٹکے کس لیتے اور استادہ ہو کر سنگت کرتے۔ محفل میں دو چار چکر رقصاں لگاتی۔ پھر عقب بساط پر کھڑے ہو کر ایک ہی جگہ پھرکی کی مانند تیزی سے گھومنے لگتی۔ زردوزی کی لشکارا مارتی پشواز ہر چکر کے بعد اونچی اٹھتے اٹھتے ناف کمر تک پہنچ جاتی۔ یوں لگتا جیسے جگنوؤں کا ایک ہالہ رقص میں ہے اور گردش تیز اور تیز ہوتی۔ کرن سے کرن میں آگ لگتی چلی جاتی۔ پھر دیکھنے والی نظر کو آتی صرف شمع نظر آتا تھا۔

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پر پیچ و تاب

٭

اور جب یکایک تڑکتی نوشوخ سڈول ٹانگوں پر امر بیل کی طرح ترچھی
بلتی چلی جاتی، سازندے اپنے گھٹنے اور کرن پر طبلے کی تھاپتی ہوئی
انگلیوں سے گتا خون اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔" (ص ۲۵)

غرض اس اسلوب کی شیشہ بازی اور محل کاری کو کن لفظوں میں سمیٹیں کہ حق ادا
ہو۔ یہ صحیح ہے کہ یوسفی جنس زندگی کی للک — اور اردو، فارسی اور انگریزی اشعار کی تضمینات
سب طرح شکار ہیں مگر ان کے لفظوں کی گردان کرنا اور ان کے جفت اور طاق کی
شناخت کر کے تخالف اور تطابق کے خانوں میں بانٹنا شفق کے ہوشربا رنگوں
کو PRISM کی بوتل میں بند کرنے سے بھی زیادہ بد مذاقی ہوگی لہٰذا ان کے اسلوب کے
تجزیے سے باز آ کر اس میں ڈوب جانا اور محو ہو کر اس کے عرفان کی سعی کرنا زیادہ
مناسب ہے کہ ہر خوبصورتی کا صحیح ردِ عمل اس کا مقابلہ اور تجزیہ نہیں سپردگی ہے البتہ
اردو نثر کو مبارکباد دیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اسے ایک اور پوشاک ملی ہے اور ایسے
رنگ کی پوشاک جس کا ابھی کوئی نام متعین نہیں ہوا ہے۔ پیراہنِ یوسفی ہی اس کی
پہچان ہے۔

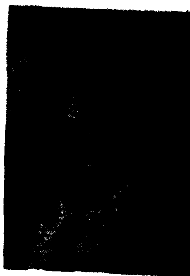
"آبِ گم" کے آئینے میں

"آبِ گم"، مکتبہ دانیال، کراچی۔ صفحات ۴۰۴۔ قیمت ایک سو پچاس روپے

---

۵ کرن: وہ سیاہ حلقہ جو طبلے پر ہوتا ہے۔

آصف فرخی



مشتاق احمد یوسفی سے انٹرویو

آصف فرخی: یوسفی صاحب، سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے آخرکار انٹرویو کے لیے وقت دے ہی دیا۔ آج کی اس گفتگو کو برپا کرنے کا بندوبست کرتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوتا رہا کہ جیسے آپ انٹرویو دینے سے کچھ پہلو بچا رہے ہیں یا کنّی کترا رہے ہیں۔ کیا میرا یہ قیاس درست ہے؟

مشتاق احمد یوسفی: بھئی، یہ ایک حد تک درست ہے۔ اس معنی میں کہ میں اپنے آپ کو کافی عرصے سے ایک گوشہ نشین بلکہ پردہ نشین ادیب سمجھتا ہوں۔ اس لحاظ سے کہ میں ادبی تقریبوں میں بہت کم آتا جاتا ہوں۔ اور آپ کے ساتھ تو حجاب کی کچھ اور بھی وجہ ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ ایک انگریزی پرچے کا نمائندہ یا اُس میں لکھنے والا، ایک اردو لکھنے والے کا انٹرویو کرے تو وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے سرجیکل دستانے پہن کر آپ پلاؤ کھائیں۔ متوسط پلاؤ کی آدھی لذت تو ہاتھ سے کھانے میں ہے اور

اسی میں اس کا لطف ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کا سوال ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ انٹرویوز جو عام طور سے ہوتے ہیں ان میں ہر پھر کے وہی سوال آ جاتے ہیں۔ بیشتر اس میں نجی نوعیت کے سوال ہوتے ہیں۔ ادیب کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ تو اپنی تحریر میں کہہ چکا ہوتا ہے۔ اگر اس میں کچھ تشنگی ہے تو یہ اس کی تحریر کی اور اس کے ادیب ہونے کی تشنگی ہے۔ اس کی ضرورت بالکل نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زبانی بھی کچھ کہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ چنانچہ اپنے بارے میں اور اپنے فن کے بارے میں جو بھی چیز میں نے کہنے کے لائق سمجھی وہ تحریر میں آ گئی۔ اب اس کے علاوہ جو بھی قسم کے سوالات ہوتے ہیں اس میں لوگوں کو ایک دوسری قسم کی دل چسپی ہوتی ہے جس کو خالصتاً ادبی دل چسپی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً یہ کہ شادی آپ نے اپنی مرضی سے کی یا اپنی بیگم کی مرضی سے۔ آپ نے مضمون کب لکھا اور کیسے لکھا اور کیوں لکھا۔ تو ان سوالات کے جوابات، میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی تحریروں میں کما حقہٗ دے دیا ہے اور اس کے بعد جو انٹرویوز میں آج کل ایک رجحان ہے وہ یہ ہے کہ یا تو کوئی چونکا دینے والی بات اپنے بارے میں یا اپنے معاصروں کے بارے میں، یا کوئی اشتعال دلانے والی بات آدمی کہے جس سے اس کو پبلسٹی ملے۔ وہ ہو یا پھر ایک دوسری قسم ہے انٹرویوز کی جس کو آپ CRAFTED CONVERSATION کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی تحریر کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ WELL-REHEASED ہوتی ہے اور ریکارڈ کرا دی جاتی ہے۔ تو میں اپنے آپ کو ان دونوں کاموں کے لائق نہیں سمجھتا اس لیے کم ہی انٹرویو کا موقع ملتا ہے۔

ع ا۔ کرنل محمد خان نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی ہے اور عموماً ایسی باتیں انٹرویوز میں ہی کہی جاتی ہے کہ بہت سے لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے ہیں اور ان میں سے کئی مایوس ہو کر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہوتا

ہے جس قسم کی تیزی اور طراری اور شوخی اور چونچالی کرنل صاحب کی تحریر میں ہے، تو ان کی گفتگو میں بھی اسی قسم کی ہوگی کہ بچے باتوں میں پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہوں گی، اور جب ان لوگوں کا سامنا گوشت پوست کے ایک آدمی سے ہوتا ہے جو کبھی دل چسپ باتیں کرتا ہے اور کبھی اس کی طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوتی، تو وہ کچھ مایوس ہو کر جاتے ہیں۔ تو طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کیا آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ لوگ، اور ان میں انٹرویو کے خواہش مند افراد بھی شامل ہیں، ایسی توقعات لے کر آتے ہیں کہ گویا وہ چراغ تلے اور زرگزشت کا چلتا پھرتا اور متکلم نمونہ ایک شخص کی صورت میں پائیں گے۔

یوسفی: درست ہے آپ کا یہ خیال، اس لیے کہ بیشتر پڑھنے والوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مزاح نگار جیسا کچھ اپنے کرداروں کی صورت میں نظر آتا ہے کتاب میں ویسا ہی وہ خود بھی ہوگا۔ مگر ایسا ہوتا نہیں کبھی۔ یہ غالباً "ڈان کیہوٹے" کے مصنف کا لطیفہ ہے کہ وہ ایک محفل میں گیا اور وہاں ایک ایڈمرل صاحب تھے انھوں نے یہی بات کافی دیر ان کی گفتگو کا انتظار کر کے کہی۔ انھوں نے کہا کہ صاحب بڑی مایوسی ہوئی آپ سے مل کر، اس لیے کہ ظاہر ہے کہ کتاب میں شگفتگی ہے شروع سے آخر تک۔ تو اس نے بڑا معقول جواب دیا۔ اس نے کہا کہ دیکھیے اتنی دیر سے آپ بھی بیٹھے ہیں اور میں بھی بیٹھا ہوں، میں نے آپ سے توپ چلانے کے لیے تو نہیں کہا جو آپ کے فرائض میں داخل ہے۔ تو آپ مجھ سے یہ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ میں یہاں پر پھلجھڑیاں چھوڑوں گا۔ تو کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے کہ لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ کوئی بہت ہی بذلہ سنج آدمی اپنی صحبت میں بھی ہوگا۔ ایسا ہوتا نہیں ہے، اور جن CASES میں ہوتا ہے اُن کی نوعیت دوسری ہوتی ہے اور وہ بہت ہی نادر ہیں۔ مثلاً شوکت تھانوی صاحب تھے، ان میں البتہ یہ خوبی تھی کہ تحریر سے کہیں زیادہ دل چسپ اور شگفتہ وہ صحبت میں ہوتے تھے

ان سے بہتر، ۱۸۸۰ء کوئی منا دشوار تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مصنف سے ملنے کی بہترین صورت جو ہے وہ دو COVERS کے درمیان ہے۔ اور پھر اگر گوشت پوست کے مصنف سے آپ مل رہے ہیں تو پھر آپ کتاب کو بھول جایئے۔ پھر ایک دوسری شکل آپ کے سامنے ہے اس کی پذیرائی پھر آپ پر لازم ہے، جیسا کچھ بھی وہ ہے۔

سوال :- شوکت تھانوی کا آپ نے ذکر کیا تو ان کے بعض دوسرے لوگوں کے بارے میں یہ بات بہت آسانی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی ذکاوت اور بذلہ سنجی کو اپنی گفتگو میں اس طرح بے دریغ لٹا کر اپنی تحریر میں وہ بات پیدا نہ کر سکے۔ آسکر وائلڈ کے بارے میں آنا ہے کہ اس نے اپنا ٹیلنٹ اپنی تحریر میں صرف کیا اور اپنا جینیس اپنی زندگی میں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی احتیاط پسندی آپ کو ایسی صورت حال سے محفوظ رہنے کی یہ راہ سمجھا رہی ہو؟

یوسفی :- دیکھیے صورت یہ ہے کہ ہر آدمی کے پاس ذہانت کا اور بذلہ سنجی کا، اور ایک لحاظ سے، اگر وہ طنز نگار ہے یا مزاح نگار ہے تو تلخی کا یا کونین کا ایک محدود سرمایہ ہوتا ہے کسی کے پاس کم، کسی کے پاس زیادہ، یہ دوسرا سوال ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ ایک دو قطرے کونین کے آپ ایک گلاس میں ڈال دیں تو پورا گلاس کڑوا ہو جائے گا لیکن وہی کونین کے دو قطرے آپ کسی بہت بڑے حوض میں ڈال دیں تو اس کا پتہ بھی نہ چلے گا۔ لہٰذا بہت سے مصنف ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو DIL UTE کرتے رہتے ہیں مسلسل، کہ جب کہنے کی بات نہیں رہی جو کہنے کی بات تھی وہ کہہ چکے اس کے بعد بھی کہے چلے جا رہے ہیں تو پھر کوئی بات بنتی نہیں۔ اسی لیے کوئی نام لینے کی چنداں ضرورت نہیں اور میرے ذہن میں اس وقت معاصرین ہیں بھی نہیں، مگر یہ اودھ پنچ کے جو لکھنے والے تھے انھوں نے

جو وقت تھا اس کے لکھنے والوں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں خاص طور سے کہ ان کی ساری ظرافت اور ساری برجستگی اور ساری شگفتگی جو تھی وہ صرف الفاظ کے گرد گھومتی تھی۔ اس میں کوئی خیال یا کوئی SITUATION یا کوئی جذبہ آپ کو اس کے پیچھے نظر نہیں آتا۔ وہ الفاظ کا نیا کھیل تھی جیسے بچے LEGO یا بہانوں کے سبب سے مختلف چیزیں بناتے رہتے ہیں، اسی طریقے سے وہ الفاظ سے کھیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مزاج جو ہے وہ ایک بہت ہی سطحی قسم کا اور وقتی قسم کا مزاج رہا ہے۔ اس لیے ان کی پیشانی پر آپ سوچ کی کوئی لکیر نہیں دیکھیں گے۔ میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مزاح کہ جو آپ کو سوچنے پر مجبور نہ کرے وہ نابالغ ہے۔

سوال:۔ یوسفی صاحب! آپ نے دو قسم کے مزاح میں تفریق کی۔ مزاح کا ایک انداز وہ ہے کہ جو مضحک SITUATION یا واقعات کے سلسلے سے قارئین میں شگفتگیٔ طبع پیدا کرتا ہے اور انہیں ہنساتا ہے۔ دوسرا مزاح وہ ہے جو سوچنے پر اکساتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے ہاں مزاح کا ایک انداز تو وہ رہا جیسے آپ نے اودھ پنچ کا ذکر کیا، یا پھر کلنڈرے رومانی ہیرو کے بارے میں جو افسانے لکھے گئے، جب کہ آپ کا مزاح کا ڈھنگ دوسرا ہے، مزاح جو کبھی تکلیف بھی دیتا ہے، سوچنے پر بھی اکساتا ہے۔

یوسفی:۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، تفکر کو اور شگفتگی کو میں یکجا دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسی SITUATION جس میں محض HORSE-PLAY ہو، اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اور آج کل ایک بات خاص جو نمایاں ہے خصوصاً مغرب میں کہ مزاح لکھنے والے اب تقریباً ناپید ہو گئے مغرب میں۔ میں پہلے بھی کسی انٹرویو میں ذکر کر چکا تھا کہ جارج میکش نے جو اس دور کا سب سے بڑا مزاح لکھنے والا تھا اس نے میرے خیال میں دس سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی JEST IN MEMORIUM اور اس

میں اس نے اسی بات کا تجزیہ کیا تھا کہ مغرب میں مزاح مرکیوں گیا تو جہاں تک مغرب کا تعلق ہے تو اب اس میں نئے مزاح لکھنے والے پیدا نہیں ہو رہے ہیں قد آور قسم کے۔ ہمارے یہاں البتہ ایک گیپ آئی ایک دم اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مزاح نگاری کا یہ ایک سنہری دور تھا جس میں شفیق الرحمٰن تھے، اور تھے کیا ہیں، کرنل محمد خاں، ضمیر جعفری، محمد خالد اختر اور سرفہرست ابن انشا، اور ہندستان میں مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم ہیں۔ اور رشید احمد صدیقی اور پطرس تو ان سے پہلے ہیں ہی۔ لیکن یہ جتنے نام میں نے آپ کو گنوائے ان میں پطرس اور رشید احمد صدیقی اور ابن انشا، یہ تو مرحوم ہوئے اور باقی کے جتنے نام ہیں ان میں غالباً مجتبیٰ حسین کو چھوڑ کر کسی لکھنے والے کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہے۔ تو جہاں یہ بات بہت ہی فرحت ناک ہے کہ اتنے قد آور لکھنے والے ایک ساتھ ابھرے اردو کے افق پر، وہاں یہ چیز تکلیف دہ بھی ہے کہ ان کے بعد کی جو صف ہے اس میں ایسے قد و قامت کے لوگ فی الحال ابھرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ممکن ہے کہ جو معاشرے کا مزاج ہے مغرب میں اسی کے لحاظ سے ہمارے ہاں بھی کچھ تبدیلیاں آ ئی ہوں۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔

سوال:۔ اس کی ایک صورت تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جیسا کہ آپ سے ابھی ذکر ہو رہا تھا کہ پڑھنے والے مزاح نگار کے تئیں کیا توقعات اور کیا رویے رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں مزاح نگار کی گفتگو سے تو لوگ دل چسپی کا بہت اظہار کرتے ہیں یہاں تک کہ اس سے ہر وقت PERFORMANCE کی توقع رکھتے ہیں، لیکن بسا اوقات اس کی تحریر سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ برداشت اور تحمل اور عالی حوصلگی کو جس حد تک قومی مزاج میں شامل ہونا چاہیے، شاید اس کی کمی ہے۔ اچھے مزاح کو APPRECIATE کرنے کے لیے ان عناصر کی جس قدر ضرورت ہے اس کا فقدان نظر آتا ہے اور اور ...

یہ کمی بدقسمتی ہماری ہے اور صرف ادب کے میدان میں نہیں بلکہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں۔ مثلاً ٹیلی ویژن پر کسی ایک فرقے سے تعلق رکھنے والا کردار مزاحیہ انداز میں دکھا دیا گیا تو اس فرقے کے تمام لوگوں نے یا اس پیشے سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں نے یہ سمجھا کر صاحب ہماری توہین ہو گئی اور ٹی وی والے ہم سے معافی مانگیں یا اخبار والے ہم سے معافی مانگیں۔ ایسی ذہنیت کا مظاہرہ بار بار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے حالات اور ایسی فضا مزاح نگاری کے لیے نقصان دہ ہے؟

یوسفی۔ دو چیزوں میں ہمیں تفریق کرنی چاہیے۔ طنز اور مزاح۔ ہماری اردو میں بدقسمتی سے دونوں لفظ یکجا استعمال ہوتے ہیں کہ طنز و مزاح۔ انگریزی میں مثلاً آپ یہ COMBINATION نہیں دیکھیں گے۔ ایسے نہیں کہتے جیسے کہ ہم HUMOUR & SATIRE۔ کوئی شخص اگر ہے تو وہ SATIRIST ہے یا HUMORIST ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہوگا کہ وہ SATIRIST اور HUMORIST دونوں ہو۔ تو جہاں مزاح کے اپنے تقاضے ہیں کہ مزاح کوئی شخص لکھ نہیں سکتا جب تک کہ اس نے اپنے موضوع سے یا اپنے ہدف سے جی بھر کے اور ٹوٹ کے محبت نہ کی ہو۔ محبت شرط اول ہے طنز میں یہ قطعی ضروری نہیں۔ طنز میں ایک تنفر سے ابتدا ہوتی ہے، ایک ہے کراہتی سے ابتدا ہوتی ہے کہ میرے گرد جو کچھ ہو رہا ہے میں اس کا حصہ نہیں ہوں میں اپنے آپ کو اس سے کوئی رشتہ قایم کرنے کے لیے تیار نہیں پاتا۔ جب کہ مزاح نگار جس مضحک کردار کا یا جس مضحک SITUATION کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کو پیار ہوتا ہے، محبت کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ تو یہ تو ہوا مزاح نگار کا اپنا رویہ لیکن اس کے ساتھ ہی جس پر تنقید کی جائے یا جس کا مضحکہ وہ اڑاتا ہے یا CARICATURE جس کا ترجمہ میں عام طور پر مسخاکہ کرتا ہوں یعنی مسخ، خاکہ، ان دونوں

کو ملاکر ایک لفظ میں نے بنایا ہے CARICATURE کے لیے تو مسئلہ اگر جس کا وہ کھینچتا ہے، تو اتنی سہارا اس معاشرے میں ان کرداروں میں ان اہداف میں ہونی چاہیے کہ وہ اس کو برداشت کر سکیں۔ ہمارے ہاں، جیسا آپ نے اشارہ کیا کہ کسی کے بارے میں آپ لکھیں تو وہ اپنے آپ لکھیں تو وہ اپنے آپ کو ایک خاص طبقے کا یا ایک خاص پیشے کا یا ایک خاص گروہ کا نمائندہ سمجھ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر وکیل ہے تو کہے گا کہ آپ نے وکیلوں کی بے عزتی کی، اور اگر بزنس مین ہے تو وہ اپنے آپ کو بزنس کمیونٹی کا علمبردار کہے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی کے بارے میں بھی کوئی تیز بات یا حقیقت پسندانہ تصویر کھینچنے میں آپ کو خاصا تامل ہوگا۔ تو یہ چیز البتہ مانع ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ لکھنے والا ہر حال میں اور ہر کیفیت میں لکھے، اس کو کوئی چیز روک نہیں سکتی، اور وہ فارسی کی ایک مثل ہے کہ برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی، تو اس میں بھی حکمت ہے کہ برہنہ حرف ہم نہیں کہہ رہے ہیں تو پھر ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ ہر حال میں اور تمام قدغن کے باوجود ہم کوئی نہ کوئی پیرایۂ اظہار نکال لیں گے، اور ایسا ہی ہوتا ہے۔

سوال۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے خیال میں ہمارا معاشرہ طنز نگار اور مزاح نگار دونوں کے لیے مواقع اور خام مواد وافر مقدار میں فراہم کرتا ہے۔

یوسفی:۔ اس وقت تو بہت ہے لکھنے والے کے لیے، وہ تو بکھرا پڑا ہے چاروں طرف۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی معاشرہ نہیں بلکہ ہر معاشرہ خام مواد تو فراہم کرتا ہے لکھنے والے کو جتنا وہ لکھنا چاہے۔ لیکن ایک ایسا معاشرہ کہ جس کے مسائل اتنے گمبھیر ہوں اور جس میں اتنے تضادات ہوں اور جو اتنا CORRUPT ہوگیا ہو تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا کوئی سا بھی سرا آپ اٹھالیں تو اس میں آپ جتنا چاہیں اس کی نقاب کشائی کرتے چلے جائیں۔

سوال :- میرے سوال کا یہی منصب تھا کہ ایسا معاشرہ کہ جس میں رواداری اور
برداشت کم ہوتی چلی جارہی ہوں اور مقدس گائیں یا SACRED COWS
کہ جن پر ہنسنے کی اجازت نہیں ہے، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہو
تو ایسے معاشرے میں مزاح لکھنے کے لیے قلم اٹھانا کسی طرح کے پیشہ ورانہ خطرات
کا حامل نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ابھی یہ بھی فرمایا کہ اب اس
قسم کے جید لکھنے والے تھے مزاح کے میدان میں، تو اب ان کی جگہ لینے کے لیے
نئے لکھنے والے اس تعداد میں یا اس معیار کے مطابق سامنے نہیں آرہے۔
تو کیا ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی تعلق ہے؟ کہیں یہ تعلق سبب
کا تعلق تو نہیں؟

یوسفی :- میں سمجھتا ہوں کہ جو فرق ہمیں پچھلی نسل اور موجودہ نسل میں محسوس ہوتا
ہے کچھ خاص شعبوں میں، وہی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کم و بیش
محسوس ہوتا ہے۔ مگر ایسا ہے کہ راہِ مضمون تازہ کبھی بند نہیں ہوتی۔ اور
یہ سمجھنا کہ اب کوئی اچھے لکھنے والے نہ آئیں گے، یہ بالکل غلط ہے۔ اس سے
بھی بہتر لکھنے والے آئیں گے، اور اسی سے دنیا قایم ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق
کوئی پیشین گوئی کرنا بے معنی ہوگا۔ صرف موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتے
ہوئے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
اس قدو قامت کے لوگ نکل نہیں رہے، نکلیں گے ضرور۔

سوال :- آپ نے جن مزاح نگاروں کا ابھی ذکر کیا تھا، آپ ان میں سے کن
لوگوں سے ذہنی قرابت محسوس کرتے ہیں؟ یعنی جب آپ کا ہنسنے اور
لطف اندوز ہونے کے لیے کتاب پڑھنے کا جی چاہتا ہے تو آپ کیا پڑھتے
ہیں، یعنی 'خاکم بدہن' اور 'زرگزشت' کے علاوہ؟

یوسفی :- پہلی چیز تو یہ کہ میں اپنی کتاب کبھی نہیں پڑھتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ
اس سے بڑا کوئی عذاب کسی ادیب کے لیے نازل نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی تحریر

آپ پڑھے۔ میرے خیال میں جہنم میں یہ ہوگا کہ جو سزا دی جائے گی وہ یہ کہ
کو جو سزا دی جائے گی وہ یہ ہو گی کہ ابدالآباد تک ہم سے ہماری تصنیفیں
پڑھوائی جائیں۔ اس کا تجربہ مجھے ابھی ہوا۔ خلاصہ یہ کہ اس کو لکھے ہوئے بارہ سال
کا عرصہ ہوا۔ "زرگزشت" جو میری آخری کتاب ہے، جب میں نے اپنی یہ
نئی کتاب تقریباً مکمل کر لی تو ایک خیال مجھے یہ آیا کہ بارہ سال سے میں نے
اپنی کوئی کتاب یا آخری کتاب کم از کم نہیں دیکھی ہے تو اس میں مجھے جملوں
کی اور خیالات کی تکرار کا خدشہ محسوس ہوا۔ تو بارہ سال بعد جب میں نے
وہ کتاب پڑھی تو اس میں واقعی مجھے محسوس ہوا کہ کچھ جملوں کی تکرار ہے۔
لیکن وہ ایک بڑا عذاب تھا اور اب جو میں اس کتاب کے پروف پڑھ رہا
ہوں تو وہ ایک اس سے بھی بڑا عذاب ہے۔ لیکن یہ میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں کہ اس کے بعد انشاءاللہ میں ان تحریروں کو اب نہیں پڑھوں گا۔ اب
دوسرے مصنفوں کا آپ نے جو کہا، تو میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب
اس معنی میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی سعادت نصیب کی کہ اتنا
اچھا مزاح پڑھنے کو ملا۔ یہ جتنے نام میں نے آپ کو گنوائے، جنرل شفیق الرحمان،
کرنل محمد خان، ضمیر جعفری، ابن انشا، محمد خالد اختر، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم
اور دوسرے، اور پطرس اور رشید احمد صدیقی، تو ظاہر ہے کہ سرِ فہرست ہیں۔ تو یہ
تو ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم ایسے دور میں پیدا ہوئے کہ جس میں یہ چیزیں
پڑھنے کو ملا۔ اگر یہ حضرات نہ ہوتے تو ہم بھی نہ ہوتے۔ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ
اسی لیے لکھ رہے ہیں کہ یہ حضرات ہم سے پہلے یا ہمارے زمانے میں لکھ رہے تھے
جہاں تک پسندیدگی کا تعلق ہے تو وہ تو سب پسند ہیں لیکن پطرس آج بھی
ایسا ہے کہ کبھی کاہلی لگ جاتی ہے تو اس کا ایک صفحہ کھولتے ہیں تو ان کی بہت
سی گرہیں کھل جاتی ہیں اور قلم رواں ہو جاتا ہے۔ پطرس میں بات ہے لیکن
ایک بات میں عرض کر دوں کہ یہ سوال گھوم پھر کے آتا ہے جہاں تک میرے

کا مزاح کا تعلق ہے، وہ انگریزی مصنفین ہیں۔

سوال:۔ اچھا مثلاً کون سے مصنف آپ کو پسند ہیں؟

یوسفی:۔ مثلاً مارک ٹوئین جو باوا آدم ہیں مزاح نگاری کے۔ سولنٹ، وہ اتنے HUMORIST نہیں کہ جتنے SATIRIST ہیں۔ اسٹیفن لی کاک۔ پھر جارج مکیش۔ اور ادھر مصنفین میں جیمز جوئس اور پھر انتھونی برجیس BURGESS ان سے میں اگر یہ لفظ بھی استعمال کیا جائے تو ان سے INFLUENCED ہوا ہوں اگر یہ چھاپا جائے کہ کس سے INFLUENCED ہوا تو ان کا نام لوں گا۔ ایک زمانے میں مجھ پر لارنس ڈرل LAURENCE DURRELL بھی بہت مسلط رہا ہے اور کبھی کبھی مجھے اس چیز سے فہ و ر مایوسی ہوتی ہے کہ لوگ میری تحریروں میں شفیق یا دوسی پر چھائیاں کبھی رشید احمد صدیقی کی یا کبھی پطرس کی ان کو دکھائی دیتی ہیں لیکن جو میرے اصل ماخذ ہیں ان کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں گئی۔

سوال:۔ مجھے اس فہرست میں جیمز جوئس کا نام سن کر قدرے تعجب ہو رہا ہے اس کا انداز تحریر آپ کے لکھنے کے انداز سے بہت مختلف ہے۔

یوسفی:۔ طنز نگار تو وہ نہیں ہے لیکن ایک تکنیک جو مونتاج کی ہے اور PASTICHE بھی اس میں ہے کہیں کہیں وہ تو اپنی جگہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے بڑا ناول نگار اور اس سے زیادہ...... کیا الفاظ میں استعمال کروں اس کے لیے...... قوت سے لکھنے والا مشکل سے ملے گا تو یہ ضروری نہیں کہ ہم متاثر کسی مزاح نگار سے ہی ہوں، قطعی نہیں۔ جہاں تک اس کے لکھنے کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک وہ انگریزی نثر میں حرفِ آخر ہے اور اگر کسی کو ناول لکھنا ہے تو جیمز جوئس راہ میں ایک پہاڑ بھی ہے اور مینارۂ نور بھی ہے۔ جیسا بھی آپ اس کو سمجھیں مگر وہ ہے اپنی جگہ۔ اس لحاظ سے جیمز جوئس سے خصوصاً پچھلے دس سال میں بہت زیادہ

متاثر ہوا ہوں۔ اور اب انگریزی میں جو نئے حروف [illegible]
ذکر ہوں، تو آپ تو جو کچھ بھی پڑھتے ہیں وہ ملا ہے مجھے بھی [illegible]
ایسا ہے کہ اب جتنے بھی لکھنے والے ہیں جو کامیاب ناول نگار ہیں [illegible]
میں ایک PUNGENT اور ASTRINGENT عنصر پائیں گے اور اس کے بغیر
ان کے ناول بکتے بھی نہیں چاہے جتنے ہی سنجیدہ لکھنے والے ہوں [illegible]
میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

سوال:۔ مغرب میں طنز اور مزاح کو ادب کی ایک الگ صنف سمجھنے کے بجائے ناول اور افسانے میں اس کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ ممکن ہے کہ مزاح نگاری میں کم لوگوں کے سامنے آنے کا جو آپ نے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہی ہو۔

یوسفی:۔ جی ہاں صحیح ہے۔ میں نے کہیں کہا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ہر چیز میں حل ہو جاتی ہیں۔ مذہب، الکحل اور مزاح۔ یہ آپ جس چیز کے ساتھ چاہیں بڑی آسانی سے انھیں ملا سکتے ہیں MIX UP کر سکتے ہیں۔ مختلف تجربے بڑے دلچسپ ہوتے رہے ہیں۔

سوال:۔ ان تینوں چیزوں میں اس کے علاوہ بھی کوئی مماثلت آپ کو نظر آتی ہے؟

یوسفی:۔ اور تو بظاہر نہیں ہے۔ ایک البتہ مماثلت آپ کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ "بے نشہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی" اور یہ اتنا اچھا مصرعہ اتنا جامع اور مکمل مصرعہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرعہ میں نے کبھی یاد کرنے کی کوشش کی اور نہ مجھے اس کا ملال کہ مجھے اس کا دوسرا مصرعہ یاد نہیں۔ بات غالب یہ کہتا ہے کہ آشوبِ آگہی جو ہے، عقل کا جو تحفہ ہے اور عقل جس آزمائش اور عذاب میں انسان کو ڈالتی ہے اس کے مقابلے کے لیے کسی نشے کی ضرورت ہے۔ اس آشوبِ آگہی کا مقابلہ بغیر کسی نشے کے ممکن نہیں۔ مسکراہٹ اس نشے کی مختلف شکلیں ہیں جس کو جو نشہ راس آئے اور موافق آئے

مثلاً اگر کسی کو تصوف واس آگیا، کسی کو بہروئن واس آگئی اور کسی نے مزاج میں پناہ لی کسی نے اگمل میں پناہ لی اور کسی نے جنس میں پناہ لی تو یہ تینوں چیزیں جو میں نے گنائیں آپ کو، مذہب، اگمل اور مزاج، یہ تینوں پناہ گاہ ضرور ہیں یعنی درماں کا غیر مساوی ضرور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مساوی ہیں لیکن اپنے طور پر تینوں SEDATIVES ہیں لیکن یہ سوال آؤٹ آف کورس پوچھا آپ نے ہم سے۔

سوال۔ آؤٹ آف کورس تو پوچھا لیکن اس کا جواب آپ نے ایسا بلیغ دیا کہ بائیڈ شاید بلکہ مزاج کے بارے میں آپ نے اتنی سنجیدگی کا اظہار کیا کہ اس سے مزاج کے بارے میں ایک مشن کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔

یوسفی۔ ایسا ہے کہ زندگی کو گوارا بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا آدمی ڈھونڈتا ہے۔ اگر یہ VALUE آج سے دو ہزار سال پہلے دریافت ہوگئی ہوتی تو بہت سے فلسفے وجود میں ہی نہ آتے۔ انسان کا مسئلہ دوسرے طریقے سے حل ہو جاتا لیکن اب ایسا ہے کہ زندگی کو قابل قبول اور گوارا بنانا اور خلقِ خدا کو بھی گوارا اور قابل قبول اپنے لیے بنانا۔ اس کے اپنے تمام تضادات کے باوجود یہ فریضہ ..... فریضہ اس معنی میں کہ خوش رہنا ہر انسان کا حق ہی نہیں فرض بھی ہے ...... اور جو شے بھی اس فریضے کی ادائیگی میں ممد و معاون ثابت ہو وہ نہایت مفید ہے۔ تو اس لحاظ سے مزاح زندگی کو زیادہ گوارا، زیادہ خوشگوار بنا دیتا ہے اور ممکن ہے کہ راہ میں پھول نہ کھلاتا ہو لیکن کانٹے بہت سے ہٹا دیتا ہے راستے سے۔ اب مذہب اس کو رضائے الٰہی میں راضی رہنا کہتا ہے دانتے اپنے طور پر کہتا ہے کہ :

IN HIS WILL ALONE, WE SHALL FIND PEACE.

مزاح دوسرے طریقے سے ایک سمجھوتا کرتا ہے زندگی کے ساتھ، کہ جو چیز ہمیں بظاہر ...... میں اس کے لیے انگریزی کے الفاظ استعمال کروں گا ....

IN CONGRUOUS لگتی ہے ANAMOLOUS لگتی ہے یا [illegible]
یا ABNORMAL لگتی ہے یا ABSURD لگتی ہے...... یہ [illegible]
جن کو مزاح قابلِ قبول بنا سکتا ہے اس لیے کہ یہی اس کے موضوعات ہیں اس
لحاظ سے مزاح زندگی کو سہنے کے لائق اور ENJOY کرنے کے لائق بناتا ہے
اور بھی چیزیں بناتی ہے ان میں یہ بھی ایک ہے۔

سوال :- بات کا رخ بدل گیا ورنہ میں آپ سے دوسری نوعیت کا سوال پوچھنے
والا تھا آپ نے فرمایا کہ آپ کی ان دونوں کتابوں کے درمیان کوئی بارہ
تیرہ سال کا وقفہ ہے۔ آپ کی اکثر تحریروں کی درمیانی مدت خاصی طویل
ہوتی ہے اس سے لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ اپنی تحریر کو سجانے اور سنوارنے
میں بہت وقت صرف کرتے ہیں۔ اس خیال کو تقویت آپ کے اسلوب کے انداز
سے بھی ہوتی ہے جس میں تزئین و آرائش کا خاصا دخل ہے۔ شاید اسی وجہ سے
لوگوں نے آپ پر نہ صرف زبان و بیان بلکہ خیال کے سلسلے میں بھی مشکل پسندی
کا الزام لگایا ہے۔ کسی بھی مزاح نگار کے لیے یہ الزام کس قدر عجیب ہے!

یوسفی :- دیکھیے جب ہم کسی چیز کو مشکل کہتے ہیں ادب میں تو اس کے دو مطلب ہو سکتے
ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو خیال یا جس جذبے کا اظہار منظور ہے وہ خود بہت ادق اور
پیچیدہ ہے یا اس کا پیرایۂ اظہار جو ہم نے اختیار کیا وہ گنجلک ہے۔ یہی دو
شکلیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک خیال کا تعلق ہے اس میں تو کوئی
ایسی بات مجھے نظر نہیں آتی کہ جس کو یہ کہا جائے کہ کوئی بہت ہی عمیق یا فلسفیانہ
بات میں نے کہہ دی جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہے، ایسا تو میں نہیں سمجھتا
اب رہا اس کا کہ الفاظ نا مانوس ہو سکتے ہیں، الفاظ ادق ہو سکتے ہیں تو اس میں
میری ایک گزارش ہے اور وہ یہ کہ ذہن میں یہ رکھیے کہ ہماری لغطیات یا VOCA-
BULARY - دن بدن تنگ سے تنگ تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آپ حالی کے زمانے
کی اردو اٹھا کر دیکھیں یا غالب کے زمانے کی دیکھیں، شبلی کی اردو دیکھیں [illegible]

آزادی کی اردو دیکھیں، پھر آپ اردو جدید عہد میں آجائیں رشید الوحیدی کی زبان دیکھیں۔ آپ اس میں بے شمار ایسے لفظ پائیں گے جن کو آج کا قاری مشکل پاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے طے کر رکھا ہے کہ میری جتنی لفظیات ہے اس کو میں بڑھاؤں گا نہیں۔ جتنا میں نے سیکھ لیا میٹرک پاس کر کے یا بی۔ اے پاس کر کے وہ کافی ہے۔ اور اس کے بعد میں اس میں کوئی اضافہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر کوئی مصنف ایسا لفظ استعمال کرتا ہے کہ جس سے میں ناآشنا ہوں تو وہ مصنف اپنا طرزِ اظہار بدلے، میں اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ایک فرق پیدا ہوا ہے کہ ڈکشنری دیکھنے کے لیے لوگ تیار نہیں ہوتے اب اس کا نتیجہ آپ کو ٹی وی پر بھی نظر آتا ہے، ریڈیو پر بھی، اخبارات میں بھی۔ کہ لکھنے والا ہر وقت ایک خوف زدہ آدمی کی حیثیت سے لکھتا ہے کہ میرے پڑھنے والے اس کو سمجھیں گے کہ نہیں۔ اگر میرے پڑھنے والے اس لفظ کو نہیں سمجھیں گے تو میں کوئی اور لفظ استعمال کر لوں۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ سکڑتا جاتا ہے اور جیسے ایک BASIC ENGLISH ایجاد ہو گئی تھی کہ دو سو الفاظ میں آپ اپنا مطلب ادا کر دیتے تھے تو اگر ادب اسی کا نام ہے تو ہم بھی دھیرے دھیرے ان دو سو الفاظ کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ غالباً سکڑتے سکڑتے ایک بنیادی اردو بن جائے گی۔ اردو یا کوئی اور زبان، کیونکہ یہ اب سب زبانوں کا مسئلہ ہے ایک اردو ہی کا نہیں۔ اس کے مقابلے میں آپ یہ دیکھیں کہ جب شیکسپیئر نے لکھا آج کوئی چار سو کے قریب برس ہونے کو آئے تو شیکسپیئر کا جو AUDIENCE تھا اس کا پچانوے فی صد حصہ جاہل اور ان پڑھ تھا لیکن شیکسپیئر نے جب لکھا اور ان ہی لوگوں کے لیے لکھا لیکن اس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ جو یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں لوگ اسے سمجھیں گے یا نہیں۔ اس لیے شیکسپیئر کی لفظیات آج بھی میرے خیال میں سب سے وسیع اور سب سے متنوع ہے۔ میرے خیال میں کسی اور انگریزی ادیب یا شاعر نے اتنی کثیر تعداد میں الفاظ استعمال نہیں کیے

ہمارے ہاں ایسی وسیع لفظیات نظیر اکبر آبادی کی تھی ہے [illegible]
کہ جب شیکسپیئر نے لکھا تو اس کو ایسی کوئی INHIBITION نہیں تھی کہ
لفظ میں نے لکھ دیا اور اس کو نہیں سمجھیں گے تو پھر کیا ہو گا [illegible]
نہیں سمجھیں گے یا لغت نہیں ہے گا۔ آپ دیکھیں کہ اس نے ایک جگہ لکھا ہے
INCARNADINE SEAS یہ لفظ انگریزی میں میں نے ایک جگہ پڑھا کہ
صرف ایک اور مصنف نے ایک جگہ استعمال کیا، اور کسی مصنف کی ہمت
نہیں ہوئی کہ اس لفظ کو استعمال کرے۔ لیکن شیکسپیئر نے جس جگہ استعمال کیا
ہے آپ کوئی دوسرا لفظ وہاں استعمال کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی جگہ وہ مثال
کے طور پر CRIMSON بھی کہہ سکتا تھا مگر اس نے نہیں کیا۔ اس نے
INCARNADINE کا لفظ استعمال کیا۔ اس کی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی سمجھے گا
یا نہیں سمجھے گا۔ آخر کو سمجھا لوگوں نے۔ تو مصنف اپنی سطح بھی آپ متعین کرتا
ہے۔ ہم یہ کیوں سمجھ لیں کہ ہمارے پڑھنے والے نچلی سطح رکھتے ہیں یعنی ہیں
نااہل ہیں، ان کی فہم ناقص ہے لہٰذا ہم بات کو بہت آسان کر کے اس طرح
سے کہیں کہ جیسے غبی لوگوں کو یا SUB-NORMALS کو پڑھایا جاتا ہے۔ ہم
ان کو اپنی سطح کو گرا دیں۔ یہ ایک بنیادی فرق یاد رکھنا چاہیے۔ اچھا اب اس
کو آپ ذہن میں رکھیں۔ مثال کے طور پر میں فارسی بالکل نہیں جانتا کم از کم
کو اس بات پر یقین آتا ہے کہ میں فارسی سے بالکل نابلد ہوں۔ تو فارسی عربی
کے الفاظ تو میرے ہاں یوں بھی کم آتے ہیں تو ڈکشنری البتہ ایسا ہے کہ کوئی
دن میری زندگی میں ایسا نہیں گزرا سوائے بیماری کے، جب ڈکشنری [illegible]
کم از کم دس مرتبہ نہیں دیکھی ہو۔ اور اگر کبھی میں کسی ویران جزیرے میں اپنے
آپ کو پاؤں SHIP WRECK کی حالت میں، تو میں اپنے ساتھ
سب سے پہلے ڈکشنری لے جاؤں گا اگر مجھے انتخاب کی سہولت دی جائے
سب سے پہلے ڈکشنری ہوگی، دوسرا کلام میر اور اس کے ساتھ [illegible]

واقعی یہ بہت FASCINATE کرتی ہے اور میں ان لوگوں کو بڑا بدقسمت سمجھتا ہوں جو ڈکشنری نہیں دیکھتے۔ آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ اجداد ہمارے جو اپنے زمانے کے بڑے اچھے لکھنے والے تھے اور آج بھی ان کا مقام بہت بلند ہے گو کہ ان کے سماجی نظریات قابلِ قبول بالکل نہیں ہیں لیکن قطع نظر اس سے۔ تو ان کا قاعدہ یہ ایک تھا کہ دن میں وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سیکھتے تھے۔ جب دن ختم ہوتا تھا اور رات کو وہ بیٹھتے تھے تو وہ اس پر غور کرتے تھے کہ آج میں نے کون سی نئی بات سیکھی۔ اگر اس دن انہیں ایسی کوئی نئی بات نظر نہیں آتی تھی تو پھر وہ یہ کرتے تھے کہ ڈکشنری اٹھا لاتے تھے اور اس میں سے کوئی نیا لفظ سیکھ لیتے تھے۔ تو اس میں مجھے بڑی دانائی اور حکمت نظر آتی ہے۔ کہ اگر کچھ اور نہیں سیکھا تو ایک تو سیکھیں اس لیے کہ لفظ، خالی لفظ نہیں ہے، لفظ تو پورا ایک براعظم ہے۔ براعظم ان معنوں میں کہ اس کی اپنی ایک CLIMATE ہے، اس کا اپنا ایک درجۂ حرارت ہے۔ میرا دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ

THERE IS NO SUCH THING AS SYNONYMS. WHAT WE CALL AS SYNONYMS ARE ENTIRELY DIFFERENT WORDS.

ایک لفظ ایک معنی میں صرف ایک ہی ملے گا آپ کو۔ اس معنی کا کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوگا۔ یہ ایک نگینہ سا ہے جو انگوٹھی میں ایک خاص سائز کا اور خاص شکل کا ہی لگے گا۔ دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں آئے گا۔ اگر دوسرا لفظ آتا ہے تو اس کے کچھ اور SHADES ہوں گے۔ مثلاً میں یہ کہتا ہوں کہ اب اس کھکھیڑ میں کون پڑے، اس بکھیڑے میں کون پڑے، اس مشکل میں کون پڑے یا اس عذاب میں کون پڑے۔ جملوں میں تو کھکھیڑ ہی کہوں گا۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب کھکھیڑ آج کل مانوس نہیں ہے تو میں معذرت کر لوں گا کہ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ کچھ ایسا ہے ہر لفظ کے ساتھ وہ

کسی بھی زبان کا لفظ ہو، ہر زبان میں ایک مفہوم کا لفظ ایک ہی
اور جس کو ہم متبادل سمجھتے ہیں اور مترادف سمجھتے ہیں وہ کوئی دوسری
ہے جو لفظوں کے مزاج داں ہیں جیسے انشا جی تھے۔ انشا جی لفظوں کے بڑے
مزاج داں تھے۔ اور انشا جی کے جہاں اور بڑے کارنامے ہیں، میں نے تو ایک
زمانے میں یہ کہا تھا اور ایک زمانے میں کیا، میں تو اب بھی اس پر قائم ہوں
جو میں نے کہا تھا کہ انشا جی ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ اس پر
کچھ دوست آزردہ بھی ہوئے اور ایک آدھ تحریریں پریس میں بھی آئیں جس
میں میری چھاڑ کی گئی۔ حالانکہ میری چھاڑ کرنے سے انشا جی کی عظمت میں
کوئی فرق نہیں آتا۔ مجھے آپ نالائق ثابت کر کے انشا جی کی عظمت میں کوئی
کمی نہیں لا سکتے۔ اس کے باوجود آپ دیکھیے کہ جس وقت انشا جی کے سامنے
کوئی لفظ آتا ہے تو وہ جھجکتے نہیں ہیں۔ اس معنی میں کہ وہ یہ نہیں سوچتے
کہ یہ لفظ بڑا پرانا ہے، یہ لفظ متروک ہو چکا ہے، یہ لفظ آج کل نہیں سمجھیں گے
وہ اسے بلا تکان اور بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان
کا ایک کارنامہ ہے کہ انھوں نے بعض لفظوں کو بالکل نئی زندگی دی ہے تو
مشکل پسندی کے آپ کے سوال کا جواب تو مل گیا۔

سوال: مشکل پسندی کے ساتھ ساتھ نقاد حضرات آپ کے اسلوب میں دقّت
پسندی کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس میں صناعی بہت ہے، اس میں آورد کا
احساس ہوتا ہے اور یہ کہ اس میں SPONTANEITY نہیں ہے۔ تو کیا آپ
اس اعتراض سے متفق ہیں؟

یوسفی: دیکھیے دوسروں کا کیا تاثر ہے تو اس کے بارے میں تو میں صرف یہی
کہوں گا کہ ممکن ہے وہ تاثر درست ہو لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے
ہاں جس چیز کو SPONTANEITY کہا جاتا ہے، وہ ہم نے شعر سے
ہمارے ہاں اس بات پر بڑا فخر کیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب

لکھتے ہیں اور جو لکھ دیتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔ یہ بات بڑی فخریہ بیان کی جاتی ہے اور بڑی تعریف کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہی بات آپ انگریزی میں لکھ دیں تو اس سے بڑا CONDEMNATION اس شخص کا نہیں ہو سکتا کہ تخلیقی کاہل آدمی ہے وہ۔ جیسے ہیمنگ وے ہے۔ ہیمنگ وے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاں آمد ہی آمد ہے۔ اس سے زیادہ سلیس، سادہ انگریزی اور مفرد الفاظ کسی نے استعمال نہیں کیے بلکہ جو مکالمہ اس نے لکھا اس کی مثال اس سے پہلے کوئی نہیں ملتی بے ساختگی کی۔ اور اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ صاحب اس نے تو زبان کو، جو اس کا BAREST MINIMUM ہو سکتا ہے اس پر لے آیا۔ درست اپنی جگہ۔ اس کو نوبل پرائز جس کتاب کے بعد ملا یعنی OLD MAN AND THE SEA یہ کتاب جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی سوا سو صفحے کی کتاب ہے اس وقت تک اس کتاب کے نوے مسودے مل چکے ہیں۔ وہ تو خیر ٹائپ میں تھے لیکن اس وقت تک نوے تصحیح شدہ ڈرافٹ اس کے مل چکے ہیں۔ یہ اس شخص کا ذکر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس سے زیادہ SPONTANEOUS کوئی اور نہیں تھا۔ ہر فن ایک ریاض چاہتا ہے۔ اگر اس میں آورد معلوم ہوتی ہے تو وہ میری محنت کا قصور نہیں ہے میرے فن کی خامی ہے۔ تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے زیادہ محنت کی اس لیے خراب ہو گیا بلکہ یہ ہے کہ میرے فن میں خامی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ خیال کر لینا کہ بعض لکھنے والے ایسے ہیں جو قلم زد نہیں کرتے یہ بذاتہ کوئی خوبی کی بات قطعی نہیں۔ اور اس کے فن کی اچھائی یا برائی سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ دیکھیے کہ پروست ایک ہی ناول پر پندرہ سال کام کرتا رہا [illegible] مرنے سے ایک دن پہلے تک بھی اس کی تصحیح کر رہا تھا۔ اب اگر اس میں کوئی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ فنی خامی الگ چیز ہے لیکن اس پر ہم اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ [illegible] نے اتنا وقت کیوں لگایا اس کے لکھنے میں۔ اب جہاں تک میرے

بارہ سال کا تعلق ہے تو اس عرصے میں کچھ پیشہ ورانہ مصروفیات بھی
آگئیں۔ میں یہاں سے لندن چلا گیا، پھر وہاں میری بیماری کا سلسلہ شروع
ہوا۔ دل کی بیماری اور السر وغیرہ۔ اب ایک اور آپریشن میرا ہونے والا ہے
یہ آپریشن حال ہی میں انتڑیوں کا ہوا تھا۔ آپ سمجھ لیجیے نہیں، صلاحیت ذہنی
ختم ہو جاتی ہے۔ کمر درد کی اس تکلیف کی وجہ سے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ بیٹھ
نہیں سکتا۔ پچھلے سات آٹھ سال سے یہ تکلیف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں
آپ کو بتا دوں کہ میں بچپن ہی سے فرش پر بیٹھ کر اور یہاں گھٹنے پر رکھ کر جیسے
کاتب اور منشی اور پرانے زمانے کے بڑے لکھا کرتے تھے، اردو میں اس طرح
سے لکھتا ہوں، انگریزی میز کرسی پر بیٹھ کر لکھتا ہوں، انگریزی میں فرش پہ
بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا اور اردو میز کرسی پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا۔ تو میں ان الجھنوں
میں گرفتار رہا۔ لیکن اس کے باوجود جیسا میں نے آپ کو بتایا اس وقت ایک
ساڑھے چار سو صفحے کی کتاب تیار ہے، اتنی ہی ضخامت کی کتاب نامکمل حالت
میں وہاں پڑی ہوئی ہے۔ تو بارہ سال میں نو سو صفحے کوئی بڑی بات نہیں
ہے۔ اس لیے کہ مزاح میں آپ بتائیے کہ اتنی مقدار میں کتنے اور لوگوں نے
لکھا ہے۔ اب تک بارہ سو صفحے بنتے ہیں میرے۔ اس میں اگر اللہ نے اور زندگی
دی تو ممکن ہے اور اضافہ ہو جائے۔

سوال:۔ ابھی آپ نے اپنی مزاح نگاری کے ساتھ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کا
ذکر کیا، آپ کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ جس سے ہم سب واقف ہیں کہ آپ
ہمارے سرکردہ مزاح نگار ہی نہیں صاحب اسلوب نثر نگار بھی ہیں، دوسری طرف
آپ مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز اور متمکن رہے ہیں جن کا ادب سے کوئی
واسطہ نہیں۔ تو ایک ادیب اور ایک اہم افسر، آپ کی جو دو حیثیتیں ہیں آپ ان
میں کس طرح تفریق کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خاصا ذاتی سوال ہے!

یوسفی:۔ صحیح ہے مگر اس سے مجھے کبھی کوئی الجھن نہیں ہوئی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ

تنہائی ہماری اردو میں خاص طور سے جو آئی ہے وہ ہمیشہ OUTSIDERS ہوتے
ہیں تو وہ لوگ جن کا پیشہ یا اوڑھنا بچھونا ادب یا صحافت ہے ان کے ہاں
وہ تنہائی جس کی آپ توقع رکھتے ہیں بعض اوقات نہیں ملتی۔ لکھنا پڑھنا
ہمارے لیے منکوحہ کی نہیں محبوبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کبھی اس میں
کوئی الجھن ہمیں محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہمیں اچھا لگتا ہے کہ دن بھر کی مصروفیات
کے بعد ایک بالکل دوسری دنیا میں آدمی داخل ہو۔ اچھا آپ نے اسلوب کے
PERFECTION کے بارے میں جو سوال کیا تھا اس پر ایک دلچسپ قصہ
سناؤں آپ کو۔ وہ قصہ یہ ہے جناب کہ ہم کبھی کسی کی فرمائش پر لکھتے نہیں ہیں
بہت پہلے کا ذکر ہے یہ کوئی ۱۹۵۵ء کے آس پاس کہ جب ہمیں ساڑھے چار سو
یا پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی اور ہم نے لکھنا شروع کیا تھا۔ ہمارے دوست حنیف
رامے 'سویرا' کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ انھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ فلاں موضوع
پر آپ لکھ دیجیے۔ ہم نے لکھ دیا۔ اب جب اس کے چھپنے کے دن آئے تو ہمیں احساس
ہوا کہ ہم نے نہایت لغو چیز لکھی ہے بالکل لغو اور ہم اس کو FACE نہیں کر سکتے
تھے۔ اس زمانے میں ہم مشتاق احمد کے نام سے لکھتے تھے۔ اس خیال سے کہ لوگ
ہمیں پہچان نہ سکیں اس لیے کہ بینک میں لکھنے پڑھنے والے لوگوں کو بڑی حقارت
کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ ان پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اور ایک صاحب نے بڑی اچھی
بات ہم سے کہی۔ کہنے لگے کہ دیکھیے برا نہ مانیے گا۔ کیا فرمائیں۔ کہنے لگے کہ اگر کوئی
شخص آپ سے یہ کہے کہ وہ ایک ماہر امراض چشم ہے، بہت اچھا اور شاعر بھی ہے تو
آپ آنکھیں اس سے کروائیں گے یا اس سے کروائیں گے جو صرف آنکھوں کا سرجن
ہے۔ تو اسی بنا پر وہ صاحب اس بینک میں پیسہ نہیں رکھتے تھے جس میں، میں
ملازم تھا۔ وہ قصہ یہ ہوا کہ سویرا کے رسالے میں وہ مضمون چھپا۔ پنجاب بک ڈپو والے
ایجنٹ تھے یہاں اس کے۔ میں ان سے روز ٹیلی فون پر پوچھتا تھا کہ رسالہ آیا
کہ نہیں آیا۔ ایک دن انھوں نے کہا آ گیا ہے۔ میں نے پوچھا کتنی کاپیاں ہیں انھوں نے

کہا آپ کو کتنی درکار ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، آپ کے پاس کتنی آئی ہیں؟ انھوں نے کہا کہ صاحب سو آئی ہیں۔ تو میں گیا اسی وقت میری تنخواہ اس وقت کل ملا کٹا کر ساڑھے چار سو روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ تین روپے کی سویرا کی ایک کاپی تھی۔ میں سو کاپی ان کی تین سو روپے میں لے آیا اور لا کر میں نے بینک میں جو چپراسی تھا اس سے کہا کہ میاں اس کو SHREDDING MACHINE میں سب ڈال دو۔ اس کے بعد جیسے میں اب آپ کو فخریہ قصہ سنا رہا ہوں کہ صاحب میں تو اتنا نفاست پسند ہوں کہ میں نے یہ کیا تو میرا خیال تھا کہ اس کے بعد کراچی میں تو میری بدنامی نہیں ہوگی۔ تو جیسے اس وقت آپ کو فخریہ قصہ سنا رہا ہوں تو میں یہ قصہ اس کے چار پانچ دن بعد ایک صاحب کو سنانے لگا۔ ان کا نام میں آپ کو بتا دیتا ہوں مگر آپ ریکارڈ پر نہ لائیے گا۔ تو میں نے ان سے کہا کہ بھئی ہم نے تو یہ کیا، ہماری غیرت گوارا نہ کر سکی اور ہم نے یہ کر دیا تو وہ صاحب ایک دم بپھر گئے یعنی نہایت مؤدب اور نہایت بااخلاق آدمی تھے۔ کہنے لگے کہ یہ آپ نے کیا کیا، اس سے بڑی تو کوئی بدذوقی نہیں ہو سکتی۔ یہ کام تو پہلے ایک دفعہ ہوا تھا جب اسکندریہ میں لوگوں نے کتب خانہ جلا دیا تھا۔ وہ الزام ہے مسلمانوں پر، مگر آپ نے اُس سے بدتر کام کیا۔ میں نے کہا بات کیا ہوئی۔ پتہ یہ چلا کہ "سویرا" کے اِس شمارے میں اُن کی پہلی غزل چھپی تھی۔ یہ میں نے اس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی غزل بھی غارت ہو گئی میرا مقصد ان کی غزل پر پانی پھیرنا نہیں تھا بلکہ اپنی تحریر کے بارے میں ایک معیار کی پابندی تھی میں نے اس معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

(ڈاکٹر مشفق خواجہ اور ذوالفقار مصطفےٰ
کے شکریے کے ساتھ)

مشتاق احمد یوسفی

ضیا محی الدین اور لفظ کا مزاج

نوٹ: اردو مرکز لندن نے ۶ فروری ۱۹۹ء کو اسکول آف افریکن اینڈ اورینٹل اسٹڈیز میں ضیا محی الدین کے ساتھ ایک شام منائی تھی۔ اس میں یہ مضمون بطور خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

ابھی ہم سب نے غالبؔ کی عبارت کا جادو اور ضیا محی الدین کی ادا سنجی اور اشارت شناسی کا کمال دیکھا۔ میں تو ابھی اس سحر زدہ حصار سے نہیں نکلا جہاں انھوں نے لاکر چھوڑا تھا۔ احترام و تحسین میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ حسن سماعت پر حرف ستائش بھی بار گزرتا ہے۔

ضیا محی الدین بنیادی طور پر اسٹیج کے آدمی ہیں۔ لہٰذا اسی کے حوالے سے مختصر سی گفتگو کی ابتدا کروں گا۔

آپ نے لندن کے تھیٹروں میں دیکھا ہوگا کہ شو سے پہلے آرٹ پیپر پر چھپے ہوئے کتابچے قیمتاً ملتے ہیں جنھیں خریدنا تھیٹر دیکھنے کے ان لکھے آداب میں داخل ہے۔ ان کتابچوں میں کاسٹ کی تصویریں اور مفصل تعارف ہوتا ہے۔ جب آپ بڑے شوق سے کتابچہ خرید کر نیم تاریک ہال میں داخل ہوتے ہیں اور اس سیٹ کی جانب بڑھتے ہیں جس پر گائیڈ اپنی ننھی سی ٹارچ کی ایسی روشنی ڈالتی ہے

فنکاروں کے بیان سے بھی زیادہ صحیح اور بہت سے بھی زیادہ دلکش
ہوتی ہے تو کتابچہ کی تصویریں اور حروف تو دور کنار آپ کو [illegible]
تی جس کی گود میں آپ اوورکوٹ، چھتری، بستوں کے پیکٹ اور کتابچے سمیت
بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پایانِ کار، جوانوں کی ایکروبیٹکس جیسی حرکتوں اور [illegible]
ہوں کی گونجتی آوازوں کے بعد آپ کو اپنی مقسوم یعنی کرسی مل جاتی ہے اور آ[illegible]
و دکو اس میں اس طرح فٹ کر لیتے ہیں جیسے یہاں کی خواتین ۱۵ نمبر کے شوز
۱۰ نمبر کے کوزے میں اس طرح بند کر لیتی ہیں کہ بقول نظیر اکبر آبادی:

آگا بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور ووں بھی واہ وا ہے

آپ کا بقیہ وقت کتابچہ پڑھنے کے بجائے دوسروں کو اپنی گود میں بیٹھنے
بار رکھنے میں گزرتا ہے۔ اتنے میں تیسری گھنٹی بجتی ہے اور ہال میں ایسا سناٹا
طاری ہوتا ہے کہ دو چار لمحے تو آپ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ بینائی بتدریج
زائل ہو رہی ہے یا اندھیرے میں کوئی واردات ہونے والی ہے۔ اس کے بعد
سٹیج پر یکلخت روشنی ہوتی ہے۔ ہال میں ایسا سناٹا طاری ہوتا ہے کہ آپ
اوورکوٹ کے اندر بھی چلغوزہ چھیلیں تو آخری قطار والے تک کی آواز صاف سنائی
دے۔ کھیل ختم ہوتا ہے، آپ جملہ ناظرین کے ساتھ کھڑے ہو کر اداکاری کی داد دیتے
ہیں۔ پردہ اٹھتا اور گرتا رہتا ہے۔ تالیوں سے ہاتھ جھنجھنانے لگتے ہیں مگر یہی چاہتا
ہے کہ یہ سامنے یونہی کھڑے رہیں کہ انھوں نے تھکے ہاروں کا دل شاد کیا اور ایک
جہانِ دیگر پہنچا دیا۔ اسی عالم میں آپ اس تعارفی کتابچے کو نزدیک ترین ڈسٹ
بن میں پھینک دیتے ہیں کہ فن کار تک پہنچنے کے لیے اب آپ کسی تعارف [illegible]
کے محتاج نہیں۔

ابھی آپ نے ایک نہایت ممتاز اور صاحبِ طرز اداکار کے فن کا اعجاز اور کمال
بچشم و بگوش خود دیکھا اور سنا اور اب میرے توضیحی اور توصیفی کلمات کی حیثیت

ہی کتابچہ سے زیادہ نہیں جس کا اشتہار آپ بار بار دیکھ چکے ہیں۔

ادھر چند برسوں سے ضیا محی الدین صاحب —— یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ میں ان کو دوسری اور آخری مرتبہ صاحب کہہ رہا ہوں کسی نامور آرٹسٹ یا ادیب کو صاحب کہنا صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ اول وہ قضائے الٰہی یا تقاضائے پبلک سے وفات پا چکا ہو، یا اس سے بھی بدتر انجام ہوا ہو یعنی وہ کسی بینک میں ایسے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جہاں بہ یک وقت سود اور قوم کا غم کھانے اور اس کا حساب رکھنے کے وافر مواقع ہوں۔

تو عرض یہ کرنے چلا تھا کہ ادھر چند برسوں سے ضیا محی الدین نے —— یہاں پھر یہ واضح کرتا چلوں کہ انہیں فقط ضیا کہتے ہوئے بھی میرا قلم بوجوہ کانپتا ہے اس کی دوسری وجہ یہ کہ انہیں اس نام سے پکارنے کا حق یا تو ان کی بیگم کو پہنچتا ہے یا ان کے ہم عمر بے تکلف دوستوں کو۔ اب اگر میں انہیں اپنا ہم عمر بتاؤں تو برا تو کچھ نہیں گھٹے گا ان کے ابھی کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔

دوسری وجہ صاحب کہہ کر پکارنے کی وہی ہے جو آپ کے ذہن میں آئی۔ میں نے دوسرا پیراگراف قبل ازیں، تمام کچھ اس طرح شروع کیا تھا کہ ادھر چند برسوں سے ضیا محی الدین ہر سال مختلف تصانیف سے چیدہ چیدہ اقتباسات پڑھتے ہیں اور ڈھیروں داد وصول کرتے ہیں۔ یہ ارمغانِ فرنگ وطنِ عزیز بھی لے کر آتے ہیں بحمد اللہ اب اس تقریب دل پذیر نے سالانہ جشن کی سی صورت اختیار کرلی ہے ان کی پڑھت READING اور RECITATION کا یہی مرادف ذہن میں آتا ہے۔ جی چاہے تو بلند خوانی یا خواندگی کہیے) کے کیسٹ ہماری ان کتابوں سے زیادہ بکتے ہیں جن کے اقتباسات ان میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر و اعتراف اس لیے بھی واجب ہو گیا کہ وہ اس عاجز کو بھی نوازتے رہتے ہیں۔ زرگزشت سے ایک اقتباس سن کر ہمارے ہمدم و ہمراز، مرزا عبدالودود بیگ ہماری پیٹھ

چیتھ پاکر کہنے لگے کہ واللہ ضیاء الدین نے تحریر میں جان ڈال دی ہے
ان کے کمپلی منٹ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے کہا اور گمان گزرا تو ہم نے کہا
مگر مرزا! جان تو مُردے میں ڈالی جاتی ہے!
بولے "اور کیا ضیاء الدین نے یہی تو کیا ہے۔ بےجان بولتا ہے مسیحا کے
ہاتھ میں:

یہ بات ہماری حد تک تو درست ہے لیکن رتن ناتھ سرشار، چودھری محمد علی
ردولوی، فیض، ن۔م۔ راشد اور پطرس کی تصانیف سے جو شہ پارے انھوں نے
پڑھے ہیں وہ جہاں لکھنے والے کے کمال فن کا نمونہ ہیں وہاں پڑھنے اور پیش کرنے
والے کے حسنِ انتخاب، سخن فہمی، نکتہ سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت، لفظ کا مزاج اور
لہجہ اور لہجے کا ٹھاٹھ پہچاننے کی صلاحیت کا صحیح معنوں میں منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ
جملے کی بُنت اور بناوٹ ہی پر توجہ نہیں دیتے بلکہ لفظ کے بناؤ اور بھاؤ سے بھی
اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی آواز اور انداز اظہار کی RANGE بہت وسیع ہے۔ وہ
صرف تلخی، ترشی اور شیرینی کی مختلف سطحوں اور نزاکتوں سے واقف ہیں بلکہ آواز
میں اپنے لہجے کا ذائقہ بھی شامل کرنا جانتے ہیں۔ ایک کامیاب اور نامور اداکار کی طرح
کردار کی زبان، اُن کی زبان اور لہجہ اُن کا اپنا لہجہ بن جاتا ہے۔ تمام چہرے ہیں میرے
چہرے۔ ہر ایک لہجہ ہے میرا لہجہ۔

فارسی کی ایک مثل ہے "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" یعنی مصنف
ہی تصنیف کو بہتر پڑھ سکتا ہے۔ مگر قیاس کہتا ہے کہ یہ مثل غالباً ایسے زمانے میں
وضع کی گئی جو ہمارے زمانے سے ملتا جلتا تھا۔ ہمارا مطلب ہے باہمی رشک و حسد
معاصرانہ چشمک اور چپقلش کے لحاظ سے۔ اپنے ہم عصروں کا کلام بگاڑ کر پڑھنا
صدی کی ایجاد نہیں ہے۔ سدا سے یہی ہوتا آیا ہے۔

بعض مصنفوں کی زبان سے ان کی تصنیف اور کلام سننے کے بعد ہم اس نتیجے
پر پہنچے ہیں کہ یہ مثل درست نہیں۔ تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ مصنف کی

سے اس کی تحریر سننا پڑتا ہے کہ ان کی غلطیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ان کی جگہ غلطی کی غلطیاں در آتی ہیں۔ جیسی خوبصورت اور شگفتہ نثر قدرت اللہ شہاب مرحوم نے بھی ویسی کم لکھنے والوں کو نصیب ہوگی لیکن جب وہ اپنا لکھا آپ پڑھتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ ہکلاتے ہیں۔ سننے والوں کا بے اختیاری چاہتا تھا کہ ان کے ہاتھ سے مسودہ چھین کر خود پڑھ کر سنائیں کہ ع

دیکھیں اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

اپنی تحریر اور کلام کو خراب کرنے کا اپنا اپنا ناقابلِ تقلید انداز ہوتا ہے۔

ایک شاعر تھے جو مصرع کا پہلا لفظ پڑھنے سے پہلے ہی ہاتھ چلانا شروع کر دیتے تھے۔ پہلے دایاں چلاتے وہ تھک جاتا تو پھر بائیں سے نرت بھاؤ بتاتے۔ شعر پڑھتے وقت جوش صاحب کی طرح دونوں ہاتھ بیک وقت نہیں چلاتے تھے۔ اس خوف سے کہ اگر دونوں تھک گئے تو کاہے سے مطلب ادا کریں گے۔

جوش صاحب بھی محفلوں میں کلام سنانے سے پہلے بعض اوقات پوچھتے تھے موٹا مال پیش کروں یا باریک۔ ظاہر ہے لوگ باریک ہی کی فرمائش کرتے تھے۔ اثر یہ کہ ان کے باریک مال میں بھی پہاڑ لڑھکتے تھے۔ ۸۰ سال کے سن میں بھی آواز میں بجلیاں کڑکتی تھیں۔ مقتضائے حال کچھ بھی ہو، بات کتنی ہی نرم کیوں نہ ہو، لہجے کی گھن گرج وہی رہتی تھی۔ شاعری میں وصل کی فرمائش بھی اسی طور کرتے تھے جیسے کسی نادہند قرضدار سے ڈوبی ہوئی رقم ڈانٹ ڈپٹ کر کے وصول کرنا چاہتے ہیں اور اسے ڈانٹنے میں جو مزہ مل رہا ہے وہ وصولی میں نہیں۔ اس کے برعکس اختر شیرانی اس طرح طلب کرتے ہیں جیسے کوئی بچہ GOOD CONDUCT کے صلے میں چاکلیٹ مانگ رہا ہو۔

جدید شاعری کے مزاج اور رجحانات سے جیسی اور جتنی واقفیت ہمارے یار طرحدار ساقی فاروقی کو ہے ویسی اور اتنی بلکہ اس کی آدھی بھی ہمیں نصیب ہوتی تو محض اسی بنا پر پندرہ سال پہلے بینک سے نکال دیے گئے ہوتے۔

قدروں نے فرسودہ کہتے سے ہچا ہو [illegible]

جو نہایت جرأت مندانہ اور خوبصورت تجربے ہیں وہ بھی انہیں کی [illegible]

عنایت ہیں۔ انھوں نے اپنا کلام پڑھنے کا بھی ایک منفرد اور نہایت [illegible]

ایجاد کیا ہے۔ اس ضمن میں ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ اگر کوئی اور شخص

ان کا کلام اسی طرح پڑھ کر انھیں سنا دے تو وہ قطع تکمیل سے پہلے ہی [illegible]

کا سر کاٹ کر اور اس پر اپنی مکھوں کی مالا لپیٹ کر اس کی بیوہ کی ہتھیلی پر رکھ

دیں گے۔ ع جلتے بجھے کشمکش قید سے آزاد کیا

فیض صاحب کی نظمیں جس طرح ڈوب کر ضیا محی الدین نے پڑھی ہیں وہ نہ صرف ان کی عقیدت بلکہ ان کی نکتہ شناسی اور سخن فہمی کا ثبوت ہے جو کہ الحمد للہ EMI نے کیسٹ کی شکل میں محفوظ کر لیا ہے۔ فیض صاحب کی شخصیت میں ایسی موہنی اور ان کے لہجے میں اتنا خلوص اور گہرا پن تھا اور ہم اس سے اس درجہ مانوس ہو گئے تھے کہ ہمیں یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اشعار اس طرح پڑھتے تھے جیسے کسی جانی دشمن کا کلام ہو۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ دو تین لفظوں کے بعد وہ ایک سسکی سی لے کر اپنے کلام میں ایک لذیذ سا سکتہ پیدا کرتے۔ سگریٹ کے رسیا تھے۔ وہ دستیاب نہ ہو تو لفظ کا کش ایسا لگاتے کہ سننے والے دم بخود ہو جاتے۔ چند سال پہلے اسی ہال میں میں نے عرض کیا تھا کہ

"یہ فیض کے کلام کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنے کلام کو بگاڑ کر پڑھنے کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کے چاہنے والوں کو یہ انداز ایسا بھایا کہ آخر کو یہی معیار ٹھہرا۔ ان کا اکھڑا اکھڑا انداز دیکھتے دیکھتے ایک فیشن بن گیا۔ فیض صاحب" چین اسموکر تھے یعنی ہر سطر پہ سگریٹ سے سگریٹ ہی نہیں قالین بھی سلگاتے رہتے تھے مصرع اور فقرے کی سانس ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ وقفے وقفے سے ایک گھائل سی سسکی بھی سنائی دیتی اور سننے والوں کا پیار سمیٹ

حسن میں ملاوٹ نہیں گھورتا چلا جاتا۔ کسی کہنے والے نے انداز لفظ
کی بابت کرنل صاحب نے دراصل اپنے نقادوں کا خلاصہ مزید
خواب کر کے کہا ہے تحت اللفظ پڑھنے کی یہ طرز ایجاد کی ہے:

بالواقعات لفظ کے مفہوم کے جملہ امکانات کا اندازہ COLD PRINT (یعنی مطبوعہ) سے نہیں ہوتا۔ لفظ کے مختلف شیڈز اور تہیں اس وقت تک نہیں کھلتیں جب تک وہ زبان سے ادا نہ کیا جائے۔ سیاق و سباق اور وہ لہجہ جو اسے ادا کرتے وقت اختیار کیا جائے، لفظ کو ایک بالکل نیا مفہوم اور فقرے کو ایک اور ہی تیور اور کاٹ بخشتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ مفہوم بعینہ وہی ہو جو لکھنے والے کا مقصود تھا۔ ہر بڑے ایکٹر نے شیکسپیر کے الفاظ کو اپنے طور پر سمجھا اور ہر کردار کو اپنا جامہ پہنایا ہے۔ لفظ تو وہی رہتے ہیں مگر معنی و مفہوم میں توسیع ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میکبتھ کا ایک انتہائی سادہ جملہ لیجیے:

TOMORROW, AND TOMORROW, AND TOMORROW

یا ہملٹ کی مشہور لائن:

TO BE OR NOT TO BE THAT IS THE QUESTION

یہ جملہ پانچ الفاظ پر مشتمل ہے اور دوسرا دس پر۔ یہاں کوئی لفظ ادق نہیں کوئی جھلک یا پیچ نہیں۔ لیکن ہر بڑے ایکٹر نے، خواہ وہ GARRICK ہو، LAURENCE OLIVIER یا JOHN GIELGUD ان جملوں کو بالکل مختلف انداز سے ادا کیا۔ ایکٹر جب لفظ کی کوئی نئی تہہ یا معنی کا کوئی نازک سا شیڈ دریافت کرتا ہے تو وہ بھی تخلیق کے عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ پھر پھول میں پھول پہننے والے کی خوشبو بس جاتی ہے۔

تحت اللفظ کی روایت ہمارے ہاں بہت پرانی نہیں ہے۔ داستان گوئی کو پیشہ ورانہ زندگی میں شمار نہیں کر سکتے۔ سب سے نامور داستان گو میر باقر علی کو ہم آخری داستان گو کہتے تھے۔ ان کی ایک داستان کا متن جو ان کے کسی مداح نے

نہ کیا تھا۔ ہم نے بھی پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بات واضح [illegible]
سننے والوں کو کہانی چاہیے تھی سب جو شعر پڑھنے کا رواج عام پڑا ہے تو [illegible]
سمجھاتے ہیں اصل تو سب میری ہی طرح صرف اپنی شعر پڑھتے ہیں۔ وہ [illegible]
التزام رکھتے ہیں کہ اول تا آخر [illegible] میں پڑھیں گے مصنف موقع [illegible]
عملاً نہیں کر پاتے کہ موصوف کے زیادہ اعراب نہیں یا پڑھتے زیادہ اعراب ہیں [illegible]
سند صاحب طرز شعر نگار مونو ٹون سے گریز کرتے ہیں مگر وہ اپنے انداز پر ایسے فریفتہ
ہیں کہ اپنے ہر فقرے پر جھوم جھوم جاتے ہیں اور ایک ایک لفظ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ
وہ اثر کا پتا پھینک رہے ہیں۔ ضیا محی الدین نے نثر پڑھنے کا جو انتہائی ہنر تا اثر
انداز اپنایا ہے اور خواندگی کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس میں صرف ایک عیب ہے
وہ یہ کہ جس کسی نے نقل میں ان کی طرح پڑھنے کی کوشش کی وہ مارا جائے گا۔ یہ راگ
اور سنگھار اور یہ ساز انھیں کو سجتا ہے۔ ع

ہر رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

وہ زبان کی صحت لہجے اور تلفظ کی درستی اور کلیدی فقرے کی ادائیگی پر خاصا
ریاض کرتے ہیں۔ اور یہ ان کے فن کی پرکاری ہے کہ وہ اپنے سامعین اور ناظرین کو
اس کا ذرا احساس نہیں ہونے دیتے۔ وہ اس منزل سے آسان گزر جاتے ہیں۔ ورنہ
ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں جو گفتگو میں اوبڑ کر ایسے الفاظ اور ڈانہری تلفظ کے ساتھ
ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ انھیں سن کر ہم جیسے کم مایہ لوگ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم
نے خود کو عالم ہونے سے باز رکھا۔ ہماری مراد ان حضرات سے ہے جو جد وجہد، ورثہ،
زیادتی، شناخت، موسم، سمت کہہ کر الفاظ کے بدیسی ماخذ و مخرج سے اپنی واقفیت
کا ثبوت ہر تیسرے جملے میں بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ فارسی کے کانٹے کا نٹے دودھ میں
آمیزش نہیں ہونے دیتے۔ پانی تو در کنار، دیسی شکر تک ملانے کے روادار نہیں [illegible]
اوقات حسن سے منہ لگا کر دودھ پیتے اور ہم بھیسوں کو دولتی مارتے رہتے ہیں [illegible]
بلا ڈ کا سرکو تو ہم نے محبت کو محبت کہتے بھی سنا اپنے کانوں سے [illegible]

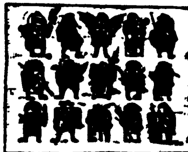
کھلونے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس نقطۂ نظر یعنی محبت کو محبت کہہ کر کوئی کام کرے تو ہمیں جاننے دو تمام محبت نہیں کچھ اور کر رہا ہے

لیکن بالکل دین خالص کی چیز کو عام آدمی تک پہنچانے کی اہمیت ہی کے جہیں، اس کے تجربے کی واقف ہیں۔ دوسروں کو سکھانا، خود سیکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ادبی شہ پاروں کے لیے قبول عام کی راہ ہموار کرنے میں انھوں نے جس طرح سہیل کی ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔ اس عمل میں جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور دل میں بات اتارنے کے لیے جو بہروپ اور سانگ بھرنے پڑتے ہیں ان پر وہ بلا قاعدہ قدرت رکھتے ہیں۔

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

ان کے ایک ادنیٰ مداح اور پُرشوق تماشائی کی حیثیت سے اور آپ سب کی جانب سے میں ان کا شکرگزار ہوں کہ آج انھوں نے ہمیں ایسے فن کی جھلک دکھائی جو حسین کو حسین تر تو کرتا ہی ہے لیکن بعض اوقات سادہ کو بھی پُرکار بنا کے دکھا سکتا ہے۔ وہ فن اور وہ فن کار لائق صد احترام و ستائش ہے جو

حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ



چند باتیں

چند یادیں

تحریر: مرزا اعظم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی .... اعظم گڑھ یوپی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا
سیم بیگ چغتائی کا خاندانی شہر آگرہ تھا۔ اس سے پہلے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی زندگی
یان کروں میں سمجھتا ہوں کہ کچھ تھوڑا بہت بزرگوں کے بارے میں لکھنا ضروری ہے۔
رزا قسیم بیگ چغتائی نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ بی۔ اے کر کے یوپی سول سروس میں
چلے گئے۔ کالج کے زمانہ میں کشتی لڑتے تھے۔ مولانا شوکت علی صاحب نے ایک مضمون
لکھا ہے "علی گڑھ کے کھلنڈرے" اس میں ذکر کیا ہے کہ مرزا قسیم بیگ چغتائی کشتی
بہت خوبصورت لڑتے تھے۔ یوپی کے مختلف شہروں میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ خان بہادر کا
خطاب ملا اور فری میسن کے ممبر بھی ہوا کرتے تھے۔ بڑے غریب پرور آدمی تھے۔ اپنے
بوڑھے سالے کو آٹھ برس کی عمر سے پالا اس کے علاوہ محلہ اور رشتہ داروں کے
بھی پلے یتیموں کا بہت خیال کرتے تھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ اتنے بچے
پلتے تھے کہ ہاکی کی ٹیم گھر کی ہوا کرتی تھی گھر پر سب بچوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ
ورزش کشتی اور لکڑی چلانا بھی سکھائی جاتی تھی۔ شکار کے بہت شوقین تھے خود کی دس
اولادیں تھیں چار بیٹیاں اور چھ بیٹے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی تیسری اولاد تھے اور
عصمت چغتائی نویں اولاد ہیں اسی طرح عصمت چغتائی کی پرورش عظیم بیگ چغتائی

سے نہ کی تھی۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے تایا کا نام مرزا ابراہیم بیگ چغتائی تھا شاعر تھے ان کے سب سے بڑے بیٹے کا نام مرزا نعیم بیگ چغتائی تھا اور وہ اپنے والد کی طرح شاعر تھے اور افسانہ بھی لکھتے تھے دہلی۔ لاہور اور پشاور کی ادبی محفلوں کی جانی پہچانی شخصیت تھے پشاور سے جو پہلا اردو اخبار نکلا ہے اس کے پہلے ایڈیٹر بھی تھے۔ عظیم بیگ چغتائی کے چچا کا نام مرزا مستقیم بیگ چغتائی تھا اور بڑے بھائی مرزا قسیم بیگ چغتائی کی طرح ادب سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے عظیم بیگ چغتائی کے نانا منشی امراؤ علی عالم فاضل تھے اور ان کی ایک کتاب ہے جو مسلمانوں کے ہندوستان میں بسنے کی تاریخ ہے یہ دو جلدوں میں ہے اور اس کا نام "رزم بزم" ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ابتدائی تعلیم حسن اسکول بدایوں یو۔پی میں ہوئی اس کے بعد اٹاوہ مسلم اسکول سے میٹرک کیا جس زمانہ میں میٹرک میں پڑھتے تھے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اسکول میں ہاکی کھیلتے تھے گھر پر مذہبی تعلیم کے ساتھ کشتی اور لکڑی چلانا بھی سیکھی شطرنج بہت اچھی کھیلتے تھے۔ پہلی کتاب "قصر صحرا" جب لکھی تو نویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ اس کی دوسری جلد دسویں میں لکھی۔ میٹرک کے بعد اپنے والد سے شادی کے لیے کہا تو جواب ملا کہ تم ایک معمولی کلرک ہو بیوی بچوں کا خرچہ کیسے برداشت کرو گے۔ اس کے جواب میں عظیم بیگ چغتائی نے کہا صاحب دنیا میں صرف ڈپٹی کلکٹر ہی شادی نہیں کرتے کلرک اور چپراسی بھی شادی کرتے ہیں خیر اس قسم کی بحث کے بعد عظیم بیگ چغتائی صاحب کی شادی رامپور کے پٹھان خاندان میں عظیم بیگ چغتائی کی چھوٹی بہن کے جیٹھ کی لڑکی سے ہوئی تھی یعنی مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بہنوئی بیوی کے سگے چچا تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے بہت کم عمری سے لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا پہلی کتاب

نویں ذمہ داریوں میں لکھی اس کے بعد کلرکی کرتے اور لکھتے ہیں مگر یہ نوکری زیادہ دن نہیں
کر سکے کیونکہ ایک دفعہ معمولی سی غلطی پر بینک منیجر نے بہت ڈانٹا اور یہ بھی کہا کہ
جانے کہاں سے جاہل کام کرنے آ گئے ہیں۔ اس پر مرزا عظیم بیگ چغتائی کو غصہ آ گیا اور
انھوں نے منیجر کو ہاتھ مار دیا اس لیے نوکری چھوڑنی پڑی۔ نوکری چھوٹنے کے بعد علی گڑھ
اپنے والد کے پاس آ گئے۔ شادی کے وقت یہ طے پایا تھا کہ شادی کے بعد خود خرچہ
برداشت کرنا پڑے گا اس لیے مرزا عظیم بیگ چغتائی نے علی گڑھ میں جانسن کے تالے کی
فیکٹری میں نوکری کر لی اور ساتھ ساتھ کالج میں داخلہ بھی لے لیا رات کو کام کرتے تھے
اور دن کو کالج جاتے تھے اپنے والد کے ساتھ رہتے تھے مگر ہنڈیا چولہا الگ تھا۔
ملازمت اور تعلیم کے زمانہ میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہو چکے تھے دوسری بیٹی
مدحت چغتائی کو مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہن نے گود لے لیا تھا جو بلبھور میں بیاہی ہوئی
تھیں اور بڑی نزہت چغتائی اور بڑا لڑکا مرزا علیم بیگ علی گڑھ میں ساتھ رہتے تھے
اس کے باوجود گھر کا خرچ اتنا ہو جاتا تھا کہ گزر مشکل سے ہوتی تھی اور جب ہاتھ بہت
تنگ ہو جاتا تھا تو بیوی بچوں کو رامپور میکے بھیج دیتے تھے اور جب بہت دن ہو جاتے
اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے والد اور والدہ کو اپنے پہلے پوتا پوتی یاد آتے تو وہ کہتے
تھے کہ بچوں کو بلاؤ اور اس پر مرزا عظیم بیگ چغتائی جواب دیتے تھے کہ میرے پاس
پیسے نہیں ہیں میں نہیں بلا سکتا پوتا اور پوتی کو بلانے کے لیے والد پیسے دیتے تھے
کیونکہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے پہلے لڑکا اور لڑکی دادا دادی کو بہت عزیز تھے اور
میرے خیال میں پوتا پوتی کو سامنے رکھنے کی وجہ سے گھر میں رہنے کی جگہ دے رکھی
تھی خیر ان حالات میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے علی گڑھ سے بی اے، ایل ایل بی کیا
معاشیات ان کا خاص مضمون تھا اور گولڈ میڈل ملا تھا۔ علی گڑھ میں تعلیم اور ملازمت
کے علاوہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھاتے بھی تھے اور لکھتے بھی رہتے تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بڑے بھائی مرزا نسیم بیگ چغتائی نے میٹرک کر کے پڑھنا چھوڑ دیا تھا ان کو دوبارہ پڑھنے پر لگایا۔ خان بہادر قسیم بیگ چغتائی ویسے تو بڑے غریب پالنے تھے مگر مرزا عظیم بیگ چغتائی سے جو شادی پر کہا تھا کہ بیوی بچوں کا خرچ برداشت کرنا ہوگا تو اس پر قائم رہے سب کا خرچ برداشت کرتے تھے اور اپنے بچے عظیم بیگ کے سر پر پیسہ دینے کے علاوہ بالکل مدد نہیں کی۔ مرزا عظیم بیگ سے چھوٹے بڑے جانے لکھنے والے رہتے تھے سب کو روٹی کپڑا ملتا تھا اور ان میں بہت سے لکھے پڑھے بھی نہیں تھے۔ شکار کی پارٹیاں ہوتی تھیں اور عیش کرتے تھے مگر مرزا عظیم بیگ چغتائی کولہو کا بیل بنے ہوئے تھے اور کبھی ان کے والد اور والدہ کو رحم نہیں آیا آخر اس قسم کی زندگی کو چھوڑا اور پھر وکالت شروع کی۔ وکالت میں اچھے خاصے پیسے کما لیتے تھے اس لیے جب بڑے بھائی نے ایل ایل بی کر لیا تو ان کو اپنے ساتھ لگا لیا اور وکالت کرنا سکھائی شروع سے ان کو ہر مقدمہ پر آدھے پیسے دیتے تھے۔ بڑے بھائی مقدمہ نہ بھی لڑتے اس لیے ان ایک دفعہ مرزا قسیم بیگ صاحب کراچی میں مجھ سے کہنے لگے۔ کہ بھئی ہم تو وہ کرتے تھے جو مناسب تھا (مرزا عظیم بیگ چغتائی کا گھر کا نام) بڑے ہونے کے باوجود چھوٹے بھائی کی بڑوں کی طرح عزت کرتے تھے۔

خان بہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی یوپی سے ریٹائر ہونے کے بعد جودھپور راجستھان آ گئے کیونکہ ان کے دو سالے ظفر حسین خانی اور فرحت حسین خانی جودھپور ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر ملازم تھے اور کچھ دنوں کے بعد مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی آگرہ اور رامپور میں وکالت کر کے جودھپور آ گئے اور وکالت شروع کی۔ الگ مکان لے کر رہتے تھے جودھپور میں دو لڑکے اور ایک لڑکی اور پیدا ہوئی یہاں عظیم بیگ چغتائی کی اولاد کے نام بھی لکھتا ہوں عمر کے لحاظ سے لکھ رہا ہوں۔ نزہت، مدحت، زعیم، الفہیم، حلیم اور طلعت جن ناموں کے آخر میں "ت" آتا ہے لڑکیوں کے ہیں اور جن ناموں کے آخر میں "م"

آتا ہے وطن والوں کے یہاں صرف دولت بہت زیادہ تھی سب اعلیٰ صاحب [illegible]
اور نسیم دادا دادی کے پاس بھی بہت رہتے تھے۔

عظیم بیگ ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے اس زمانہ میں ریاست جاورہ کے نواب صاحب نے اپنی ریاست میں ملازمت دینے کے لیے خط لکھا عظیم بیگ چغتائی وکیل تھے اس لیے ریاست کے چیف جج کا عہدہ پیش کیا۔ عظیم بیگ چغتائی نے بزرگوں کی مخالفت کے باوجود نواب صاحب کی پیشکش قبول کرلی مرزا قسیم بیگ چغتائی نوابوں کی نوکری پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ہندو ریاست میں ملازمت کی تھی عظیم بیگ کے بڑے ماموں مظفر حسین عثمانی صاحب نے بھی روکنا چاہا کہ تم جودھپور کے مشہور وکیل ہو اور تمہیں اب کسی وقت بھی جودھپور میں جج کا عہدہ مل سکتا ہے اور جودھپور جاورہ سے بڑی ریاست ہے اس لیے نہیں جانا چاہیے۔ مگر عظیم بیگ چغتائی نے کسی کی نہیں سنی اور کسی کی کیسے سکتے تھے۔ انھوں نے سب کچھ اپنی محنت سے حاصل کیا تھا اور وہ بھی جو تیس بتیس سال کی عمر میں۔ جاورہ جانے کے بعد عظیم بیگ چغتائی اپنے بہن بھائیوں کو نہیں بھولے۔ سب سے پہلے اپنے بڑے بھائی نسیم بیگ کو بلایا اور سکریٹری لگوا دیا۔ عصمت چغتائی کو بلایا ان کے پڑھنے لکھنے کے لیے الگ کمرہ بنوایا اور جب پڑھ لکھ گئیں تو لڑکیوں کے اسکول میں نوکر رکھوا دیا۔ جاورہ ہی میں تھے تو جودھپور میں مرزا قسیم بیگ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد دوسرے چھوٹے بھائی بھی جاورہ ملنے آئے یا پھر اس امید پر کہ یہیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے ایک چھوٹے بھائی جسیم بیگ بھی انگلستان سے پڑھ کر واپس آئے تو سب سے پہلے جاورہ آئے کیونکہ چھوٹے بھائی ہونے کے علاوہ جسیم بیگ کو انگلستان بھجوانے میں مالی اور زبانی امداد کی تھی۔ مرزا قسیم بیگ نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ عظیم بیگ صاحب نے کہا کہ میں بھی خرچ برداشت کروں گا۔ تب والد نے ان کو پڑھنے بھیجا تھا غرض جسیم بیگ صاحب کو

بھی نوکری مل رہی تھی مگر وہ چھوٹی ریاست میں نوکری کرنا نہیں چاہتے تھے اور بعد میں ٹیانیا میں ملازمت کی تھی۔

جاوہ کی نوکری زیادہ دن نہیں کرسکے۔ نواب صاحب نے پہلے تو محکمہ پاپنادر" کی اشاعت بند کردی اس کے بعد نسیم بیگ صاحب سے ناراض ہوگئے اور انھیں نوکری چھوڑکر جانا پڑا اس کے بعد نواب صاحب عظیم بیگ چغتائی سے بھی ناراض ہوگئے۔ عظیم بیگ حساس آدمی تھے اور دمہ کی شکایت بھی تھی۔ مگر ویسے اچھے خاصے تھے بس دمہ کا زور ہوتا تو دوا پیتے تھے۔ جاورہ میں گولف بھی کھیلتے تھے۔ نئے ڈاکٹر سے دوائی اس کے بعد سے اور زیادہ طبیعت خراب ہوگئی۔ لوگوں نے منع کیا تھا کہ اس ڈاکٹر سے علاج مت کراؤ مگر نہیں مانے اور صحت اور گرتی شروع ہوگئی۔ پھر پہاڑ پر بھی آرام کرنے گئے اس زمانے میں عصمت چغتائی بڑی بیٹی نزہت اور شاید چھوٹی بیٹی کو لے کر بغیر نوکری سے استعفادیے راتوں رات جاورہ سے بریلی چلی گئیں۔ عظیم بیگ چغتائی پہاڑ سے واپس آئے تو سب سے چھوٹے بیٹے علیمہ کے ساتھ بیگم عظیم رامپور چلی گئیں۔ عظیم بیگ زعیم علیم اور سامان کے ساتھ جودھپور آگئے ہم لوگوں نے بڑی افراتفری میں جاورہ چھوڑا تھوڑے دن بعد بیگم عظیم بیگ چھوٹے بیٹے اور بیٹی کو ساتھ لے کر جودھپور آگئیں اس وقت جودھپور میں عظیم بیگ چغتائی کے تین چھوٹے بھائی رہتے تھے اور والدہ بھی رہتی تھیں ان بھائیوں کے نام یہ ہیں وسیم بیگ، بسیم بیگ اور عصیم بیگ، وسیم بیگ میٹرک تک پڑھے ہوئے تھے اور محکمہ خاص میں معمولی کلرک تھے۔ شادی شدہ تھے اور ایک لڑکا تھا۔ بسیم بیگ میٹرک بھی نہیں تھے، میونسپلٹی میں کلرک تھے عصیم بیگ کو عظیم بیگ صاحب نے ماہر تحریر کا کاریسپونڈنس کورس کروادیا تھا مگر کوئی خاص کام نہیں شروع ہوا تھا۔ عظیم بیگ کی والدہ کو آگرے کے مکانوں کا کرایہ آتا تھا مگر خان بہادر قسیم بیگ کا چھوڑا ہوا گھر کا سامان بکنا شروع ہوگیا اور یہ بھائی اس سامان پر

ہوتے تھے۔ وسیم بیگ چغتائی کے پیسے والدہ سے بچے تھے یا ہر سالان بھیج کر [illegible] تھے کچھ دنوں کے بعد عصمت چغتائی بھی بریلی آگئیں اور راج محل گرلس اسکول میں پڑھانے لگیں۔

جودھپور آکر عظیم بیگ نے وکالت پھر شروع کر دی اور اپنی کتابوں کی اشاعت بھی خود کرتے تھے کمپنی کا نام دفتر کتابت رکھا تھا ایک دن میں برآمدہ میں کھڑا تھا عظیم بیگ کچہری سے آئے تانگے سے اترے ان کے ہاتھ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ جب پتہ چلا ہوا تو معلوم ہوا کہ کیا قصہ تھا شاہد احمد دہلوی کے والد ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی کتاب دہلی میں چھپی تھی اور ملاؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ شاہد احمد دہلوی گھبرا گئے انھوں نے عظیم بیگ کو لکھا تو انھوں نے کہا کہ جودھپور بھیج دو اور پھر مختلف شہروں کو بھیج دی جائے گی شاہد دہلوی نے ایسا ہی کیا اور ملاؤں کے وفد سے کہہ دیا کہ میرے پاس کتابیں نہیں ہیں۔ جودھپور میں عظیم بیگ کے پاس ہیں۔ کتابیں جودھپور آنے سے پہلے ہی مظاہرے ہونے لگے اور قتل کی دھمکیاں ملنی شروع ہو گئیں عظیم بیگ چغتائی نے بھی اعلان کر دیا کہ میں پستول رکھتا ہوں اور روز کچہری پستول لے کر جاتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد پستول رکھنا چھوڑ دیا انھیں نہیں معلوم تھا کہ خود ان کا بھائی وسیم بیگ ملاؤں سے ملا ہوا ہے۔ انھوں نے ملاؤں کو بتا دیا کہ اب پستول نہیں رکھتے ملاؤں نے ایک انگریز غنڈے سے عظیم بیگ پر حملہ کروا دیا۔ اس نے لکڑی سے حملہ کیا تھا عظیم بیگ لکڑی چلانا جانتے تھے انھوں نے سب وار ہاتھوں پر روک لیے ایک بھی سر پر نہیں پڑنے دیا۔ وہ گھبرا گیا اور بھاگ گیا اس لیے ہاتھوں پر چوٹ آئی تھی ہاتھ خون میں بھرے ہوئے تھے۔ خیر اس حادثہ کے بعد ملاؤں سے مسجد میں ملاپ ہو گیا معافی مانگنی پڑی۔ جب گھر کا بھیدی ہو تو کیسے لڑ سکتے تھے۔ خیر سب کتابیں آتے ہی جلا دی گئیں۔ ملا کتابیں جلا کر خوش ہو گئے مگر ایک کتاب رکھ لی تھی کہ پڑھا جائے گا کہ کیا لکھا

بھائی کو نسیم بیگ نے طاؤس کو خبر کر دی کہ ایک
ہے مگر کتاب لکھنے بیٹھ گئے تو پھر وہ آخری کتاب بھی نہیں چھپ
سکی کیونکہ پھر طاؤس نے کر کے گھر پر چلے گئے
گم ہو گئی مگر وہ کتاب آج پاکستان میں چھپتی ہے۔
چاروں سے آنے کے بعد کمزور ہوتے گئے دواؤں کا اثر نرس سسٹم پر ہوا تھا
ایک دفعہ جو ہسپتال میں گئی ہے پھر وکالت چھوڑنی پڑی۔ کیونکہ دھیرے دھیرے
کمزور ہوتے گئے اور پلنگ سے لگ گئے۔ کمر سے نیچے کا دھڑ مفلوج ہو گیا لکھتے تو رہتے
ہی تھے پلنگ سے لگ جانے کے بعد لکھنا پڑھنا زیادہ ہی ہو گیا کیونکہ گزارے کے لیے
ہاتھ اور دماغ ہی کام کر رہے تھے لیٹے لیٹے اتنی ہمت رکھتے تھے کہ مل گراہم کے جانسن
تاجروں کی ایجنسی لے رکھی تھی جو دھیور کے تاجروں کو سپلائی کرتے تھے۔ جو دھپور ریلوے
اور پولیس کے بٹنوں وغیرہ کے آرڈر لیتے تھے یا پھر تاجروں کے ذریعے سپلائی کرتے
تھے مگر پھر بھی اور قلم کے لیے لکھ رہے تھے اور کہانے لکھنے کے لیے اپنے تایا زاد بھائی
مرزا نعیم بیگ کو بلایا تھا مگر اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ نعیم بیگ بڑے ابا والد کو گود
میں اٹھا کر دھوپ میں بٹھاتے تھے۔ نعیم بڑے ابا بچوں کو کہانیاں بھی سناتے تھے
کہانی سنانے کا انداز بہت خوبصورت تھا پھر نعیم بڑے ابا چلے گئے فلم نہ
بن سکی۔
خان بہادر قسیم بیگ چغتائی کے گھر کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی اس لیے گھر
سامان بکنا شروع ہو گیا تھا اور بھائیوں میں جھگڑے شروع ہو گئے علیم بیگ چغتائی
سب سے چھوٹے تھے مگر سب سے لمبے چوڑے اور تگڑے تھے اور کام بھی کوئی خاص
نہیں کر رہے تھے اس لیے یہ حضرت ہی سب سامان بیچ کر کھا رہے تھے سب سے
چھوٹے ہونے کی وجہ سے ماں کے بھی لاڈلے تھے وسیم اور بسیم بڑے ضرور تھے مگر صرف
زبان چلا سکتے تھے اور لڑتے رہتے تھے کیونکہ نقصان کے حصے میں کچھ نہیں آ رہا تھا جھگڑا

میں عصمت چغتائی نے عظیم بیگ سے بیان لیا اور یہ بھی پوچھا کہ جب [illegible] سے بجلی لی ہی تو انھوں نے کہا کہ نہیں کیونکہ وہ اس وقت جانتے تھے [illegible] بھی جاورہ میں تھیں یا بھوپال میں۔ عظیم بیگ چغتائی سے عصیم بیگ نے کافی بحث [illegible] اپنی عزت اپنے ہاتھ کے تحت وہ ان تینوں بھائیوں کے جھگڑے سے الگ رہنا چاہتے یہ لوگ بجلی کے بل تک پر لڑتے تھے اس لیے عظیم بیگ چغتائی نے تو جھگڑوں سے بچنے کے لیے بجلی کا میٹر الگ لگوالیا تھا۔

عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کا ان لوگوں پر بڑا اثر تھا یا پھر احساس کمتری کہ وجہ سے یا پھر ان لوگوں کی آمدنی اتنی کم تھی کہ یہ لوگ دوائیں جو لیتے اخبار اور رسالے خود تو خرید نہ سکتے تھے اس لیے وہ مانگ لیتے تھے اور وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے اخبار رسالے پڑھا کرتے تھے اردو ہندی کے سب رسالے اور اخبار آتے تھے اور وہ سب میں لکھتے تھے اردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے مفلوج ہونے کے بعد صرف لکھنا ہی رہ گیا تھا۔ کمزور ہوتے جارہے تھے اس لیے کبھی اپنے بڑے بیٹے زعیم کو افسانہ بولتے تھے اور وہ لکھتے تھے کوئی دس گیارہ برس کے ہوں گے اور کبھی اپنے بھانجے کو افسانہ بولتے تھے اور وہ لکھتے تھے۔ دل بہلانے کے لیے اکثر مجھ سے شطرنج کھیلتے۔ اس لیے میری شطرنج کم عمری سے اتنی اچھی تھی کہ عصیم بیگ اور رسیم بیگ کو ہرا لیتا تھا اس زمانے میں ایک افسانہ کے پندرہ بیس روپے ملتے تھے گھر کے خرچ کے لیے کم از کم تین چار افسانہ مہینہ میں لکھنے پڑتے تھے پھر کتابوں سے آمدنی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ جانسن کی ایجنسی سے بھی کما لیتے تھے اس طرح لیٹے لیٹے عظیم بیگ چغتائی کی آمدنی اپنے تینوں بھائیوں اور عصمت چغتائی سے زیادہ تھی اس لیے یہ سب الگ حسد کرتے تھے کہ یہ شخص لیٹے لیٹے ہم سے زیادہ کما لیتے ہیں۔ یہاں ایک قصہ لکھ دوں۔ بسیم بیگ صاحب کی شادی کا ولیمہ ہوا تو دلہن بنانے کے لیے زیور نہیں تھے تو بیگم عظیم بیگ کا [illegible]

واپس چلی گئی۔ دوسرے دن بسیم بیگ صاحب زیور واپس دینے آئے تو بیوی بھی وہیں
موجود تھیں۔ بسیم بیگ نے پوچھا کہ بھائی آپ کے پاس کتنا زیور ہوگا۔ اس پر عظیم بیگ چغتائی
نے جواب دیا کہ تم سب بھائی اپنی بیویوں کا زیور ایک جگہ جمع کر لو اور گنا کرو تب بھی
کم رہے گا۔ یہ وجہ تھی کہ سب لوگ عظیم بیگ سے نفرت کرنے لگے تھے جو تین بہنیں اور
دو بھائی جودھپور میں نہیں رہتے تھے وہ عظیم بیگ سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ جودھپور
میں ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ پروفیسر، لیکچرار اور طالب علم ملنے آتے تھے کچھ نئے لکھنے
والے اصلاح لینے آتے تھے۔ یہ مقبولیت بھی وسیم بیگ، عصمت چغتائی اور عصیم بیگ
کو پسند نہ آئی۔ ہاں عصمت چغتائی، وسیم بیگ اور بسیم بیگ بدتمیزی نہیں کرتے تھے۔
بدتمیزی کرنے میں صرف عصیم بیگ تھے اس کے علاوہ عظیم بیگ چغتائی کو ایذا دینے کے
لیے یہ لوگ، خاص کر عظیم بیگ بچوں پر ظلم کرتے تھے۔ بیگم عظیم بیگ کو بھی بہت تنگ
کیا۔ وہ صرف دو کمروں میں بند ہو کر رہ گئی تھیں۔ بات بے بات بچوں کو مارتے تھے
یہاں دو قصے لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے چھوٹی بیٹی طلعت پانچ چھ برس
ہوگی معمولی سی بات پر عصمت چغتائی نے بال پکڑ کر اس زور سے کھینچے ہیں کہ ایک ر
برابر گچھا ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایک میرا اپنا قصہ ہے کہ میں کوئی آٹھ برس کا تھا اپنے۔
بڑے لڑکے کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا اور جیت رہا تھا عصیم بیگ چغتائی جو
لڑکے کو بتا رہے تھے بے ایمانی کرنی چاہی میں نے ہاتھ پکڑ لیا اور بے ایمانی نہ
کرنے دی تو غصہ ہو کر اتنا مارا کہ بے ہوش کر دیا تھا ان لوگوں کی مار سے بڑے
اور دو بہنیں بھی ہوئی تھیں۔ کیونکہ نزہت اور زعیم پہلے پوتا پوتی تھے اور دادی
بہت لاڈلے تھے اس لیے عذاب تین چھوٹوں پر تھا میرے خیال میں یہ لوگ بچو
ظلم کرکے نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ یہ میں ضرور کہوں گا کہ عصمت
مجھ پر کافی مہربان رہتی تھیں۔

بیگم عظیم بیگ چغتائی تنگ آ کر بھی ٹی بی کے مریض کے پاس رہتی تھیں مگر صرف عظیم بیگ چغتائی کے ساتھ رہ گئے۔ بڑی بیٹی نزہت علی گڑھ میں پڑھتی تھیں اور آتی جاتی رہتی تھیں۔ بیگم عظیم بیگ چغتائی کے باہر رہ جانے کے بعد عصیم بیگ چغتائی نے ظلم کی حد کر دی عظیم بیگ کے کمرے کے دروازے آنگن میں کھلتے تھے ان کو بند کر کے تختے جڑوا دیے اور دھوپ اور تازہ ہوا آنے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ جس وقت تختے جڑ رہے تھے تو عظیم بیگ کہہ رہے تھے اسے چنو یہ کیا کر رہا ہے (چنو عصیم بیگ کا پیار کا نام تھا) گڑگڑا رہے تھے اور یہ چنو اپنے آپ کو شیر سمجھ رہے تھے۔ اس سے پہلے ایک اور کمزور اور اسی سال سے بھی زیادہ عمر والے تایا ابراہیم بیگ صاحب کو بھی گھر سے نکال چکے تھے۔ دونوں حادثوں کے وقت میں کھڑا ہوا تھا بچہ تھا مگر ایک ایک بات یاد ہے جب وہ تختہ جڑ رہے تھے تو آنگن میں عصمت چغتائی اور ان کے دو بھائی بصیم اور وسیم بھی موجود تھے اور عظیم بیگ چغتائی کی والدہ بھی موجود تھیں مگر عظیم بیگ کا کوئی نہ تھا یہی نہیں بلکہ بچوں کو بھی حکم دیا کہ باپ کے پاس جاؤ گے تو پٹو گے۔ بچے چپ چپ کر ملتے تھے۔ میں شطرنج کھیل کر دل بہلاتا تھا اور بڑے بھائی افسانہ لکھتے تھے بڑی بیٹی نزہت علی گڑھ سے آئی تو دروازے بند دیکھے لڑکی تھی خود تو لڑ نہیں سکتی تھی۔ باپ کی محبت میں بڑے ماموں ظفر حسین عثمانی کو بلا کر لائی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بڑے ماموں اللہ کا واسطہ دے رہے تھے اپنے بڑھاپے کا واسطہ دے رہے تھے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ یہ تم لوگوں نے کیا کر رکھا ہے۔ عصمت چغتائی، وسیم بیگ، بصیم بیگ اور والدہ سب ہی موجود تھے عصیم بیگ اوپر چھت پر کھڑے تھے۔ ان التجاؤں کا جواب بڑے ماموں کو چپ کرانے کے لیے عصیم بیگ نے یہ دیا —

" بڈھے تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے تیری گردن بھی مروڑ دوں گا۔" یہ لفظ بہ لفظ لکھ رہا ہوں۔ عصمت چغتائی "دوزخی" میں لکھتی ہیں کہ انہوں نے زندگی کی نان وائیلنس اختیار کر لی حالانکہ ان لوگوں نے عظیم بیگ کی زندگی دوزخ بنا دی تھی۔

لہٰذا بہت زیادہ رونق ہوتی تھی مگر دھیرے دھیرے کم ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد عظیم بیگ چغتائی کی طبیعت مزید خراب ہونا شروع ہو گئی اور وہ دن نزدیک آنے لگا۔ سب جانتے ہیں قریب تین چار سال سے مفلوج تھے پلنگ سے لگے ہوئے تھے لیکن قلم آخر وقت تک چلتا رہا اخبار بھی نکال رہے تھے اشتہار شروع کر دیے تھے اخبار کا نام "جارجی" رکھا تھا سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ۱۹ اگست کی شام کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ دوسرے دن صبح ۲۰ اگست کو گھر کی فضا بہت کمدر تھی ویسے تو جب سے ہم لوگ جاوُرہ سے آئے تھے فضا کبھی بھی اچھی نہیں رہی مگر اس دن مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ دہشت طاری تھی ڈر کیا ہوگا۔ سب ہی لوگ آنگن میں تھے۔ عظیم بیگ چغتائی کے کمرے کے دروازے کھول دیے تھے۔ عظیم بیگ کی والدہ نے دروازوں کے تختے اتروا دیے تھے اور اب ان کے آنے جانے میں آسانی ہو گئی تھی یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ روح کے نکلنے کے لیے دروازے کھول دیے گئے تھے اس سے پہلے گھر کے باہر سے پچھلے دروازے سے آ جا سکتے تھے یا پھر چھت پر چڑھ کر ایک سیڑھی اس کمرے میں جاتی تھی جہاں عظیم بیگ کو ان لوگوں نے قید کر رکھا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسکول جانا ہے کہ نہیں۔ میرے دو بھائی کہاں تھے مجھے نہیں یاد۔ اتنے میں چھوٹو بھائی (عصیم بیگ) اوپر سے ہاتھ میں بکس اور ہولڈال لیے نیچے اترے کسی مقدمہ میں باہر جا رہے تھے ان کی نظر عظیم بیگ چغتائی کے کمرے کے دروازوں پر پڑی کھلے ہوئے دیکھے یہ بھی دیکھا کہ لوگ اندر باہر آ جا رہے ہیں ـــــ عصیم بیگ کا پارہ چڑھ گیا بڑی بدتمیزی سے بولے یہ دروازے کس نے کھولے ہیں اس پر دادی نے جواب دیا میں نے کھلوائے ہیں مجھے منے (عظیم بیگ) کے پاس آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے کیونکہ میرے گھٹنوں میں تکلیف ہے (گٹھیا کی بیماری تھی) مجھ سے سیڑھیاں نہیں اتری چڑھی جاتیں اور عصیم بیگ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ سب ہی لوگ آنگن میں تھے کسی کی مجال نہیں تھی جو بولتا۔ ادھر عظیم بیگ

آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔ رات سے ہی نزع کی حالت تھی۔ غش آتے تھے اور جاتے
پھر کسی نے کہا کہ ملاؔ کو یاد کر رہے ہیں۔ پیار دوسری بیٹی عصمت کو ملا کہتے تھے۔ یہ
بیٹی تھی رامپور والی بہن نے گود لے رکھی تھی نزع کی حالت میں اد ں کی آواز نکل ر
تھی پھر مجھے جانے کیوں دادی نے اسکول بھیج دیا۔ میرے بڑے اور چھوٹے بھ
اس منحوس دن اسکول نہیں گئے۔

اسکول میں گھنٹہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ میرے رشتہ دار جو کالج میں پڑھتے تھے۔
لینے آگئے۔ انھوں نے کلاس کے ماسٹر سے انگریزی میں کچھ کہا مجھے لفظ نہیں یاد
میں سمجھ گیا کہ یتیم ہو گیا خاموشی سے ان کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر گھر آیا پورے راستے
دونوں نے بات نہیں کی۔ خاموش رہے گھر آ کر کمرے میں جانا چاہا مگر جانے نہیں
گیا۔ عصمت چغتائی کے کسی گاندھی کے چیلے نے ہم بچوں کو گلے لگا کر تسلی نہیں دی میت
کو غسل دیا گیا آنگن میں کمروں سے پانی بہہ کر آ رہا تھا سب لوگ آنگن میں تھے۔ تھوڑی
کے بعد جنازہ آنگن میں لا کر رکھا گیا کوئی آخری دفعہ منہ دکھانے کے لیے کفن کھولنے ا
مگر دادی نے روک دیا۔ وہاں کون تھا جو منہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ماں بھائی بہن خو
دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ بھی کسی نے نہیں سوچا کہ آخری دفعہ بچوں کو تو باپ کا منہ
دکھا دو۔ بچوں کو بھی آخری دیدار نہیں کروایا اور نہ ہی کسی کو دو آنسو بہاتے دیکھ
ہم لوگوں کے آنسو بھی خشک تھے جنازہ اٹھوا دیا گیا ہم تین بھائی بھی ڈرے سے جنازہ ے
پیچھے ہو لیے ہم تینوں ساتھ تھے ہم پر دہشت طاری تھی۔ قبرستان پہنچے نماز جنا
ہوئی اس کے بعد عظیم بیگ کے بڑے ماموں ظفر حسین عثمانی نے قبر میں اتارا اس د
میرے بڑے بھائی نے کہا کہ جب آخری دفعہ منہ دکھائیں تو رونا نہیں کیونکہ مرد نہی
روتے۔ ہم تین مرد بھی جب آخری دفعہ ماموں نے منہ دکھایا ہے تو اور مردوں کی طر
نہیں روئے نہ ہی آنسو ٹپکے اور تھوڑی دیر میں منہ بند کر دیا گیا بڑے ماموں قبر سے

آئے سب نے مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ ہم بھائیوں نے بھی مٹی ڈالی اور تھوڑی دیر میں قبر تیار ہو گئی خان بہادر قسیم بیگ کے کہنے پر بعد دفن جب فاتحہ پڑھی گئی اور ہم لوگ گھر واپس آ گئے۔ گھر آکر پھر کمرے میں جانا چاہا مگر نہیں جانے دیا گیا ویسے اب رکھا ہی کیا تھا یہ بھی یاد ہے جو پیسے تکیے کے نیچے سے نکلے تھے کفن دفن کے بعد ۲۴ یا ۲۵ روپے بچے تھے۔

اس رات عصمت چغتائی مجھے ساتھ لے کر سوئی ہیں ویسے بھی مجھ پر مہرباں رہتی تھیں سونے سے پہلے کہنے لگیں کتنی تکلیف میں تھے سب تکلیفیں دور ہوئیں۔ مجھ پر ایسی دہشت طاری تھی کہ میں پھر بھی نہیں رویا اور خاموش رہا۔ پھر مجھ سے کہا یا اجازت لی کہ میں نے بھائی کے قلم لے لوں کیونکہ میں لکھتی ہوں۔ اس سے پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ عصمت چغتائی مصنف ہیں میری عمر نو برس تھی مجھے یاد ہے میں نے کہا کہ لے لیں۔ عظیم بیگ چغتائی تین چار کر کے قلم رکھتے تھے لال، ہری اور نیلی سیاہی کے لیے الگ الگ قلم تھے جب ۱۹۵۴ میں کراچی سے بمبئی گیا ہوں تو عصمت چغتائی کے پاس وہ قلم نہیں تھے نہ میں نے پوچھا کہ وہ قلم کیا ہوئے۔

(چوتھی قسط)

بلراج ساہنی



عوامی تھیٹر کانفرنس کے بعد

کنول نین پرواز

جب تک گاڑی احمد آباد سے بمبئی سنٹرل پہنچی، طبیعت بے حد شکستہ حالت میں تھی عوامی تھیٹر کی کامیاب کانفرنس کے بعد اگرچہ دل و دماغ آسمان پر تھے لیکن جسم کچھ دنوں سے آرام دہ بستر کے لیے پکار رہا تھا۔ میں نے والدین کو پہلے سے ہی تار دیا تھا کہ واپسی میں ناسک کے لیے ایک دم سے گاڑی کا ملنا مشکل ہو جائے گا اس لیے دو تین روز باندرہ میں گزار کر وہاں واپس لوٹوں گا۔

بلراج جی میری حالت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ لوگ بیشم جی، شیلا جی اور شوکت اعظمی ٹیکسی لے کر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک آدھ لوگوں کو اتار رہے تھے وہ بے حد مُصر تھے کہ میں اُن کے ساتھ جوہو چلوں اور پھر ایک دو روز آرام کرنے کے بعد وہیں سے ناسک چلا جاؤں۔ ان کی اس دعوت میں بڑی کشش تھی لیکن ،

ممکن نہیں تھا۔ اول تو ان کے یہاں کافی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، دوسرے میں نے اپنے باندرہ میں رشتہ داروں کو لکھ دیا تھا کہ ناسک جانے سے پہلے ان کے یہاں ضرور آؤں گا۔ میں نے کہا " وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے "۔

زیادہ زور دینے پر وہ مان گئے لیکن مجھے باندرہ تک ساتھ ٹیکسی میں چلنے کو کہا۔ اسٹیشن سے سیدھی بس ٹری باقاعدگی سے میری جائے رہائش تک چلی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے وعدہ کیا کہ دو تین ہفتوں میں پھر بمبئی آؤں گا اور ان سے ضرور ملاقات ہو گی!

دوسرے روز میں باندرہ سے دوپہر کو اپنے والد صاحب کے کاروباری دفتر اپنی ڈاک وغیرہ دیکھنے گیا۔ تو سرنگر کے دونوں دوستوں پران کشور اور چترنجن کے چوپڑہ کے خطوط ملے۔ پران کو میری کانفرنس کی رپورٹ ابھی تک نہیں ملی تھی۔ یہ میں نے احمد آباد سے ہی بھیج دی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ رپورٹ ملتے ہی وہ روزنامہ خدمت کو اشاعت کے لیے دے دیں گے۔ چوپڑہ کے خط سے پتہ چلا کہ وہ اب جلدی بمبئی آرہے ہیں۔ ان کے خط سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بمبئی پہنچ گئے ہوں گے۔ راما نند ساگر کے بارے میں لکھا تھا کہ اب وہ اپنی ہی فلم ۔ بارو بندز کی تیاری میں ہیں۔ بلراج ساہنی کو اس میں اہم پارٹ دینے کی سوچ رہے ہیں اور دادر کے قریب ماٹنگا کے علاقے میں فلیٹ وغیرہ کا انتظام ہو رہا ہے۔ لیکن میرے پاس راما نند ساگر کا پتہ نہیں تھا۔

دفتر سے نکلتے ہی میں نے کافی ہاؤس کا رخ کیا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ شبد انھیں کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ پھر میں میرین ڈرائیو کے کیفے " بیرسین ڈیری" پہنچا جو ہم لوگوں کے ملنے کا اڈہ تھا ——— وہاں بھی ان کا کچھ پتہ نہیں ملا۔ حالانکہ ان کی اور میری جان پہچان کے لوگ وہاں موجود تھے۔

تیسرے روز میں ناسک میں تھا۔

جس بات کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا۔ ناسک پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ ہفتہ

ہمارا ڈاکٹر دوبارہ آیا۔ اس نے بتایا کہ زیادہ فکر کی کوئی بات نہیں جگہ جگہ کے کھانے اور آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے جسم میں بے حد تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ تین چار ہفتے میں طبیعت بحال ہو جائے گی۔

خوش قسمتی سے یہ جگہ شہر کی آبادی سے دس بارہ میل دور تھی۔ ہمارا مکان بڑی اونچائی پر تھا۔ یہاں دو بنگلے تھے، والد صاحب کے دوست جنہوں نے اس مکان کا انتظام کیا تھا، دوسرے بنگلے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ہفتے میں پانچ دن بمبئی کے دفتر میں کام کرتے تھے اور جمعہ کی شام کو دو تین روز کے لیے اپنی موٹر کار سے یہاں آجاتے تھے۔ برلا کالونی کوئی دس منٹ چل کر راستے میں تھی۔ یہ مکان بھی اس کالونی کا حصہ تھے۔ چاروں طرف ہرے بھرے کھیت تھے۔ نیچے کی طرف ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ سارا دن ہلکی ہلکی ہوا چلتی تھی اور رات کو قدرے ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ بجلی کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے نہ تو ریڈیو تھا اور نہ ہی رات کو پڑھنے کا انتظام اس لیے دن بھر پڑھنے اور لکھنے کے لیے بہت وقت ہوتا تھا۔

طبیعت بحال ہوتے ہی ایک روز میں کالونی تک جا پہنچا۔ اسکول کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس عمارت میں اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے رہنے کا انتظام بھی تھا۔ عمارت میں کافی گہما گہمی رہتی تھی۔ یہ گہما گہمی اس لیے تھی کہ اسکول میں استادوں بلکہ عملہ کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ میری ہمشیرہ کو بھی یہاں پڑھانے کا کام مل گیا تھا۔ اسکول کے پرنسپل مسٹر پنڈت اپنے کشمیر کے ہی تھے۔ ان کے چھوٹے بہن بھائی اور ماں بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے!

ایک روز شام کو بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے ان کے چھوٹے بھائی نے جو میری عمر کے تھے اور میرے دوست بن گئے تھے، میرا اپنے ایک اور بھائی سے تعارف کرایا۔ بھوشن جی! وہ بمبئی میں رہتے تھے۔ انھیں فلموں سے بے حد دلچسپی تھی بلکہ وہ فلموں میں لکھنے کی بہت کوشش کر رہے تھے جب ان کے چھوٹے بھائی نے انھیں بتایا کہ میں بلراج جی کو اچھی طرح جانتا ہوں تو کہنے لگے "یار! پھر ان سے تعارف ہو جائے۔"

شام کو پنگ پانگ اور بیڈمنٹن کے کھیلوں میں ہم لوگ اکثر حصہ لیتے اور پھر کھیتوں میں دوڑ دوڑ کر جھیل تک جاتے۔ میری طرح انھیں بھی اس بات کا یقین تھا کہ ایک روز بلراج ساہنی ہندستان کی فلمی صنعت پر چھا جائیں گے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ راماند ساگر انھیں "بازو بند" میں پارٹ دے رہے ہیں، کہنے لگے "تو آپ ساگر صاحب کو بھی جانتے ہیں؟ —— میرا بھی ان لوگوں سے تعارف ضرور ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "بلراج ساہنی اور راماند ساگر کی ملاقات بھی میری بدولت سری نگر میں ہوئی تھی —— میں اگلے ہفتے بمبئی جا رہا ہوں، بتائیے کہاں ملاقات کا انتظام ہو؟"

بھوشن جی، طویل قد، بھرا ہوا جسم، کشادہ کندھے، گندمی رنگ، گھونگریالے بال، ہالی وڈ کے مشہور اداکار کلارک گیبل کی سی مونچھیں —— جن کی پتلون کی کریز میں بھی وہی سلیقہ تھا جو ان کی مونچھوں کی بناوٹ میں۔

بہت پیاری اردو بولتے تھے، بڑی خوبصورت آواز تھی۔ میں نے سوچا اس شخص کو ایکٹر بننے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے، لیکن پھر ہماری فلم انڈسٹری کے آداب و اطوار ہی کچھ اور ہیں۔ ایک روز میں نے ان سے یوں ہی کہا "اگر آپ کو فلم میں ہیرو کا پارٹ مل گیا تو یہ بھوشن نام کچھ جچ نہیں رہا، آپ نے کوئی اور نام سوچا ہے؟"

ایک لمحہ خاموش رہے پھر بولے "جی ہاں، راجکمار کیسا رہے گا؟"

اب میں بمبئی جانے کے لیے بے تاب تھا۔ تین ہفتے کے آرام کے بعد ڈاکٹر نے سفر کرنے کی اجازت دے ہی دی۔ میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچا تو انھوں نے بتایا کہ میرے امریکہ میں رہنے والے چچا صاحب بڑی بے تابی سے میرا وہاں انتظار کر رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے بھی وہیں تھے اور کام بڑھنے کی وجہ سے انھیں میری مدد کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے والد صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ ان کے دفتر

میں ہر روز منیجر کے بیے کام کرکے کچھ تجربہ حاصل کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہوا
مہینوں میں کچھ ہفتے کام کرنے کا پلان ملتوی کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک روز مرزا جی آفاق
صاحب کے گھر پر فون ملایا تو خوش قسمتی سے وہ گھر پر تھے۔ بولے "یار کل ہی تو
زمانہ ہوا ملاقات نہیں ہوئی۔ اس اتوار کو آجاؤ"۔

میں نے انھیں بتایا کہ اس اتوار کو میں مصروف ہوں۔ کہنے لگے "اگلے
کو میرے کچھ مہمان دہلی سے یہاں آرہے ہیں۔ مجھے بمبئی سنٹرل انھیں لینے جانا ہے
دوپہر کو چرچ گیٹ آرہا ہوں، پیرسن ڈیری میں مل جاؤ۔ دو چار گھنٹے ادھر اُدھر
گھوما جائے۔ تم شام تک میرے ساتھ رہو، پانچ بجے کی گاڑی سے یہ لوگ آرہے ہیں"
مجھے ان کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اگلے سوموار کو ملنے کا پروگرام طے ہو گیا
مجھے پیرسین ڈیری میں زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑا۔ انھوں نے دو بجے
کا وقت دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دوپہر کا پروگرام بنا لیا تھا۔ پیرسین ڈیری
میں ایک آدھ چائے پینے کے بعد جہانگیر آرٹ گیلری اور پھر وہاں سے ریگل سینما
امریکی فلم دیکھنے کا پروگرام تھا۔

میں نے انھیں اپنا پروگرام بتایا تو کہنے لگے "زمانہ ہوا گیلری میں گئے ہوئے
بڑا نیک خیال ہے۔ آج فلم کا پروگرام رہنے دو، دیر ہو جائے گی۔ ہاں گیلری کے قریب
سمینا ریستوران ہے، ساؤتھ انڈیا کا بہترین کھانا ملتا ہے، بڑے اچھے سنیک
بھی ہوتے ہیں وہ اکثر مصوروں کی نمائش بھی کرتے ہیں، سنا ہے بہترین جگہ ہے"۔
میں نے ان کی بات مان لی کہ فلم کا پروگرام پھر کسی اور روز بنائیں گے۔ آرٹ
گیلری ہو آئیں تو میں نے صلاح دی جہانگیر آرٹ گیلری کے بعد سمینا پر بھی ایک نظر ڈالتے
چلیں۔ ساؤتھ انڈیا کے سنیک SNACKS کے لیے پوری بندرگاہ کے اسٹیشن کے ریستوران
کا جواب نہیں، بڑی صاف ستھری جگہ ہے، اسٹیشن تو تمہیں جانا ہی ہے وہاں آرام
سے ایک دو گھنٹے ٹھہر سکتے ہیں وہیں گپ بازی بھی ہوتی رہے گی"۔
وہ مان گئے۔

پرسین ڈیری میں ہم لوگ ایک گھنٹہ بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بیشتر ہی جلد ہی دہلی لوٹ جائیں گے۔ بغیر کام کے یہاں بمبئی جیسے شہر میں رہنا ممکن نہیں علاوہ تھیٹر کے کسی آدمی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ان کی اپنی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ بچوں کو پردیس میں پڑھانے کے بہت خرچے ہیں۔ پھر انھوں نے کلام سے موضوع بدل دیا "ہاں تو تم امریکہ کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہو؟ وہاں کیا کام کرو گے؟ واپس لوٹنے میں شادی خانہ آبادی۔"

میں نے کہا "آپ بھی بالکل میری اُن بھی کی طرح بات کر رہے ہیں جن کے ہاں میں باندرہ میں رہتا ہوں۔ اُن کا بس چلے تو میری آج ہی شادی کر دیں، انھیں ڈر ہے کہ امریکہ میں کوئی امریکن لڑکی مجھے پھانس لے گی اور پھر اگر شادی کر بھی لوں تو امریکہ میں رہنا ہے چاچا صاحب کا فلیٹ بہت بڑا نہیں۔ ان کے لڑکے بھی ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں حالانکہ ان کے بیوی بچے یہیں رہتے ہیں لیکن شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں، اور یہ بھی ٹھیک نہیں کہ اس بیچاری لڑکی کو دو چار برس کے لیے اکیلے یہاں چھوڑ دیا جائے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو؛ وہ ہنس کر بولے "ویسے یار کوئی تمہاری نظر میں تو ضرور ہوگی؟"

میرے جواب دینے سے پہلے خود ہی بول اٹھے "شادی نہ سہی لیکن سگائی وغیرہ کرنے میں تو کوئی ہرج نہیں، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، لڑکیاں بمبئی میں بھی بہت ہیں۔"

ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر باہر آئے تو پہلے تو انھوں نے ایک ٹیکسی کو روکنے کی کوشش کی۔ پھر کہنے لگے کہ آج اتنی زیادہ گرمی نہیں، چرچ گیٹ تک تو سڑک کی اس طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ پھر ایراس EROS سینما سے ایک باغ سے بھی گزرنے کا راستہ تھا۔ کالا گھوڑا کے بت کے سامنے ہی تو جہانگیر آرٹ گیلری تھی، ہم نے پیدل چل کر جانے کا فیصلہ کیا۔

گیلری میں کافی لوگ تھے۔ یہ محض بیکار نوجوان نہیں تھے بلکہ اکثر اچھی عمر کے لوگ تھے۔ میں نے کہا "لگتا ہے بمبئی میں جیسے سب عمر کے لوگوں کو تصویر کشی کے فن میں دلچسپی ہے اور پھر اکثر متوسط گھرانے کے لوگ ہیں۔ یہ قیمتی تصویریں خریدنے کے لیے یہاں صرف مالدار ہی آسکتے ہیں"۔

وہ بولے "میں مغلیہ زمانے کی مثال دے سکتا ہوں۔ اکبر اور شاہ جہاں شاید ہماری تواریخ میں سب سے بڑے فن اور موسیقی کے سرپرست تھے لیکن ادب اور آرٹ کو مالدار اور حکومت کی اتنی سرپرستی کی ضرورت نہیں، جتنی عوام کی ہے۔ اگر زندگی کے حالات مناسب ہوں اور آرٹسٹ روزی کمانے کی فکر نہ ہو تو سماج کے ہر فرد میں نہ صرف ایسی نمائشوں میں یہ تصویریں رکھنے کی خواہش بلکہ انھیں خریدنے کی اہلیت بھی ہوگی۔ روس میں دیکھیے کیا ہو رہا ہے عوامی آرٹ اور عوامی سرپرستی"۔

ایک تصویر دیکھ کر وہ رک گئے اور پھر بولے "یہ کانگڑا کی تصویر ہے ـــــ بے حد خوبصورت ہے۔ لیکن آرٹ کو صرف قدرتی خوبصورتی تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے مجھے کشمیر کی قدرتی خوبصورتی کا خیال آ رہا ہے۔ وہاں کی جھیلیں، آبشار، باغات، پہاڑ، فن کار کے لیے یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ لیکن اس پس منظر کے سامنے غربت ہے، بیکاری ہے، بھوک ہے، بے بسی ہے ـــــ ڈوگرہ آرٹ کی ایک بہت اچھی روایت چلی آ رہی ہے۔ کشمیری آرٹ کب تک اس کا انتظار کرے گا؟"

میں نے انھیں بتایا کہ "ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ اب مصوری کی ایک نئی پود کا جنم ہو رہا ہے۔ اس میں بک، کاچرو اور کول بہت نمایاں ہیں ان کے گھروں میں رنگارنگی اور زندگی کی لگن ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ان مصوروں کی تصویریں بھی ایسی ہی گیلریوں میں دکھائے جانے کے قابل ہوں گی بلکہ انھیں آج بھی اس نمائش میں حصہ لینا چاہیے"۔

یہ سن کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کشمیر کے

ان مضمونوں کے مرحلی مستقبل میں خود ان کی ذاتی اُمنگوں کا دخل ہے۔

جب ہم دونوں ہما گیر آرٹ گیلری سے باہر آئے تو ابھی گاڑی کے آنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا ہمیں کہنے لگے اگر آپ چاہیں تو ہمیں چائے پی لی جائے۔

وہیں ملنے تم نے آج بوری بندر کے ریستوران کے بے کہا ہے تو آج کافی وہیں پی جائے گی۔ وقت کافی ہے گرمی زیادہ نہیں۔ پیدل چلتے ہیں۔"

ہم سوچ ہی رہے تھے کہ خوش قسمتی سے بوری بندر کی بس آگئی۔ ہم دونوں اُس میں سوار ہو گئے۔

ریلوے اسٹیشن کا ریستوران حسب معمول لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمیں کھڑکی کے قریب ہی ایک میز پر جگہ مل گئی۔ یہاں سے سب پلیٹ فارم نظر آ رہے تھے اور وہ بورڈ بھی بالکل سامنے تھا جہاں آنے اور جانے والی گاڑیوں کے وقت دیے جا رہے تھے۔ انھوں نے کافی اور میں نے چائے منگوائی، ساتھ میں سموسے اور کوچین کا ایک خاص سیک

-- اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بلراج جی ریستوران کی سروس اور کوالٹی سے بے حد متاثر تھے۔ کہنے لگے "ایک روز اپنے ان مہمانوں کو بھی یہاں لانا پڑے گا۔ آپ بھی شرکت کیجیے گا۔"

-- میں نے ان مہمانوں کے بارے میں پوچھنا چاہا تو انھوں نے صرف ایک قہقہے سے اس کا جواب دیا۔

جب تک دہلی سے آنے والی گاڑی کا اعلان ہوا تو چائے اور کافی کے دو دور چل چکے تھے۔ بل آیا تو انھوں نے ویٹر کے ہاتھ سے لے لیا۔

میں نے کہا "اس ریستوران کی دعوت میں نے آپ کو دی تھی مجھے یہ بل ادا کرنے دیجیے بلراج جی!"

ویٹر کے ہاتھ میں بل کے پیسے دیتے ہوئے وہ مجھ سے بولے "بہتر (برخوردار) جب امریکہ سے بڑے صاحب بن کر آؤ گے تو پھر تمھیں ہی بل دینے کے لیے کہوں گا"

تن تم صرف خاموش رہو، آج بزرگوں کو اس خدمت کا موقع دو۔"
"بزرگ۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں تو سوچتا تھا کہ ہم دونوں جوان ہیں یہ بزرگی کہاں سے آگئی؟"
اس وقت انھوں نے پہلی بار مجھے "تم" کہہ کر پکارا تھا۔

جب ہم پلیٹ فارم پر آئے تو گاڑی اندر داخل ہو چکی تھی۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ تیسرے کلاس کے قریب ہی کھڑے رہیں۔ لیکن انھوں نے یکدم سے آگے تیزی سے بڑھنا شروع کر دیا۔ پلیٹ فارم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بلراج جی کی نظریں گاڑی کے ہر کمپارٹمنٹ میں جیسے اپنے "مہمانوں" کو باہر ہی باہر سے ڈھونڈنے کی کوشش میں تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا کہ یہ سب لوگ اس گاڑی کے دوبارہ روانہ ہونے پر کہیں جا رہے ہیں یا اپنے مہمانوں کا استقبال کرنے آئے ہیں۔ ہمارے ریلوے اسٹیشنوں کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ پلیٹ فارم پر اکثر لوگ تماش بین ہوتے ہیں یا ایک مہمان کو لینے کے لیے سارا کنبہ چلا آتا ہے۔ یہ روایت شاید اس زمانے سے چلی آ رہی ہے جب ریلوے انجن اور گاڑیوں کو دیکھنے کے لیے نہ صرف بچے بلکہ ہر عمر کے لوگوں کو اشتیاق تھا۔
میں ابھی اس طرز زندگی کے بارے میں اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا کہ سامنے سے زور زور کی آواز سنائی دی "ماما جی، ماما جی۔"
اور دیکھتے ہی دیکھتے دو نوجوان خواتین بلراج جی کے قریب آ پہنچیں۔
بلراج جی آگے بڑھے اور تینوں بغلگیر ہو گئے۔ یکایک مجھے خیال آیا۔ ارے یہ تو ان کی بھانجیاں اوشی اور پرسا ہیں۔ میرا سر چکرا گیا۔ "ہیلو ہیلو" کے الفاظ جیسے میرے ہونٹوں پر منجمد ہو گئے۔ بلراج جی زور زور سے قہقہہ لگا کر کہہ رہے تھے "جیسی میرے مہمانوں سے ملوائیے، ارے آپ تو ایک دوسرے کو جانتے ہی ہیں؟"
بلراج جی کی آنکھوں میں جس شرارت کی چمک تھی اب میں اس سے بخوبی

واقف ہو چکا تھا۔

میرے نیویارک کے سفر کے لیے اب ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ میں کسی سے ملنا بھی اتنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک روز صبح کی ڈاک کھولی تو ایک خط دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہ خط بلراج جی کی سجیلی بھابی پربھا کا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ بلراج جی شکایت کر رہے ہیں کہ آپ کو جو ہو آئے زمانہ ہو چکا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اب آپ کا امریکہ جانے کا پروگرام بن چکا ہوگا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اگلے اتوار ضرور آئیے وہ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

ضروری باتیں؟

خیر اگلے ہفتے میں نے باندرہ جانے کا پروگرام بنا ہی لیا اور اس اتوار کو ان کے "دعوت نامے" کے مطابق لنچ پر پہنچ ہی گیا۔ گھر پر پہلے ایسا لگا جیسے صرف نوکری ہے۔ کسی نے میرا "خیر مقدم" نہیں کیا، لیکن اتنے میں پربھا برآمدے میں آگئی اور بولی "ماما جی اور ادشی سمندر میں ایک آدھ غوطہ لگانے گئے ہوئے ہیں، بس آنے ہی والے ہوں گے، آپ ڈرائنگ روم میں ہی آجائیے۔ میں کچن میں نوکر کی کھانے میں مدد کر رہی ہوں، یوں سمجھیں آج آپ بھوکے ہی رہیں گے، کافی بھجواؤں آپ کے لیے یا کچھ ٹھنڈا پئیں گے؟"

میں نے لسی کی فرمائش کی۔

لسی آگئی اور اس کے ساتھ ہی بلراج جی اور ادشی بھی۔

کھانے کی میز پر جیسے لنچ تیار ہی تھا۔ لنچ کی میز پر کچھ زیادہ باتیں نہیں ہوئیں وہ دونوں بہنیں بس چند ہفتوں کے لیے آئی تھیں پھر دہلی واپس جا رہی تھیں۔ کالج میں وہاں داخلہ تھا۔ بلراج جی جھکے ہوئے لگ رہے تھے ——— ادشی حسب معمول چہک رہی تھیں۔

"ضروری باتیں!" میرا ذہن بار بار جیسے اس بات کو دہرا رہا تھا۔ کھانے

کے بعد بلراج جی اٹھ کھڑے ہوئے: "آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ دوپہر کو دو تین گھنٹے
مجھے سونے کی کتنی بُری عادت پڑی ہوئی ہے، لیکن آج مجھے اس عادت کو بھی
توڑنا ہی پڑے گا۔ ایک کم بخت پروڈیوسر نے آج اتوار کی دوپہر کو ہی ملنے کو کہا
ہے۔ کنول! تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "بلراج جی! اس میں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں، میں بھی
آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

پہلے وہ نہیں مانے، پھر کہنے لگے "کوئی بات نہیں، لوکل ٹرین سے ہی چلیں
گے، راستے میں کچھ گپ بازی ہوتی رہے گی۔"

میں راستے میں باندرہ اُتر گیا، وہ دادر کسی فلم اسٹوڈیو جا رہے تھے ——
راستے میں کوئی ضروری باتیں نہیں ہوئیں۔

اگلے روز جب میں اپنے کاروباری دفتر کام کے لیے گیا تو میرے چھوٹے چا
جی اس وقت یہ آفس سنبھال رہے تھے۔ کہنے لگے "ابھی ابھی ایک خاتون کا فون
تھا، فون نمبر لیا ہے لیکن نام نہیں بتایا، کہہ رہی تھیں آپ سمجھ جائیں گے"۔
یہ بلراج جی کے گھر کا فون نمبر تھا۔ میں نے ایکدم سے فون کیا اور بلراج جی کو
پر آنے کی گذارش کی تو وہ شی فون پر آئیں، کہنے لگے "افسوس ہے کل آپ
جلدی جانا پڑا۔ بلراج جی کہہ رہے تھے کہ ایک روز دوپہر کو آپ ہمیں چرچ گیٹ
مل جائیں۔ ہم چاروں ایروس پر انگریزی فلم دیکھیں گے اور پھر پرسین ڈیری
جیتا میں چائے وغیرہ پی جائے گی۔"

دوسرے روز کا پروگرام طے ہو گیا۔

دوپہر کے تین بجے ان لوگوں سے چرچ گیٹ اسٹیشن پر ملنا تھا۔ یہاں لوکل
ٹرین ہر پانچ دس منٹ میں آتی رہتی ہے اس لیے یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کون
گاڑی سے آئیں گے۔ میں وہاں پونے تین بجے پہنچ گیا اور بورڈ پر سامنا کر کے وہ
آنے والی ہر گاڑی سے اُترنے والے مسافروں پر میری نظر تھی۔

سوا تین بجے تک ان لوگوں کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ میں پلیٹ فارم کے گیٹ کے بالکل قریب ہی کھڑا تھا اس لیے وہ لوگ میری نظروں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے میں نے سوچا ساڑھے تین بجے تک انتظار کروں گا۔ اگر وہ لوگ نہیں آئے تو پھر پرسین لائبریری کیفے کی طرف آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دوں گا۔

اگلی گاڑی جب آئی تو اترنے والوں میں میں نے پربھا کو دیکھا کہ وہ اکیلی تھی۔ انھوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور جلدی جلدی وہ پلیٹ فارم سے باہر آئیں آتے ہی بولیں "سوری ——— بلراج جی اور اوشی کچھ دیر سے آئیں گے۔ بلراج جی اوشی کو چھوٹے کیبن اوپر لے کر جانا تھا۔ وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ ہم دونوں سامنے ایرانی ریستوراں میں ان کا انتظار کریں۔ اگر انھیں پھر بھی دیر ہو گئی تو سیدھے ایروس سینما پہنچ آئیں ماں کے کیفے میں ان کا انتظار کرنے کو کہا ہے۔"

ایرانی کیفے میں ہم لوگ کوئی پون گھنٹے انتظار کرتے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں "دینو (دمینتی ساہنی) کی وفات کے بعد انھیں اگرچہ دونوں بچوں کی بے حد فکر تھی۔ ایسے ہی جب پربھا کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ چاروں بہن بھائی بلراج جی کے بہت قریب آ گئے تھے۔ وہ ان سب کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "انھیں تو ساری دنیا سے پیار ہے۔"

کہنے لگیں "آپ کو معلوم نہیں وہ آپ کی کتنی تعریف کرتے ہیں ——— وہ کہتے ہیں آپ اچھے ادیب ہیں کم عمر ہیں، دیکھنے میں اچھے ہیں، کوئی امریکی لڑکی آپ کو پھنسا لے گی، کیا یہ سچ ہے؟"

میرے پاس ایسے معصوم سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ہم لوگوں نے ایروس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک "اجنبی عورت کا خط" دکھائی جا رہی تھی۔ جون ——— ایک بڑی اچھی اداکارہ تھیں۔ میں خوش تھا کہ ہمیں یہ فلم دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہم سینما کے ریستوران میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتے رہے۔

[illegible]

بلراج جی اتفاق سے کالا بھی تک کوئی نام و نشان نہیں تھا [illegible]

مجھے بلراج جی کی حیثیت پر شک ہو رہا تھا [illegible]

امریکہ میں کوئی لڑکی بھی پھنسا لے گی ـــــ میرا دل ہی دل میں ان کے
س خیال پر ہنس رہا تھا۔

جون کے پہلے ہفتے میں میرا جہاز بوسٹن کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میرے
اندرہ والے رشتہ دار، میرے والدین، میری بہنیں اور کچھ اور لوگ مجھے الوداع
کہنے آئے۔ میری نظریں بلراج جی کو ڈھونڈتی رہیں ـــــ وہ نہیں آئے۔

جہاز کراچی، عدن، پورٹ سعید اور بارسلونا (اسپین) میں کچھ روز رکتا
ہوا تقریباً ایک مہینے کے بعد بوسٹن پہنچا۔ جہاز پر کئی دلچسپ لوگوں سے ملاقات
ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب PASGENLTER BOAT میں جگہ ملنا بہت مشکل تھا۔ مہینوں
انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہ کارگو جہاز تھا .... جس میں تقریباً بیس لوگ مسافر تھے
بارسلونا میں تین روز رہنے پر وہاں لکھنے کے لیے کافی مواد مل گیا تھا۔

بوسٹن سے ریل گاڑی سے نیویارک کا سفر تھا۔

نیویارک پہنچتے ہی میں کام پر لگ گیا۔ ہندوستان اور وہاں کے لوگ
جیسے اب کسی اور دنیا میں چلے گئے تھے۔ یہ دنیا ہی کوئی اور تھی۔ بڑی بڑی عمارتوں
SCBYSAFERS اور رنگ برنگی روشنیوں NEM LIGHT کی دنیا تھی۔ ایک ہفتہ
نیویارک کے دفتر میں کام کرنے کے بعد میں امریکہ کے مشرقی ساحل EAST
COAST کی ریاستوں کے دورے پر روانہ ہوا۔ یہ سفر مجھے جنوبی لوئیسیانا
کی ریاست ٹیکساس تک لے گیا۔

اس امریکی طرز زندگی میں کافی تضاد اور امتیاز تھا۔ ایک طرف نئی زندگی
کی چکاچوند اور دوسری طرف رجعت پسندانہ عناصر کا غلبہ ـــــ ایک طرف
بڑے بڑے شہر [illegible] اور دوسری طرف

کالے لوگوں کی نفرت اور بے بسی۔

اب کوریا کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ امریکہ میں ایسے بھی لوگ تھے جو جاپان کی طرح کوریا پر بھی ایٹم بم گرانے کے حق میں تھے تاکہ اس لڑائی کو جلد سے جلد ختم کر دیا جائے۔ یہ وہ لوگ تھے جو میک ارتھی ازم ________ کی پورہ حمایت کر رہے تھے۔ یہ لوگ کتاب گھروں اور یونی ورسٹیوں میں ترقی پسند کتابیں پھاڑ کر پھینک رہے تھے یا انھیں جلا رہے تھے

امریکنو ں کا ہے کا ، جنوبی ریاستوں سے اکثر بلند ہوتا تھا۔ ان امریکیوں میں کالے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ بھی تو رہے تھے جیسی TEXAS کی ریاست میں جگہ جگہ صرف سفید لوگوں کے لیے *کے نوٹس دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ غیر امریکی سرگرمیوں کے قانون کی آڑ لے کر ہر چھوٹے بڑے شخص کو عدالتوں میں حاضری دینا پڑ رہی تھی۔ ہاورڈ فاسٹ جیسے عظیم ترقی پسند مصنف کو سولی پر چڑھانے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ ہالی وڈ کے مشہور نغمہ نواز پال رابسن اور دنیا کو اپنی مزاحیہ اداکاری سے ہنسانے والے اداکار چارلی چیپلن کو امریکہ چھوڑنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔

ایسے ماحول میں چاروں طرف گھٹن اور تاریکی کے احساس کے باوجود کبھی کبھی اس روشنی کی ہلکی سی چمک بھی نظر آ جاتی تھی جو یورپ کے فلمی اور دوسرے فن کار اپنی تخلیقات میں نمایاں کر رہے تھے۔ ان میں اٹلی کے قلم کار رابرٹو روسی سب سے آگے آگے تھے۔ ان کی فلمیں سائیکل چور BICYCLE THIEF ، جرمنی زیرو ائیر GERMANY — ZERO YEA جنگ کے بعد زندگی کی تباہی کے ساتھ ساتھ ایک نئے مستقبل کی امید بھی دلا رہی تھیں۔ نیو یارک کے سینما گھروں کے باہر لمبے لمبے کیو دیکھ کر یہ چیز ذہن میں بند ہی تھی کہ ترقی پسند تحریک ابھی زندہ ہے اور اس میں آگے بڑھنے کی اہلیت بھی ہے۔

A letter from an unknown Woman

اور پھر ایک سوشل جلسے میں مجھے دو مشہور امریکی مصنفوں سے ملنے کا موقع ملا
یک تو تھیں محترمہ پرل بک PEARL BUCK جیسوں نے معروف زندگی کا بیشتر حصہ
ین میں گزارا تھا بلکہ چین کے بارے میں انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ان
ں سب سے زیادہ نامور شاید "اچھی زمین" GOOD EARTH ہے حالانکہ اس وقت
ین میں سیاسی حالات بدل رہے تھے۔ ماؤزے تنگ اب ایک نئی جدوجہد کا
رچم لہرا رہے تھے۔ لیکن فاشزم کے خلاف اور خاص طور سے جاپان کی سامراجیت
ے خلاف پچھلی بڑی جنگ میں تیک کائی شیک کے جمہوریت کو برقرار رکھنے میں بڑی
ت سے کام لیا تھا اور تواریخی لحاظ سے یہ ایک ترقی پسند قدم تھا۔
دوسرے ادیب جن سے میرا بہت مختصر سا تعارف ہوا وہ جان اشٹین بیک
... تھے جن کی کتاب "... EARTH" کی دھوم دنیا کے ہر ترقی پسند
ی حلقے تک پہنچ چکی تھی۔ وہ بھی دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح امریکہ کے
عت پسندانہ اقدام کا شکار رہتے۔
ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے بھوپال کے معیاری جریدے "افکار" میں
۔ ایک افسانہ "فرار" چھپا تھا صہبا لکھنوی نے اس کی تعریف کی تھی اور مجھے اور افسانے
ے کو کہا تھا میں نے انھیں امریکہ سے ایک خط لکھا تھا ایک طرح کا ادبی خط
اں امریکی حالات کے بارے میں ــــ یہ خط انھوں نے شائع کیا اور مجھے
"افکار" کا وہ پرچہ امریکہ بھیجا۔
میں نے بلراج جی کو بھی کچھ ایسا ہی ایک خط لکھا تھا لیکن انھوں نے جواب
نہیں دیا۔
میرا امریکہ میں دو سال رہنے کا پروگرام تھا۔ لیکن سال بھر کے بعد ہی مجھے
ہندوستان واپس لوٹنا پڑا۔ ایک تو ہندوستان میں مجھے اپنے کاروبار کی کچھ جانچ
پڑتال کرنا تھی۔ دوسرے میرے سال بھر کے پرمٹ کو امریکی حکومت نے کچھ
مدت بڑھانے سے انکار کر دیا۔

فیصلہ چونکہ کچھ عرصہ ہندستان رہ کر پھر امریکہ واپس آنے کی کوشش کی جائے۔

فروری ۱۹۴۹ء کے آخر میں میرا جہاز بمبئی پہنچا۔
اس عرصے میں میرے والدین کشمیر چلے گئے تھے۔ سرینگر کے دوستوں کی خطا
کتابت سے پتہ چلا کہ چترنجن چوہدری صاحب اپنے بھائی راما نند ساگر کے فلمی کام میں
ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور بمبئی کے ایک علاقے ماٹنگا MATUNGA میں سائوں
نے ایک بہت بڑا فلیٹ خرید لیا ہے اور وہ سب وہیں رہ رہے ہیں۔
بمبئی پہنچتے ہی میں بطراج جی اور ان دوسرے لوگوں سے ملنے کے لیے بیتاب
تھا دو تین ہفتے میں ہی مجھے والدین کے پاس کشمیر جانا تھا۔ اس لیے بمبئی میں میرے
پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔
باندرہ میں کچھ روز آرام کرنے کے بعد ایک اتوار کی دوپہر کو میں جوہو پہنچ ہی
گیا۔ میں نے فون پر وقت مقرر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے بھانجے نے بتایا کہ
وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ حسب معمول وہ اتوار کو ضرور گھر پر ہی
ہوتے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ ابھی دوپہر کا "شرام" کر رہے تھے۔ نوکر نے باہر
برآمدے میں بیٹھنے کے لیے کہا اور ساتھ میں چائے بھی آگئی۔ لگتا ہے انھیں میرے
آنے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آگئے۔
"کمال ہے بھئی، تم آگئے اور آنے کی خبر تک نہیں دی" ان کی اس شکایت
میں خلوص بھی تھا اور محبت بھی۔ گلے سے لگا کر ملے۔ سمندر میں نہانے کے کاسٹیوم
میں ہی تھے۔ نوکر کو اندر سے قمیض لانے کے لیے کہا۔ پتلون کی شاید انھیں اس
دوپہر کو ضرورت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔
———— "آج سمندر سے نہانے کے بعد اتنی سستی غائب ہوگئی
تو کھانا کھانے میں وہیں ڈائننگ روم میں ہی کوچ پر لیٹ گیا۔ وہ بولے" بھئی
معذرت چاہتا ہوں کہ تمہارے خط کا جواب نہیں دیا ———— تو تمھیں وہاں زیادہ

دن رہنے کی اجازت نہیں ملی؟"

پھر انھوں نے امریکہ کے سماجی اور سیاسی حالت کے بارے میں سوالات پوچھنا شروع کر دیے۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ خود کہہ رہے تھے :

"تمہیں امریکی سرکار کی وہ سب خبریں مل رہی تھیں، خاص طور پر غیر امریکی سرگرمیاں" یعنی UN-AMERICAN ACTIVITIES کی آڑ لے کر ہر طرح کے فن کار کو پھنسا کیا جا رہا ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس روس نے پچھلی جنگ عظیم میں لاکھ انسانوں کی قربانی دے کر جمہوریت، امن اور زندگی کی ترقی پسند قدروں کو برقرار رکھنے کی تنہا کوشش کی ہے۔ اب اسی روس کا ہٹلر کے جرمنی سے مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ مرد ہنے پر روز ویلٹ نے جس NEW DEAL کا امریکی عوام سے وعدہ کیا تھا موجودہ حکومت اس کی دھجیاں اڑا رہی ہے"

ان کی یہ باتیں سن کر مجھے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ یہ انسان نہ صرف ادب اور آرٹ کی نئی اور ترقی پسند قدروں کا پرستار ہے بلکہ اس کی رگوں میں ساری انسانیت سے دوستی کا خون بھی دوڑ رہا ہے۔

گھر میں بالکل خاموشی تھی۔ کہنے لگے " دونوں بچے اب شملہ (سادر) ہیں، ماں جی بھی چلی گئیں، اوشی اور پربھا دہلی میں ہیں، اوشی باندرے میں ہی رہ رہی ہے، ان کے ایک بچی بھی ہوئی ہے۔ بھیشم اب امرتسر کے ایک کالج میں پڑھا رہے ہیں"

میں نے انھیں بتایا کہ" میں کشمیر جاتے ہوئے امرتسر ایک دو دن رکوں گا" (خوش) ہو کر بولے " ارے یہ تو بڑی اچھی بات ہے، اُن سے ضرور ملنا۔ بس کہنا سب خیریت ہے، انھیں میری فکر ہے کہ میری زندگی اب بالکل اکیلی ہو گئی ہے"

اس اکیلے پن کے باوجود ان کے چہرے پر کافی رونق تھی، جسم پہلے سے کچھ بھر گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ " خواجہ احمد عباس اور دوسرے فلمی دوستوں نے فلموں میں کام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ انھوں نے رامانند ساگر کی فلم " بازوبند" کا بھی ذکر کیا۔ چھوٹے بھائی چترنجن سے وہ اسٹوڈیو میں ملے تھے"

میں نے کہا "کشمیر جانے سے پہلے میں چترنجن سے خود ملنا چاہتا ہوں، لیکن کچھ اتا پتہ نہیں ہے۔" انھوں نے اسٹوڈیو فون کرنے کا مشورہ دیا۔

اس روز میں وہاں زیادہ نہیں رُکا۔

دوسرے روز میں فورٹ کے دفتر سے کام ختم کرنے انڈیا کافی ہاؤس گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ چترمعن وہاں اکثر جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ کچھ دیر ہوگئی وہ یہاں سے پیرسین ڈیری کے لیے روانہ ہوئے تھے وہاں کسی دوست سے ملنے کا پروگرام تھا ـــــ میں کافی ہاؤس نہیں رکا اور سیدھا چرچ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

خوش قسمتی سے چترمعن ایک صاحب کے ساتھ پیرسین ڈیری میں چائے نوش فرما رہے تھے۔ جب انھوں نے مجھے دیکھا تو بڑھ کر ملے تو اپنے دوست سے تعارف کراتے ہوئے بولے "یہ مدن موہن ہیں، فلموں میں میوزک ڈائریکٹ کرتے ہیں۔ ان کی موسیقی کی چاروں طرف دھوم ہے اور آنے والے دنوں میں یہ سنگیت کی دنیا پر چھا جائیں گے۔"

پھر میرا تعارف کرایا "بہت قریبی دوست ہیں، بڑے اچھے افسانے لکھتے ہیں، ابھی یورپ اور امریکہ کا دورہ کرکے ہندستان واپس لوٹے ہیں۔"

مدن موہن کو اسٹوڈیو جانا تھا، وہ کچھ دیر بعد چلے گئے۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ ایک صاحب نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ارے یار، امریکہ سے کب واپس آئے؟"

میں نے پیچھے مڑکر دیکھا کہ پولیس کی وردی میں ملبوس، بھوشن پنڈت کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

"تو جناب آپ پھر ایکٹر بن ہی گئے،" میں نے انھیں قریب کی کرسی پر بیٹھے کو کہا "تو آپ سیدھے اسٹوڈیو سے آرہے ہیں، کسی پولیس آفیسر کا پارٹ کررہے ہیں" راجکمار صاحب؟"

بھوشن پنڈت نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "فلموں میں تو ابھی نہیں لیکن زندگی

کے اسٹیج پر حالات نے ایک پولیس انسپکٹر کا پارٹ ادا کرنے کو کہا ہے، دیکھیے یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے:

وہ جانے کے لیے نہیں رکے۔ ان کی جیپ کیفے کے قریب کھڑی تھی۔ ایک سپاہی نے اندر آکر کہا "جناب، آپ کو دادر جانا ہے، ہمیں دیر ہو رہی ہے:"

وہ جلدی میں رخصت ہوتے ہوئے بولے "کنول! تم نے ابھی تک اپنے دوست بلراج ساہنی سے نہیں ملایا:"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ باہر جیپ میں بیٹھ کر ہوا ہوگئے۔

امرتسر میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی مجھے ایک ہوٹل میں کمرہ مل گیا دوسرے روز صبح ہوائی جہاز سے سرینگر روانہ ہونا تھا۔ اس لیے وہ ساری دوپہر اور شام کا وقت ملنے جلنے کے لیے کافی تھا۔ ایک ادر صاحب سے ملنا تھا، وہ نہیں ملے۔ دوپہر کو بلراج جی کے دیئے ہوئے پتے پر بھیشم جی سے ملنے گیا۔ ایک خاتون نے دروازہ کھول کر بتایا کہ وہ ابھی کالج سے نہیں لوٹے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ان کی عارضی رہائش ہے۔ شیلا جی ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ میں نے اپنے ہوٹل کا پتہ اور فون نمبر اس خاتون کو دیا اور گذارش کی کہ بھیشم جی کو میرا یہ پیغام ضرور پہنچا دیں۔

شام کو، بجے کے وقت بھیشم جی کا فون آیا اور وہ رات کے کھانے پر میرے ہوٹل پر آنے کے لیے تیار ہوگئے۔

یہ شام بڑی دلچسپ تھی۔

ڈائننگ روم کی بجائے میں نے اپنے کمرے میں ہی کھانا منگوالیا تھا چھوٹا سا کمرہ تھا اور بجلی کے بلب کی مدھم روشنی میں کھانے کی میز پر وسکی کے ایک دور کے درمیان میں نے آج پہلی بار بھیشم جی کو قریب سے دیکھا تھا۔ مجھے سرینگر میں بلراج ساہنی کے جلسے میں ملے تھے پھر اپٹا کے اسٹیج پر

اعدآبادی سالانہ کانفرنس میں بلراج جی کے بیان جوچھ میں —— لیکن آج تک
مجھے اس بات کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا جیسے روحانی طور پر دو روحانی بھائی
ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں۔ ویسے چہرے کے نقش ونگار میں بھی بے حد
مناسبت تھی پہننے اوڑھنے کے طریقے بھی ملتے جلتے تھے اور زندگی کی جن
قدروں میں ان دونوں کا اعتقاد تھا۔ ان کی باتیں سن کر ایسا لگتا تھا جیسے
بلراج جی بول رہے ہیں —— اور پھر —— ہوا میں اُڑتا ہوا قہقہہ۔
انھیں بلراج جی کی طرف سے فکر تھی کہ آج کل وہ بہت اکیلے ہیں۔

۱۹۳۹ء یہ سارا سال میں نے کشمیر میں گزارا۔
جس انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ہم نے بلراج جی کی صدارت میں
ڈالی تھی۔ اب وہ بچپنے کی منزل سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ اکثر ادیب
اور شاعر ریڈیو کشمیر کے قایم ہونے پر اس میں شامل ہو گئے تھے۔ پریم ناتھ پردیسی
اب ریڈیو سے باقاعدگی سے ڈرامے لکھ رہے تھے۔ دینا ناتھ نادم جو پہلے قدرے
گمنامی میں ادھر ادھر اپنی شاعری پڑھا کرتے تھے اب انجمن ترقی پسند مصنفین
سرگرم رکن تھے۔ مہجور کاشمیری کی طرح اب ان کی نظمیں ساری وادی میں گونج
رہی تھیں۔ افسانہ نگاروں میں سوم ناتھ زتشی اور علی محمد لون کا جنم ہو رہا تھا۔
پران کشور جنھوں نے میرے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی تھی
اب لسٹیرٹ اور مہندر ناتھ کول کے ساتھ ان کی آواز بھی " ریڈیائی لہروں " پر
رقص کرتی تھی۔
میں نے اسپیس کے بارے میں اپنا پہلا رپورتاژ —————— انجمن
میں پڑھ کر سنایا اور اسے دہلی کے مشہور رسالے " شاہراہ " کو بھیجا۔ پرکاش پنڈت
اس کے مدیر تھے۔ یہ شائع کرتے ہوئے انھوں نے کچھ اور لکھنے کے لیے کہا۔
اس گہماگہمی کے باوجود دل قدرے پریشان تھا۔ بلراج جی کی کوئی خبر

یں نہیں آرہی تھیں۔ راما نند ساگر کی "باز و بند" فلم چل نہیں سکی اب وہ راج
ور کی فلم "برسات" کی کامیابی کے بعد ایک اور فلم "مہمان" بنا رہے تھے
۔ ان اس میں انھوں نے بچن کو پارٹ دیا تھا۔

۱۹۵۰ء کے شروع ایک روز کافی ہاؤس میں ان کی چھوٹی بھانجی
ل گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ اپریل میں میں بمبئی جا رہا ہوں، وہاں سے پھر
سریکہ جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلراج جی نے دوبارہ شادی
رلی ہے۔ اس شادی سے گھرانے میں کافی شور برپا ہوا ہے۔ ان کی دوسری
بیوی سنتوش ان کے والد صاحب کی بہن کی دختر تھیں۔

اپنے گھرانے کی نظروں میں کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کرنا ان کا پہلا
گناہ تھا۔

یہ شاید ان کا دوسرا گناہ تھا۔

خط لکھنے کے لیے وقت کم تھا کیونکہ اب میں بمبئی جانے کے لیے تیار تھا
میرے روانہ ہونے سے پہلے ایک اور خبر ملی کہ ہندوستان کے اکثر حصوں
یں ترقی پسند تحریکوں پر جو عتاب نازل ہوا تھا اس سے کمیونسٹ پارٹی اور
لوامی تھیٹر بھی نہ بچ سکے۔

بمبئی میں کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر پر سرکار کے دھاوے کے بعد
ملراج ساہنی بھی گرفتار کر لیے گئے تھے۔

اب وہ جیل میں تھے۔

(نازنین تم بہت حسین ہو) USTAD ED ADOROBLE

دیوآنند کی چھوٹی بہن بونی (مسز لتا سوین) جو لندن سے باہر ویلشن ان میں
رہتی ہیں، کا ابھی ابھی فون آیا ہے کہ بلراج ساہنی کا دیہانت ہو گیا ہے اور کیا مجھے
اس بارے میں کوئی خبر ملی ہے ......؟

کچھ روز ہوئے چیتو چوپڑہ (رامانند ساگر کے چھوٹے بھائی) کا بمبئی سے خط آیا تھا کہ بلراج ساہنی سے ملاقات ہوئی۔ تمہارا کافی ذکر رہا۔ وہ اب بھی شکایت کر رہے تھے کہ تم نے لکھنا کیوں بند کر دیا ہے۔ خدارا پھر سے لکھنا شروع کر دو۔ بمبئی سے آنے والے ہر دوست کے ذریعے جو انھیں بھی جانتا تھا ان کا پیار مجھ ہمیشہ مجھ تک پہنچ جاتا تھا۔ اتنے برسوں سے ایک دوسرے کو اتنے قریب سے جانتے ہوئے بھی یہ دوستی کسی خط و کتابت کی محتاج نہیں تھی۔

بوئی سے فون پر بات کرنے کے باوجود دل جیسے گواہی دے رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔ اس دنیا میں ہیں، بمبئی میں ہیں، جو ہو میں ہیں، اپنے گھر کے شاید کسی کمرے میں پوشیدہ ہیں!!!

ان کی دوستی میں ہمالیہ کی سی بلندی اور عظمت تھی۔ ان کے خلوص اور محبت کی کوئی گنی چنی حد بندیاں نہیں تھیں۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں وہ زندگی کی جس لگن اور توانائی کا ذکر کر رہے تھے اس کے پیش نظر یقین نہیں آ رہا تھا کہ پنجاب کا یہ خوبصورت پھول اتنی جلدی مُرجھا جائے گا۔

ان ہی دنوں بمبئی سے بی ڈی۔ کارگا کا خط ملا۔ وہ بلراج ساہنی کی زندگی کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں انڈین ہائی کمیشن اور بی بی سی سے کچھ معلومات کی ضرورت ہے اور پوچھا ہے کہ اس بات میں کیا میں ان کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟

ساؤتھ ہال میں ـــــ جو اس وقت نہ صرف لندن بلکہ سارے ولایت میں دکھائی جانے والی ہندستانی فلموں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ بلراج ساہنی کی تازہ ترین فلم "ہنستے زخم" جسے چیتن آنند نے ڈائرکٹ کیا ہے، دکھائی جا رہی ہے سینما کے باہر پوسٹروں میں اور ہر طرح کی پبلسٹی میں اس بات کو اہمیت دی جا رہی ہے کہ ہندستان کے اس عظیم فن کار کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔

اور تماش بین دور دور سے اپنے محبوب فن کار کی عقیدت کے لیے چلے

آ رہے ہیں۔

جس لندن کو طراج ساہنی نے بہت برس پہلے دیکھا تھا۔ وہ ان کے لیے بی بی سی کا لندن تھا۔ پچھلی بڑی لڑائی کا زمانہ تھا، پچھلی بڑی لڑائی کے آخری سالوں کا زمانہ جب لندن میں دن رات بمباری ہوتی تھی۔ وہ بی بی سی کے ہندستانی سیکشن سے براڈ کاسٹ کر رہے تھے۔ سیاسی اور سماجی لحاظ سے یہ ایک غیر یقینی اور بڑی شدید ہلچل کا زمانہ تھا۔ بی بی سی کی محدود زندگی کے باوجود انھیں لندن سے پیار ہو گیا تھا۔ اس لندن کے بارے میں وہ کئی لطیفے اور کہانیاں سناتے تھے۔

اگر آج وہ لندن آتے اور ساؤتھ ہال کے بازوں میں، دوکانوں میں اور گھروں میں، انھیں پنجاب کی جو آوازیں سننے کو ملتیں اُن سے متاثر ہو کر مجھے یقین ہے ان کا سر عقیدت سے جھک جاتا۔ اپنے پنجاب سے ہزاروں میل دور رہنے کے باوجود ان لوگوں نے اپنا "پنجابی پن" نہیں چھوڑا تھا ـــــ پنجاب بلراج ساہنی کی روح تھا۔ وہ پنجاب کی زبان اور پنجاب کی ہواؤں کو سلام کرتے تھے۔ پنجاب کے دریاؤں کے ساتھ ساتھ جیسے بلراج ساہنی کی روح بہتی تھی۔

بلراج ساہنی کی زندگی کا فلسفہ اگرچہ کسی حد بندیوں کا قائل نہیں تھا لیکن اس کے ادبی تخیل کی اڑان سرزمین پنجاب سے باہر آنے کے لیے آمادہ نہیں تھی ان کی پنجاب سے اس عقیدت میں کسی تنگ نظری کا کوئی دخل تھا۔ وہ اس بات میں پورا یقین رکھتے تھے کہ ہندستان کے ہر Region کی زبان میں اتنا دم ہے کہ وہ ادبی INTELECTUAL لحاظ سے دنیا کی کسی بھی زبان سے مقابلہ کر سکتی ہے اس سلسلے میں وہ اکثر بنگالی زبان اور آنجہانی رابندر ناتھ ٹیگور کی ساری دنیا میں ادبی عظمت کی مثال دیا کرتے تھے۔

اردو ادب پر بحث کرتے ہوئے وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے۔

"پنجابی میں لکھو!"

"پنجابی لکھ نہیں سکتا"
"پنجابی بول تو لیتے ہو؛...... قہقہہ۔
"لکھنے کی زبان اور بولنے کی زبان میں ایک Intelleduel امتیاز ہے"
میں ان سے کہتا "غلط، بالکل غلط"
وہ قدرے غصے سے کہتے "تم پنجابی میں سوچتے ہو، پنجابی خیالات تمہاری ہر سانس میں رقصاں ہیں۔ پنجابی زبان تمہاری روح میں رچی ہوئی ہے۔ تم اس کا اظہار فارسی رسم الخط میں بھی کر سکتے ہو۔ میں بالکل تنگ نظر نہیں۔ لیکن نا معلوم کیوں لگا کر ہم دونوں پنجاب کی پیداوار ہیں۔ تمہارا آرٹ اور فن ایک ایسا پودا ہے جو پنجابی زبان میں ہی پھل پھول سکتا ہے"
"لیکن اردو میں لکھنے میں کیا برائی ہے؟"
پنجاب کا حسن، پنجاب کی خوشبو، پنجاب کی زمین اور آسمان، پنجاب کی خوشیاں اور درد ــــــ کیا اردو زبان اتنی کمزور ہے کہ وہ خوبی سے ان تاثرات کا اظہار نہیں کر سکتی؟"
اگر کوئی اجنبی ہوتی تو ان کی یہ باتیں سن کر شاید سوچتا کہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن پنجابی زبان سے ان کی ان Convictions سے میں بخوبی واقف تھا کسی بھی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے میں نے ان کے ماتھے پر کبھی تیوری چڑھتے ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ ان کی تقریروں میں ایک بڑی خوبصورت سادگی تھی۔ یہ بحث گھر کے اندر ہو یا باہر اسٹیج پر ریہرسل کرتے ہوئے، یا ریلوے اسٹیشن پر گاڑی انتظار کرتے ہوئے ..... مسکراتے رہتے تھے۔

ایک روز ادبی بحث میں انھوں نے کاغذ کا ایک پرچہ جیب سے نکالا اور بولے دیکھو آج بلونت گارگی کا یہ خط آیا ہے، سنو کیا لکھا ہے :
تیرا خط پڑھ کے ــــــ بڑا مزا آگیا اے۔
"تم بتاؤ، اس کا ترجمہ کر سکتے ہو؟ اس جملے میں جو مٹھاس ہے، جو نشہ ہے اس کا

اظہار کاری صرف اپنی زبان میں ہی کر سکتا ہے:

خاموشی کے سوا میرا پاس اور کوئی جواب نہیں تھا۔

اکثر لوگ انھیں ایک ادیب سے زیادہ ایک ایکٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن ہندستانی فلموں کا یہ ہیرو پردۂ سیمیں کے باہر اپنے آپ کو ایک متوسط انسان سمجھتا تھا۔ قیمتی اور بڑی موٹر گاڑیوں میں سوار ہونے کے بجائے ریل گاڑی یا ٹیکسی سے سفر کرنا پسند کرتا تھا۔

" ہم لوگ" جیسی فلم کی عظیم کامیابی کے باوجود ان کا دماغ اور ان کی نظریں اس زمین کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں مزدور اور کسان کی محنت کی کوئی قدر نہیں تھی۔ " ہم لوگ" کے ہیرو کی طرح ان کو " یاروں کی یاری " سے مطلب تھا۔ اور ان کے لیے جیسے سارا ہندستان ان کا " یار" تھا۔

اور بمبئی کی گلیوں میں موٹر سائیکل پر سوار جیسے یہ " عوامی ایکٹر" ــــــــــ اس منزل کی تلاش میں تھا جہاں کوئی بھی انسان اتنا بے بس نہ ہو کر اسے دو وقت کا پورا کھانا بھی میسر نہ ہو سکے۔

ادب اور آرٹ چاہے وہ موسیقی ہو یا فوٹوگرافی، سنگتراشی یا فلمیں انھیں وہ ایک ایسا Vehicle سمجھتے تھے جس کے ذریعے ہم نہ صرف اپنے سماج اور زمانے کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ ان کی مدد سے اسے بدلنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں۔

بمبئی کے جے ہند کالج میں ایک بار تقریر کرتے کرتے انھوں نے کہا تھا:

" اسٹیج کا آرٹ جس میں ایک فن کا حصہ لیتا ہے وہ صرف مکالمے کہنے یا اداکاری کرنے یا ہدایات دینے تک ہی محدود نہیں ہوتا ہے بلکہ جو شخص اسٹیج کا پردہ اٹھاتا ہے یا گراتا ہے وہ بھی ایک فن کار ہی ہے غلط وقت پر پردہ اٹھانے یا گرانے سے ڈرامے کا سارا مزہ خراب ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی بھی کام چھوٹا یا بڑا نہیں۔ اس سماج میں ہر انسان کی اپنی اپنی ضروری جگہ ہے"

ایسے حالات میں ہندستانی فلم انڈسٹری میں ان کی حیثیت ایک کی سی تھی وہ کہتے تھے کہ ہمارے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ فلم کے بڑے اسٹاک ہیں، ہمارے یہاں بہت اسٹوڈیو ہیں، اچھے فوٹوگرافروں، ہدایت کار دوسرے فلم بنانے والے فن کاروں کی کوئی کمی نہیں لیکن کئی برسوں سے جیسے انڈسٹری آگے بڑھنے کے لیے آمادہ نہیں۔ آج سے کئی برس پہلے ہم نے عمدہ بھی اور کامیاب فلمیں بنائی تھیں آج کل کی فلموں میں جیسے دم نہیں کہاں گئے وہ فلم بنانے والے؟ آج کل پیسہ اس انڈسٹری کا "خدا" باکس آفس ہے ___ فلم بنانے کا پہلا اور آخری مقصد جیسے صرف پیسہ کمانا ہے۔

ایک بار میں ان کے ساتھ اسٹوڈیو جا رہا تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی کہنے لگے "کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ ایک 'لٹرین' ہے جسے کئی دنوں سے صاف نہیں کیا گیا، اندر آکر بڑی گھٹن ہوتی ہے۔

اس کے باوجود انھیں اس بات کا اعتراف تھا کہ مالی مجبوریوں کے پیش نظر فلموں سے رشتہ توڑنا ان کے لیے اس وقت ممکن نہیں تھا۔

بلراج ساہنی ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ لندن آئے تھے۔ بچپن کی تعلیم راولپنڈی میں ہوئی اور پھر لاہور میں یونی ورسٹی کی تعلیم مکمل کی۔ صرف نوکری کی تلاش بلکہ ادب اور آرٹ سے نوجوانی کے زمانے میں جو رومان انھیں ہوتا ہے، وہ انھیں پہلے شانتی نکیتن لے گیا اور پھر گاندھی جی کے سیواگرام میں کچھ دیر دم لیا۔ اب وہ شادی شدہ تھے۔ بی بی سی ریڈیو میں کام ملنے پر جیسے ان کے پاؤں زمیں پر نہیں پڑ رہے تھے لیکن لندن پہنچنے سے پہلے وہ باپ بن چکے تھے۔ لندن میں جنگ کی وجہ سے غیر متعین زندگی کے پیش نظر ان کی بیوی دمینتی نے بچے کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔

شانتی نکیتن کے ادبی ماحول اور گاندھی جی کے سیواگرام میں سماجی قدروں سے مایوس ہونے کے بعد لندن کی مغربی تہذیب میں جیسے ان کے نوجوانی کا رومانی

سراب ایک ہیئتی حقیقت سے روشناس ہو رہا تھا۔ یہاں انھیں جو مغربی اور
س طور پر روسی فلمیں دیکھنے کا موقع ملا۔ ان سے ان کے ذہن میں جیسے نئے
تے پیدا ہو رہے تھے۔

بی بی سی سے براڈ کاسٹ کرنا نہ صرف ان کے لیے ایک نیا اور دلچسپ تجربہ
بلکہ اس تجربے کے ذریعے انھیں اپنی دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع
ں ملا۔ ذہنی طور پر یہ جیسے ان کی زندگی کا ۔۔۔ تھا۔ جنگ میں روس
عوام سب بہادری اور قربانی کے ثبوت دے رہے تھے۔ ان کی خبریں سن کر۔۔۔
س زندگی کی نئی قدروں اور ایک نئی جدوجہد کا احساس ہو رہا تھا۔

اس وقت بخاری صاحب بی بی سی میں ہندستانی سیکشن کے کرتا دھرتا
ے اور براڈ کاسٹنگ کے سلسلے میں وہ بڑی ہستی مانے جاتے تھے۔ ان کی آواز
ں جب تھا بڑے "دھڑلے" سے بولتے تھے۔ ریڈیو اور ریڈیو کے باہر بھی بلراج
۔ سنی کے دل میں جیسے ان کے لیے بڑی عقیدت تھی ـــــ اور خود بخاری صاحب
رج ساہنی کی "ریڈیائی آواز" کے بڑے مداح تھے۔

اب دمیتی ساہنی بھی ریڈیو سے براڈ کاسٹ کرنے لگیں۔ جہاں بخاری
۔ حب کی آواز میں طوفانوں کی گرج اور بجلی کی کڑک تھی، وہاں بلراج ساہنی کی
ز میں پہاڑی نالوں کی روانی اور جھرنوں کی مدھرتا تھی۔ بی بی سی کے اس سیکشن میں
، دونوں آوازیں "بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ لیکن ان آوازوں کے خوب صورت
سنگم کے باوجود کبھی کبھی ان دونوں میں جیسے ایک ذاتی کشیدگی سی پیدا ہو جاتی تھی۔
بلراج ساہنی کی زبان اب تک ہندی تھی۔ اردو بولنے یا براڈ کاسٹ کرنے میں
جس کوئی مشکل نظر نہیں آتی تھی، لیکن وہ اردو پر پورا قابو پانا چاہتے تھے
بت اردو لکھنے میں بھی ایک طرح سے ان میں احساس کمتری سا پیدا ہو گیا تھا۔ بخاری
صاحب کو بھی اس بات کا علم تھا۔ وہ اکثر بلراج ساہنی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔
یکن س کے باوجود اگر بخاری صاحب کہتے کہ "بلراج یار، ذرا کینٹین سے میرے لیے چائے

کاکپ لے آنا۔ یا بلراج جی، لپک کر ــــ سگریٹ کا ایک پیکٹ لے آنا۔ تو بخاری صاحب کے لیے شدید احترام کے باوجود وہ کہتے۔ کبھی کبھی تو ایسے جی چاہتا تھا کہ سگریٹ کا پیکٹ یا چائے کا کپ ان کے سر پر کھینچ دوں "

بلراج ساہنی نے زندگی کے جس فلسفے کو اختیار کیا تھا اس کے پیش نظر ذاتی قربانی کے ساتھ ساتھ حلیمی بھی ان کے کردار کا ایک اہم جز تھی۔ ارد و زبان پر قابو پانے کی انھیں ذاتی لڑائی کے ساتھ ساتھ جیسے وہ ساری دنیا کی فاشزم کے خلاف جنگ میں بھی وہ اپنی آواز کو پوری طرح شامل کرنا چاہتے تھے ــــ اور اس سلسلے میں انھیں بخاری صاحب کو اپنا "گورو" ماننے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

جوہو آرٹ تھیٹر کی ریہرسلوں میں اپنے بی بی سی کے دنوں کی شروع شروع کی مشکلوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ہم اداکاروں کو بار بار اس بات کا احساس دلاتے کہ زندگی میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اور ایک فن کار کے لیے اس قربانی کے دوسرے نام بھی ہیں ــــ گیان! تپسیا!! ریاض!!!

"آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ ریس کے میدان میں "دوڑنے والا" دوڑ سے پہلے کس طرح اوپر نیچے کودتا ہے یا بار بار اپنی ٹانگوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ اسی طرح اسٹیج پر جانے سے پہلے ہر اداکار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مکالموں کی ادائگی میں اپنی آواز کے ہر طرح کے اُتار چڑھاؤ سے پوری طرح روشناس ہو:

جوہو آرٹ تھیٹر کی دوسری پیشکش "شاہ بادشاہ" (گوگول کے مشہور کھیل "انسپکٹر جنرل") جس کا ترجمہ سنتوش جی نے کیا تھا اور بلراج ساہنی کے ساتھ وہ اس کی ہدایت کار بھی تھیں، کا ایک قصہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔

میں اس کھیل میں میئر (Mayor) کا پارٹ ادا کر رہا تھا اور سنتوش جی ڈرامے میں میری بیوی تھیں۔ اس کھیل کی ریہرسل بڑے زوروں شوروں سے ہو رہی تھی، اور ایک ہفتے میں اس کا پہلا شو تھا۔

ایک منظر کے دوران میں سنتوش جی بار بار غلط لائن بول رہی تھیں اور بلراج ساہنی بار بار کہتے "توشی (سنتوش جی) اسے یوں بولو ۔۔۔ اسے پھر سے پڑھو ۔۔۔ سے یوں پھر سے بولو۔"

لیکن بات نہیں بن رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سنتوش جی نے پھر اپنا پارٹ شروع کیا لیکن اس خاص لائن پر پہنچ کر وہ بھڑک جاتیں۔ تو بلراج ساہنی پھر کہتے ۔۔۔ "نہیں، نہیں، نہیں!"

ڈائریکٹر کی حیثیت سے بلراج ساہنی بے حد صبر سے کام لے رہے تھے۔ بڑی شفقت اور پیار کے ساتھ غلطی کرنے پر وہ اداکار کو سمجھاتے کہ کچھ دیر آرام کرو ۔۔۔ آنکھیں بند کر کے سوچو، اور پھر اپنا پارٹ بولو۔

لیکن سنتوش جی کو ڈائریکٹ کرتے ہوئے وہ شاید بھولے نہیں تھے کہ وہ ڈائریکٹر کے ساتھ ساتھ ان کے شوہر بھی ہیں۔

اس ڈرامے کے مردانہ کاسٹوم Costume اس وقت کے روسی زمانے کے تھے لیکن خواتین کو ہم نے ساڑھیاں پہنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت سنتوش جی پتلون Trousar پہنے ہوئے تھیں اور ہم لوگوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بلراج ساہنی کو سنتوش جی کو اس لباس میں دیکھ کر جیسے چڑھ سی ہو رہی تھی۔

آخری بار ریہرسل شروع ہونے پر بھی بات نہیں بنی تو بلراج ساہنی جیسے گرج پڑے "تم اپنے آپ کو آرٹسٹ کہتی ہو، تمہارا پارٹ ایک ہندستانی عورت کی روح کے لیے پکار رہا ہے اور دیکھو تم نے یہ لباس کیا پہن رکھا ہے۔"

اس جملے کے ختم ہونے سے پہلے ہی سنتوش جی کی آنکھوں میں جو طوفان کب سے تھما بیٹھا تھا وہ اب برس پڑا۔ ان کی ہچکی سی بندھ گئی۔ ڈرامے کا سارا گروپ نہ کیا سی جمع ہو گیا، اس ڈر کے خیال سے کہ بلراج ساہنی کے غصے کی بجلی پھر نہ گرج پڑے۔

بلراج ساہنی ہال کے ایک کونے میں کھڑے ہم لوگوں کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کلاس روم میں ماسٹر جی نے انہیں ڈانٹ دیا ہو۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب زندگی کا اظہار تھا۔



نعیر حیدر

نعیم حیدر

اُن دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا

یہ تو آپ جیسے ہو گئے ... نے ... یہ سوال تین سے کہاں سے لیا ہے دیکھو اور بعد میں ... مجاز کی ان تین معرکہ آرا نظموں سے جو اے ...ستانی ادبی صف ... کے زمرے میں داخل کر دیں اور یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ مجاز کے دوست یا طرفدار کی حیثیت سے نہیں ملکہ محض عام قاری کی حیثیت سے۔ اس کے باوجود میں خود آپ کے سامنے یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ ان دنوں کے الف پر جیش میری اپنی اپج یا بدعت ہے۔ مجاز اس الف کو زیر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اِن دنوں۔

بلطف میں نے اس فرق پر ان سے بات کرنا چاہا تو وہ کچھ جز بز ہوئے تھے کہ بات آئی گئی ہو گئی۔ آج مجاز کو مرے پورے تیس برس ہونے کو ہیں۔ ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء کو ہوا کیا دعا کے بے صحت پائی تھی۔ مگر بہرحال، مرتے جیتے تو لوگ رہتے ہی ہیں اور ان میں مجاز کے ایسے لوگ اور مجاز کی ایسی موتیں شامل ہیں۔ اس بارے میں میرا اپنا ایک شعر بھی ہے، ابھی حال کا۔

تڑپے بھی بہت ہم بھی گئے درد کے مارے
کچھ بھی نہ ہوا، اور جو ہونا تھا ہوا بھی

ان دونوں اور اُن دنوں کا فرق جس پر اب میں آپ سے بات کرنا چاہتا
ں مجاز کے مرنے پر منحصر نہیں۔ اگر کاش خدا کرتا وہ زندہ بھی رہتے تو اس
م پہ تو بہرحال یہ تیس برس بیت ہی جاتے اور اسے لپک لپک کر پڑھنے
ے شاید تعداد میں اب سے زیادہ ہوتے۔ اصل مسئلہ ان پڑھنے والوں کا
ہے۔ مجاز کا نہیں۔ اُن دونوں کا اشارہ ماضی قریب کی طرف ہوتا ہے، اتنا قریب
۔ می وحال میں تمیز دشوار ہوجائے یا ماضی حال ہی در آئے۔ جن دنوں میں،
س زمانے میں، تاریخ کے جس دور میں یہ نظم اور اس میں ہر قوم تجربات و تاثرات
لا۔ پروار دہوئے تھے۔ اُن دنوں، مطالب بالکل درست تھا مگر بہت مختلف
ر ر پر۔ ان تیس برسوں میں صرف یہی نہیں ہوا کہ مجاز ہم میں نہیں رہے۔ مجاز یہ کہ
ورد ہ 'قیامت کا جنوں' جس کی حکایت خونچکاں سے نظم عبارت ہے وہ بھی
مجاز کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگیا۔ اب وہ چلتے پھرتے 'آجکل' یلا ہندو
ذات ہیں۔ قرنوں پہلے، کسی دوسری دنیا کی چیز ہوکر رہ گیا ہے جن کا تصور میرے
یے آسان ہے مگر آپ کے لیے، یا آپ میں بہتوں کے لیے بہت دشوار ہے
قریباً ناممکن۔ وہ زمانہ واقعی بڑا جنوں پرور تھا۔ بے تحاشہ نئی نئی امیدیں، آرزوئیں
نئے نئے تصورات ایک طوفان کی طرح امڈے آتے تھے اور وہ ایسا معلوم ہوتا تھا
۔ کل کا سورج ہم پر ایک نئی دنیا میں نکلے گا جہاں نئے سبزہ زار ہوں گے، نئے
گرد حجر، نئے برگ و بار، نئے لیل و نہار، مگر نہ وہ پرستان کا اڑن کھٹولا آیا،
۔ ہم اس میں اڑ کر کہیں پہنچے۔ وہی دنیا ہے وہی اس کی کاہشیں اور آلائشیں۔ جہاں
مدلا کچھ فرق ہمارے ہاتھوں یا ہمارے دیکھتے دیکھتے ہوا ہے اس نے اسے
پہلے سے بدتر ہی بنایا ہے، بہتر نہیں۔ مگر یہ اور بات ہے۔
اس نظم کے آخری شعر میں خود مجاز نے اس شکست جنوں، اس طوفان کے

قطعے اور ختم جانے کی بشارت دی ہے جسے اس نے خود پہلے ہی ایک ذاتی تجربہ بنا کر اپنے اندر سمو لیا تھا، حلول کر لیا تھا۔ ؎

وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

آج اس جذبۂ معصوم کا فقدان اس عہد، اس صدی کے نصف آخر کا جو عین ممکن ہے، تاریخ انسانیت کی آخری صدی ہو، سب سے بڑی، سب سے گمبھیر اور سب سے زیادہ حالکا مسئلہ بن گیا ہے اور یہی مسئلہ آج آپ کا رشتہ مجاز کے ساتھ جوڑتا ہے طوفان تھی، اندر تی ہوئی مستی نے آسمانوں پر ہوتی ہیں گھٹائیں چھپیں تو معلوم ہوا کہ مطلع صاف، میدان خالی سب اندھے پڑے ہیں فرش پر خالی پیالے ہیں۔ دھوپ کی تمازت سے کھڑکیاں کھچی جاتی ہیں۔ ایک ایسا حبس، ایسی رسن کا بوس کی طرح ہر طرف مستولی ہے کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے مجاز نے اپنے آغاز شاعری میں آل انڈیا ریڈیو کے لیے کہے گئے ایک مطلع فرمائشی مطلع میں یہ شعر کہہ دیا تھا ؎

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجاز
وہ تو آواز شکست ساز ہے

مجاز کی زندگی، اس کی محنت اور اس کی شاعری، اس کے لطیفے سب کے سب اسی شکست ساز، شکست نغمہ، خود جنون زندگی کی شکست کی فنکار ہیں جیسے بظاہرہ کی آخری سطح جس کے بعد سناٹا ہم چھلتا ہے اور یہ حقیقت اپنی پوری تابناکی اور تابکاری کے ساتھ دل پر منکشف ہوتی ہے کہ ؎

ہر چند کہ وہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آہی پہنچا ہے یا آیا ہی چاہتا ہے اگر یہ قصہ کسی دوسرے دن پر اٹھا رکھیے۔ میں بھی اس کی زندگی اور اس کی شاعری

کے جتنا کہ کی بات کر رہا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ شکست ساز کی آواز قیامت کا جنوں، دل مرحوم کا ماتم، گرد پھیلائے ہوئے بڑھتی ہوئی رسوائیاں، اور اسی طرح کے بے شمار مکھڑے ترکیبیں اور تعبیریں جو بیک الفاظ جیم آگے بڑھتی ہوئی ناگزیر خرابی، بربادی اور تباہی کی پیشین گوئی کرتی ہیں، مجاز پر کیوں چھائی تھیں۔ اور اس چھاجانے میں آشنا رچاؤ، اتنی دلدوزی ماتمی تاثیر اور واقعی اپیل کہاں سے آگئی تھی۔ ہم آپ آج بھی اسی آواز شکست ساز، اسی ٹوٹے ہوئے ستار کی جھنکار پہ جھوم جھوم جاتے اور سر دھنتے ہیں اور مجاز کی زندگی میں تو یہ حال تھا کہ کم از کم شمالی ہندوستان میں کشمیر اور پشاور سے لے کر نیچے بمبئی بھوپال اور حیدر آباد دکن تک کوئی شہر کوئی قریہ ایسا نہ تھا کہ اگر مجاز صاحب محض اتفاقاً اپنے من کی موج میں ریل سے اسٹیشن پر اتر جائیں اور پھر گاڑی میں نہ چڑھ پائیں تو ناممکن تھا کہ وہاں ان کو دور سے دیکھ کر پہچان لینے والے، دس بیس آدمی انھیں کے اشعار پڑھتے ہوئے انھیں لبیک کہنے اور سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے ان کے گرد جمع نہ ہو جائیں۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب مجاز پر اور ہم سب پر قیامت کا جنوں طاری تھا۔ مجاز پر بذاتہ پچ مچ کے جنون کے دورے بھی بار پڑے اور ہر چند یہ دورے بھی بڑی حد تک اس محیط دوراں جنون کا شاخسانہ تھے جس کی پرچھائیاں مجاز کے دل و دماغ میں مسلسل ایک مدت سے دست و گریباں رہتی تھیں، مگر نظم میں جس قیامت کے جنون کی داستان بیان ہوئی ہے وہ مجاز صاحب کے ذاتی کے تجربات کا قصہ نہیں۔ یہ جنون ایک مجاز پر موقوف نہ تھا۔ یہ اس زمانے میں پورے ہندستان پر طاری تھا۔ اعتراف مجاز کا اپنا اعتراف شکست نہیں ہے۔ اس میں مجاز نے ہماری آپ کی شکست (ناکامی) کا رونا رویا ہے جو ہمارے لیے مقسوم ہو چکی تھی اور یہ مجاز نے اپنے

[illegible] نے POETIC INVENTION سے معلوم کیا تھا کہ اس بندش کے باقی دو مصرعوں میں اس جنس کے عناصر کی آمیزش لازمی ہے جو بڑی اہم ہے [illegible] سے محبت کا جنون طاری تھا شہریاروں سے مقابلے کا جنون طاری تھا اور زیادہ مناصب درکار ہو تو اس میں آگے نہ بڑھ [illegible] شہریاروں سے رقابت میں سب کچھ کھلا ہے [illegible] تصور کی طرف جس کی بنا صحیت پر مقابلہ اور اس کی وساطت سے [illegible] مغربی تہذیب کے ساتھ ہمارے تاریخی رشتے [illegible] جس کے خلاف [illegible] کا احیا و سلاسل کی روح رواں تھے

آزادی کا یہ تصور خالصتہً اور کلیتہً مغربی ہے جسے ہم نے انگریزوں کی وساطت سے مستعار لیا تھا۔ اور ان سے آزادی حاصل کر کے گنوا دیا۔ اب صرف شہریاروں کی آپس کی رقابت رہ گئی ہے۔ مگر آزادی کی لگن میں آزادی کا مغربی تصور ایک مرکزی اور کلیدی نکتہ تھا۔ اس زمانے کے ادب شاعری فلمی گانوں اور مکالموں میں اس تصور زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ اسی سے اس میں وہ ٹیس وہ تڑپ، صبح بہار کا سا وہ ترنم کا احساس کی روح رواں تھا۔ دوستی اور محبت میں اظہار مدعا کی آزادی، آزادی اظہار اور آزادی کے تمام دوسرے مظاہر اور ابواب کا دیباچہ اول ہے۔ جو صرف اپنے کھٹکے بانی قسمت کلام اپنے روایتی پس منظر BACKGROUND کے برتے پر اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے اشعار کہتے اور کہتے چلے جانے کا یارا رکھتے تھے، مگر ان کے بعد یہی وہ لوگ آدمی تھے جنھوں نے اس نکتے کو پالیا تھا کہ اظہار مدعا کی آزادی آزادئ اظہار اور سیاسی و سماجی آزادی کا دیباچہ اول ہے۔

عصری ادب کے ناقدین اور عصری رواں تاریخ CONTEMPORARY HISTORY کے مورخین دونوں کے اس باریک مگر بنیادی نکتے سے

اظہار ہوتا ہے جو تنقید اور تاریخ دونوں کی بڑی کوتاہی ہے۔ مجاز کی ... پسندی اور شاعر محفل و فاو طرب بزم و لبراں کے رول پر کافی طور پر ایک زمانے میں خاصی بھنویں چڑھائی گئی تھیں۔ مگر ہندوستان کی تحریک آزادی جس کے سلسلے میں ہم سب پروان چڑھے جلال و جمال کا بڑا حسین امتزاج تھی اور سیاسی تحریکات کے ساتھ اس میں جمالیاتی تحریکات برابر بلکہ شاید برابر سے زیادہ شریک تھے۔ فراق صاحب نے یہ پوری بات اپنی مخصوص چابکدستی سے ایک شعر میں کہہ دی تھی ؎

تاریخ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات ۔۔۔ مجبور ایسی عشق کی بے چارگی نہیں

جلال و جمال کا یہی امتزاج تھا جس نے اس تحریک کو اتنا رس اور، اس قدر دلدوز بنا دیا تھا۔ حسرت موہانی کے الفاظ میں تہذیب رسم عاشقی اس تحریک کی پوری فضا میں رس بس گئی تھی۔ میں جب ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو ایک خواب سماں ذہن پر چھا جاتا ہے۔ اور اس خواب، اس فضا، اس سماں پر سب سے بڑی اور سب سے دل آویز چھاپ شاعر محفل و فا مجاز کی ہوتی ہے۔

ہمارے شہر لکھنؤ میں ایک بڑی نتھری ستھری سڑک بادشاہ باغ کے یونیورسٹی ایریا سے نکل کر گومتی کو بارڈ نگ برج سے پار کرکے قیصر باغ کے عین بیچ بیچ مال روڈ سے مل جاتی تھی۔ اس تراہے کے ایک جانب چھتر منزل تھی جو کبھی واجد علی شاہ کی آماجگاہ ہوا کرتی تھی۔ سامنے نواب نصیر الدین حیدر اور ان کی بیگم کے مقبرے تھے اور ان کے چاروں طرف قیصر باغ کے محلات اور چمن زار پھیلے ہوئے تھے جن کے روشوں اور نہروں میں آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے پریاں ناچتی اور تھرکتی نظر آتی تھیں۔ آگے بڑھ کر یہ سڑک حضرت گنج کے نئی وضع کے بازار داخل ہو جاتی تھی اور اس کی دوسری شاخ گومتی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی شاہ نجف

سے نکل کر سکندر باغ تک چلی جاتی تھی۔ دو رویہ ببول، املتاس، مولسری اور شیشم کے قد آور درخت تھے۔ جن کی گھنیری مگر پتلی پتلی شاخوں اور پتیوں سے طرح طرح کی روشنیاں چھنتی تھیں اور سایوں، پرچھائیوں کا ایک جال سا بن جاتا تھا جس میں گھر کر فراق کا یہ شعر ذہن میں چمک اٹھتا تھا ؎

انا دھیک ملہ سے ہیں کانتی ہیں پے بہ پے۔ پیاس کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیاں

موسم کے مطابق ببول کے خاردار درختوں میں بھی پھول کھلتے تھے اور ایسی فراوانی سے کہ راہ چلتوں پر پیلی پیلی پنکھڑیوں کی بوچھار سی پڑتی تھی۔ شاید اسی منظر میں استاد ناسخ نے اپنا وہ مشہور و معروف شعر کہا تھا ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

اس جنوں پسند کی ترکیب کا مطلب آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک اس سڑک سے عادتاً بار بار گزر نہ ہو۔ مجاز کا گھر دریا کے اس پار تھا اور وہ ادھر ہی سے آتے جاتے تھے۔ بس آپ کو بتاؤں کہ کلکتہ بمبئی کی تو خیر بات الگ ہے مگر شمالی ہند میں نئی تہذیب اور نئی روشنی اسی سڑک سے گزر کر پہنچی۔ سرِ شام اور کبھی کبھی صبحدم، یا بیچ دوپہر یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں کیننگ کالج، کیلاش ہوسٹل اور آئی ٹی کالج نکل کر اس سڑک پر آتے اور سبک خرام ٹہلتے ہوئے کافی ہاؤس کی طرف چلے جاتے چاروں طرف نقرئی قہقہوں کی کھنک اور بانسری جیسے آوازوں کا رچاؤ بکھر جاتا۔ لکھنؤ یوں تو مرزا شوق سندیلوی اور خود واجد علی شاہ کی مثنویوں کا افسانوی شہر ہے مگر اس آزادی اور بے باکی سے اس قدر برملا اور نئی لطافت کے ساتھ لڑکے لڑکیوں کی ہم خرامی اس کی تاریخ میں ایک نیا باب تھا۔ قیصر باغ کے چمن در چمن قطعوں اور تختوں

میں دوب کی ملائم نازک گھاس سہانے کتنی داستانیں رکھنے دلوں کے دھڑکتے ہوئے راز اپنے سینے میں چھپائے ہے۔

اور اسی سڑک پر کانگرس اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلوس بھی نکلتے تھے جن میں انقلابی گیت گائے جاتے تھے اور انقلابی نعرے لگائے جاتے تھے۔ آپس کی سرگوشیوں میں آئندہ زندگی کے نقشے بنانے والے جوڑے یہ نئی زندگی، ایک نئی آزاد فضا کا بلند آہنگ مطالبہ کرتے تھے یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ اور اسی گٹھ جوڑ میں ایک طرف تحریک آزادی کے معانی پنہاں ہیں تو دوسری طرف مجاز اور ان کے ساتھی شعراء کی شاعری کے راز اور اعتراف جیسی نظموں کی تعبیریں اور تفسیریں۔

مگر جلال وجمال کی یہ آمیزش جس میں آویزش کے تیور بھی تھے۔ بڑی جان لیوا ثابت ہوئی۔ صرف مجاز کے لیے نہیں بلکہ اس پوری نسل کے لیے جس کی ترجمانی مجاز نے کی ہے۔ اور خود اس تحریک آزادی کے لیے جو اس نسل کے ہاتھوں انجام کار تک پہنچی، یا شاید نہیں پہنچ پائی۔ اعتراف ونیز مجاز کا اپنا اعتراف شکست سمجھ کر پڑھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ نہ قیامت کا جنوں اس کا اپنا تھا نہ اس جنوں کی شکست اس کی شکست تھی۔ مجاز شکست خوردہ آدمی نہیں تھا۔ اس کی موت ایک سپاہی کی سی موت تھی، بستر اطلس وکمخواب پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والے کی نہیں بستر اطلس وکمخواب کا ذکر اس نے اس نظم میں ضرور کیا ہے مگر یہ صرف شاعری ہے حقیقت نہیں ایسے بستر یقیناً مجاز کو میسر آسکتے تھے اور بارہا اسے پیش کیے گئے۔ اس نے ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور آگے بڑھ گیا اور پھر بڑھتا چلا گیا۔ نہ مجاز کی طرح جینا بلکہ زندگی کرنا ہر شخص کے بس کی بات ہے نہ

جنوں کی فطرت وقت میں ویسی خراب خانے کی کچی کھلی ہوئی چھت پر محفل آویز
جلسا گرم جاتا ایسا ہی تھا ہے۔ جس محفل وغیرہ کو اس نے اپنے اس شعر کیا۔
جمع میں آج کی محفل کے اعلان نامے میں شامل ہے، اس میں محفل آرائی کم
شعر پڑھنے اور سننے کی حد تک ہوتی تھی۔ اسی کے بعد مجاز اپنی ہزار ملا بابہ گر
آویز وفاداریوں کو سینے میں سینت کر وتنبارہ جاتا تھا۔ البتہ یہ جو شعر دروازے
پر طغرا بنا کر لٹکایا گیا ہے۔ وہ مجاز کی اپنی حقیقت کا مرقع رہے۔ دفتر شہریار
میں اس کے جنوں کی کارفرمائیاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ وہ اس
کینڈے کا آدمی تھا جس کا ذکر حسرت موہانی نے اس شعر میں کیا ہے ؎

کسی پر لٹ کے رہ جاتا ہے حسرت
ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے

سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ پوری نسل جس کی نمائندگی مجاز کے
اپنی شاعری میں کی بڑی ذہین بڑی طباع لوگوں پر مشتمل تھی مگر ساتھ ہی بڑی
بدبخت، بڑی ناہنجار، بڑی نکمی نسل تھی۔ شاید پوری تاریخ کی سب سے زیادہ
ناکام نسل۔ اس نے سوچا بہت کچھ کر کچھ نہ پائی۔ اور جو کیا وہ غلط۔ اس کے
خواب کی تعبیر الٹی نکلی۔ یہ ایک عالمگیر تاریخی حقیقت ہے۔ جس کا احساس
مجاز کو روز اول سے تھا۔ آوارہ، اعتراف اور آخر میں فکر سب اسی کی
شہادت دیتے ہیں۔ جوش صاحب نے نہ جانے کیوں شاید اپنے فراست
میں ان جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو شاہزادہ کہکر پکارتے ہیں عین اسی طرح مجاز کو
پیغمبر بہار کا لقب دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجاز خزاں کا پیامبر تھا، یہ اور بات کہ
اس نے خزاں کی کانٹوں بھری خشکی کو اپنی زبان کی حلاوت سے نرم اور
گوارا بنا دیا، تقریباً بہار ہی کی طرح رنگین۔ مگر اس نے نسیم بہار کی چنچلتا کے

کہ پچھے خزاں کے جھکڑوں کا شور سن لیا تھا۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

شاعری کی ابتدا ہی سے مجاز کے ہاں اس طرح کے اشعار ملتے ہیں ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

بعد میں آوارہ کے ہر بند کا ٹیپ کا مصرعہ ایک TRAGIC NOTE لیے ہوئے ہے۔ بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں، ہوک سی سینے سے اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی، اور آخر میں پوری نظم اس جھنجھلاہٹ کی للکار پر ختم ہوتی ہے

؎ جی میں آتا ہے یہ سارے چاند تارے نوچ لوں

یہ سب آخر کیا تھا، یہ کسی ایک آدمی کا تجربہ اتنی کمسنی میں نہیں ہو سکتا۔ نہ اعتراف میں مذکور گناہوں کی فہرست مجاز جیسے شریف النفس، ذکی الحس بے ضرر آدمی پر عائد کی جا سکتی ہے۔

سنگ کو گوہرِ نایاب و گراں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آبِ رواں جانا تھا
دشت پر خار کو فردوسِ جواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا

میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے راز غم و حسرت پنہاں

مجازی ذات کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو یہ سب باتیں جھوٹی ہیں۔ مگر پاکستان کو زندگی میں جنت، فردوس جواں کہہ کر یہاں آنے والوں سے پوچھئے تو اس کا حرف حرف سچا ہے مقصد وہی پوری نسل، پوری قوم کا ہے۔ جس نے الٹی تعبیروں والے جھوٹے خواب دیکھے اور انہیں سچا سمجھ لیا۔ آخر میں خدا خدا کر کے بلوگوں نے ایک ملک بنایا۔ وہ ایک مستقل مخمصہ بن کر رہ گیا سمجھ میں نہیں آتا کہ دردکی دوا پائی یا درد لا دوا پایا۔ اس کا دستور لکھنے پر آئے تو گویا امتیاز علی تاج کے چچا چھکن خط لکھنے بیٹھے ردی کی ٹوکریاں اور کمرے کا فرش بچے کچھے کاغذ کے پلندوں اور مڑی تڑی کاغذ کی پڑیوں سے اٹ گیا۔ دستور آج بھی جو ہے وہ معطل ہے، دوسرا لکھا جارہا ہے۔ اور تو اور اب پینے کا پانی بھی سونے نہیں تو چاندی کے بھاؤ بکتا ہے۔ روشنی کا کال ہے۔ کراچی اور لاہور روشنیوں اور رت جگوں کے شہر ہوتے تھے۔ آج یہاں اور وہاں اور ہر شہر کے چراغ شام ہی سے بجھے سے رہتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ، مگر چراغوں کی بے نوری پر ایک شعر بھی یاد آرہا ہے جو پڑھے بغیر رہا نہیں جاتا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو سب نے دیکھا تھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

الطاف چغتائی نے کہا ہے کہ

ایسا لگتا ہے کہ کچھ دیر میں اب
اس بھرے شہر میں ہو بولے گا

دیکھا آپ نے میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں، یہ بلعت کہاں کہاں پہنچتی ہے۔ فکر میں مجاز نے اپنی ساری عمر کے ان عالم آرا، تاریخی تجربات کو یکجا کرنے چھاننے بیٹھے، چھانٹنے پرکھنے اور انھیں کسی رعایت کی لڑی، کسی معنی کے رشتہ میں پرونے کی آخری کوشش کی تھی جو اس طرح ختم ہوئی

؎ آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل، آگ گلستاں نہ بنی
توڑ دینا در زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیق مہ کنعاں نہ بنی

اور دیکھیے۔

بایں انعام وفا اف یہ تقاضائے حیات
زندگی نذر غم خاک نشیناں کر دے
خون دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خون دل صرفِ چمن بندی دوراں کر دے

انعام وفا! خون دل کی قیمت! غالب نے پوچھا تھا ایسے قاتل کا خون بہا کیا ہے ؟ اور اقبال نے جواب دیا تھا صلہ شہید کیا ہے، تب و تاب جاودانی آگے آپ خود سمجھئے۔ سب دونوں وقت ملتے ہیں۔ داستان ختم۔

(کراچی میں یوم مجاز کی تقریب میں پڑھا گیا)

اعلان

تذکرہ شعرائے ہند

شامل ہونے والے شاعروں کی پہلی فہرست

(مختصر حالات زندگی مع انتخاب)

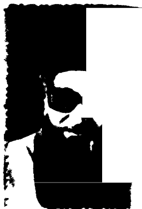
اختر جمال، علی سردار جعفری، برج پریمی، سہا مجددی، کیفی اعظمی، آنند نرائن ملا، حفیظ جعفری، واثق، وحید اختر، شہریار، محسن احسان، شہاب جعفری، بلراج کومل، معصوم رضا راہی، یعقوب راہی، کوثر چاندپوری، اعجاز عظمی، کلیم عاجز، عرفان صدیقی، کمال احمد صدیقی، مظفر حنفی، پرکاش فکری، عادل منصوری، محمد علوی، بشر نواز، بشیر بدر، دیکھ، علی جواد فضل، ابن فیضی، جمیل قریشی، ہما زیدی، غلام ربانی تاباں، سید محمد مہدی، ساجدہ زیدی، ممتاز سعید، شبلی، خالد عابدی، سید طیب، کاوش بدری، محمود ایاس، رفیعہ شبنم عابدی، حسرت فریدی، حمیدہ ستر، کمال، اعجاز احمد امام، عزیز تمنائی، مسعود شہاب، صدیقی، مجیبی، منظر امام، ممتاز راشد، راشد آذر، راغب مرادآبادی، امرتا، افضل جعفر، شیلی، حسرت، گلشن، رونق نعیم، قیصر کریم، مہاراج کومل، راج نرائن راز، کمار پاشی، کرشن موہن، کیلاش ماہر، شہاب، محبوب علی خاں، حلیم، حبیب ہاری، نشتر خانقاہی، رؤف صادق، علی ظہیر علی، ملک زادہ منظور احمد، ملک زادہ جاوید، اختر بستوی، دیپک قمر، اختر نظمی، شجاع خاور، گنیش بہاری طرز، صالحہ عابد حسین، زیدی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ظفر گورکھپوری، مسعود حسین، اختر سعید خاں، امین اشرف، بھگوان داس، چندر بھان خیال، پرکاش تیواری، بسمل، اویس احمد دوراں، انجم عرفانی، قاضی سلیم، عزیز قیسی، حسن کمال، باقر مہدی، حلیم، نشتر، علی سردار، ساغر اعظمی، سریش، عزیز احمد، انور کیفی، انور مسعود، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انیس انصاری، احمد سوز، ناداں، حامد اللہ آبادی، آل احمد سرور، خورشید الاسلام، عرفی، احتشام اختر، سلطان اختر، انوار باندوی، ساحر ہوشیارپوری، قیصر قلندر، فضیل جعفری، فیروز ظفر، عالم خورشید، وقار خلیل، واحد پریمی، وقار صدیقی، علی باقر زیدی، عزم گونڈوی، ادیب سری واستو، عابد عالمی، جاوید وششٹ، غلام ربانی، غیاث الدین فریدی، والی آسی، مسعود حیات، کامل قریشی، یعقوب عامر، موہن تم، نعیم حنفی، مظفر، اجمل اجملی، محمود ایاز، گلزار دہلوی، عارف دہلوی، تنویر احمد علوی، مظفر حسنی، معین چشتی، کیف بھوپالی، وارث کرمانی، سرسوتی سرن کیف، ظفر گورکھپوری، انیس جہاں، وہاب دانش، حسن عسکری، لطف الرحمن، ..... شاہد احمد شعیب، حامدی کاشمیری، حکیم منظور، انور مینائی، سلام سندیلوی، رضوی، محمد علی موج، وجاہت سندیلوی، شاہد حسن مرادآبادی، آشفتہ چنگیزی، باقر مہدی، حسرت سہسوانی، محسن زیدی، کاوش پرتاپ گڑھی، احسن رضوی، صلاح الدین پرویز، مناظر عاشق ہرگانوی، شمس الرحمن فاروقی، جینت پرمار، شہپر رسول، شمیم فاروقی، رؤف خیر، سیدہ احتشام، شاہد کلیم، ضیا، سیفی سرونجی۔

یہ نام بغیر کسی ترتیب کے لکھ دیے گئے ہیں

اپنا منتخب کلام اپنی تصویر اور مختصر حالات زندگی کے ساتھ بھجوایئے

تذکرہ جلد ہی شائع ہوگا

ادارہ



بیکل اتساہی

محمود درویش

(فلسطینی انقلابی شاعر)

ایسا ہونے دے اے میرے نغموں کی جاں
یہ جو شاداب زیتون کے پیڑ ہیں
ان کی شاخیں جو الجھی ہیں
سب چھانٹ کر
درد کے گیت
یا غم کے نغمے ہیں جو
ان کی دہکی ہوئی آگ میں پھینک کر
مجھ کو کرنا ہے اب موت کا سامنا
ایسا ہونے دے اے میرے نغموں کی جاں

بیکل اتساہی

مشاہدہ واستعجاب

اونچے اونچے محل
سُونے سُونے سے دیوار و در
کتنے کچے مکانوں کو توڑ گیا ؟

ایک سناٹا چھایا ہوا
ایک جہاں سانس روکے ہوئے رات بھر
کتنے گیتوں کا لہجہ مروڑ گیا ؟

صاف ستھری سڑک
سہما سہما ہوا موٹروں کا سفر
کتنی پگڈنڈیوں کو نچوڑ گیا ؟

بیکل اتساہی

بدلتے سائے

فن کا اک اندھا کبوتر جو نچ میں
لیکے پیمائش کا تنکا بادلوں کے پاس
پہنچا ہے ابھی
گھونسلا اپنا بنانے کی ہے فکر
بجلیوں کے درمیاں
دیکھنا مقصود ہے
فکر کی کتنی بلندی تک پہنچتا ہے کوئی
کس قدر سرمست ہے پرواز میں

۲

لکھ رہا ہوں تازگی کی داستاں
محوِ حیرت ہے زمانہ دیکھ کر

مگر کا انداز بدلا ہے میرا
اک نیا احساس اپنے ساتھ ہے
رنج و غم کو دے رہا ہوں میں مسرت کا خطاب
چل رہی ہے گرم لو
اک اداسی کا سماں ہے جا بجا
گرچہ سوکھے ہیں چمن میں سارے پھول
لکھ رہا ہوں تازگی کی داستاں

۳

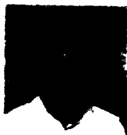
خود غرض ہے کس قدر یہ آدمی
اپنی شہرت کے جنوں میں بے قرار
کیا اثر پڑتا ہے نوکِ خامۂ بے دل کا
قارئینِ وقت پر
کچھ بھی تو احساس ہو
پھر بھی لکھ ڈالا ہے قتل و خوں کا قصہ کھول کر
بے ثمر اخبار میں
آگ کی مانند پھیلی ہے خبر
آدمی ہے خود غرض شہر میں

بیکل اتساہی

گیت

دن بھر اپنے انگ انگ میں رچی مدھر رچنا
رات میں بکھر گیا سپنا
میں الھڑ اپنے درپن میں بے سُدھ کھوئی کھوئی
کوری آشاؤں کی سیج پر کب جاگی کب سوئی
آنکھ کھلی تو دیکھ رہا تھا مجھ کو میرا انگنا
رات میں بکھر گیا سپنا
بعد ملن کے پور پور میں چھلکی بھرے گلابی
پھولوں سے کومل گالوں پر تتلی کی بے تابی
گدرائے ہونٹوں کو چھو گیا گیتوں کا سگنا[۱]
رات میں بکھر گیا سپنا

۱ طوطا



بیکل اتساہی

غزل

برکھا بارہ ماسی　　پھر بھی دھرتی پیاسی
تازہ تازہ چہرے　　رنگت باسی باسی
لفظ لفظ بنجارے　　گیت گیت سنیاسی
سڑکوں پر ہنگامے　　گھر کی لاج اداسی
قتل کریں پھر روئیں　　آنکھیں بڑی سیاسی
کوڑی کے سب سودے　　بھاؤ مگر الماسی
گاؤں ہے ننگا بھوکا　　کھیتی اچھی خاصی
لکھ لے موت یقینی　　جیون مان قیاسی

بیکل جھوٹ کا عادی
سچ بولے تو عاصی

بیکلؔ اتساہی

غزل

کھنڈر بنے ہوئے ہیکل رہائشی نکلا
نگر نگر کا لٹیرا مہارشی نکلا

جلایا شہر کبھی کھیتیوں کو پھونک چلا
یہ آدمی جو تمنا کی وہ آتشی نکلا

بہت حسین تھا مفہوم داستانِ حیات
ہجوم لفظ و بیاں بھی نمائشی نکلا

ہوا کچھ اب کے ترے شہر کی ہے ایسی
کہ جس سے ہاتھ ملایا وہ سازشی نکلا

چلا میں چھوڑ کے گھر ہر متاعِ رنج و الم
مگر خیالِ سفر آزمائشی نکلا

بڑا ہی نام تھا بیکلؔ کا پارسائی میں
مگر وہ فردِ عمل سے سفارشی نکلا

خورشید طالب

غزل

جب تک وہ پیڑ سبز رہا بے ثمر لگا!
جب سوکھنے لگا تو ہمیں معتبر لگا!

باطن میں قصرِ شاہ بظاہر کھنڈر لگا
بستی کا ہر مکان مجھے اپنا گھر لگا

پچھلے پہر میں اٹھ رہا تھا دعا کے لئے
پھر آکے ایک تیر مرے ہاتھ پر لگا

توڑا تو تھا گھروندہ مرے اپنے ہاتھ نے
الزام بے گناہ ہواؤں کے سر لگا

دیوار و در کو اپنا لہو تک پلا دیا
پھر بھی یہ گھر ہمیشہ کرائے کا گھر رہا

اپنی زمیں تو خانماں برباد تھی مگر
اس کی طلب کا چاند نگر بھی کھنڈر لگا

خورشید طالب

غزل

ہے صداؤں سے تہی شہر سماعت ان دنوں
ہو گیا ہے ہر کوئی خاموش فطرت ان دنوں

نیوے سانپوں کے گھر میں پل رہے ہیں دھمکیاں
ہے بہت ہی غیر اس جنگل کی حالت ان دنوں

وہ رفاقت کی نہیں دیوار سمجھوتے کی ہے
جس پہ قائم ہے تعلق کی عمارت ان دنوں

جس نے بے سایہ سمجھ کر کاٹ ڈالا تھا مجھے
خوب رلاتی ہے اسے میری ضرورت ان دنوں

رائیگاں دھڑکن دلوں کی اور سانسوں کی دلیل
ہر جگہ مشکوک ہے اپنی حقیقت ان دنوں

ان جلے فقروں کو مت دل سے لگائے زندگی
ہے ذرا ناساز یاروں کی طبیعت ان دنوں

سب کے آگے خود نمائی کے مصلے ہیں بچھے
ہے صحیفوں کی جگہ جھوٹی حکایت ان دنوں

راستوں کے پیڑ پر ہوتا ہے رہزن کا گماں
ہم کہاں جھاڑیں طالب گرد مسافت ان دنوں

عبدالمتین جامی

غزل

داستانوں کا مقدر ہو گئی ہیں بجلیاں
درد کے ٹوٹے مکانوں کو گئی ہیں بجلیاں
کس قدر سرعت سے کر کے جسم کو بے آبرو
ذہن کے تاریکیوں میں کھو گئی ہیں بجلیاں
میں چراغِ جستجو لے کر کھڑا ہوں راہ پر
پتھروں کے گنبدوں پر سو گئی ہیں بجلیاں
روح کی چادر پہ باقی رہ گئے گرد و غبار
جسم کی آلائشوں کو دھو گئی ہیں بجلیاں
سامنے اپنے کھڑا ہے خواب کا اونچا محل
سر فصیلوں کے پیچ و خم میں کھو گئی ہیں بجلیاں
حسرتیں پودوں کی صورت میں اگیں گی ذہن میں
واہموں کے تخم جامی بو گئی ہیں بجلیاں

رضا امام

العطش! العطش!

نام تھا امداد حسین۔ پکارے جاتے تھے مدو میاں۔ رنگ صاف ستھرا، ڈھلا ہوا سا۔ آنکھیں کھلی کھلی، چہرا کیپسول جیسا، اور جتنا ناک سے اوپر اتنا ہی ناک سے نیچے۔ اوپر کا ہونٹ نچلے ہونٹ سے دبا ہوا۔ ہاتھ لمبے، کندھے ڈھلکے ہوئے اور یوں بڑی بنی تلی مگر کچھ ڈھیلی ڈھالی۔

کئی مرتبہ نوکری کی لیکن ہر بار چھوڑ دی۔ گھر میں میاں بیوی کل دو نفر تھے، گزارے کے لیے دو پشتینی مکانوں اور کچھ دکانوں کی آمدنی کافی تھی، پھر کیوں کسی کی غلامی کی جائے۔ ویسے بھی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ دن بھر فرصت سے لیٹے پڑھتے رہتے تھے۔

مذہب کے بہت پکے تھے، مگر گھر سے باہر جا کر نماز پڑھنا پسند نہیں تھا۔ مجلسوں میں بھی بس کبھی کبھار ہی جاتے تھے حالانکہ مرثیہ بڑی درد بھری آواز میں پڑھتے تھے۔ محرم میں اکثر گھر بیٹھے، آنکھیں بند کیے مرثیہ گنگناتے رہتے تھے۔ اگر کسی نے کہیں چلنے کو کہا تو تنک کر کہتے۔

"ارے بھئی، ہم کربلا سننا نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں میر صاحب کا مرثیہ محسوس کرنے دو۔"

انہیں بتا دیا گیا کہ پھر کوئی بچہ نہیں لیتا تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ اگر نہیں چندہ ملی تو پھر مدو میاں اپنی خیریت دیکھیں گے نہ دوسرے کی۔

جب طالب علم تھے تو ایک مرتبہ اپنی اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کالج سے بس نکالے جاتے جاتے رہ گئے۔ امتحان میں ان کے آس پاس کا کوئی لڑکا بول رہا تھا۔ نگراں کو ان پر شک ہوا۔ مدو میاں یہ کہاں برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ان پر بے ایمانی کا شبہ کرے۔ بھپر ہی تو گئے بولے۔

"جب آپ لوگ ٹھیک سے پڑھاتے نہیں تو ہم تو نقل کریں گے ہی، آپ سے پکڑتے بنے تو پکڑ لیجیے۔"

نگراں بھی کوئی جلے دل تھا۔ اس نے ان کے خلاف رپورٹ کر دی۔ بڑی مشکل سے دوسرے استادوں کی سفارش پر، جو ان کی عادت اور مزاج سے واقف تھے، معاملہ رفع دفع ہوا۔

ان کی شادی بھی بڑے عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ ان کے ایک عزیز دوسری شادی اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ ان کی پہلی بیوی بانجھ تھی۔ بیوی بھی رشتہ داروں ہی میں سے تھی۔ اس لیے کچھ لوگوں کے کہنے پر مدو میاں بیچ میں پڑے اور اپنے ان عزیز کو، جو دوست بھی تھے، سمجھانے کی کوشش کی کہ بیوی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مگر وہ عزیز نہیں مانے اور بات بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ عزیز جھنجھلا کر بولے۔

"اگر اس بانجھ سے ایسی ہی ہمدردی ہے، تو میں طلاق دیے دیتا ہوں تم شادی کر لو۔"

مدو میاں ایک لمحے کے لیے تو ٹھٹکے اور پھر ہاں کر دی۔

اپنے مزاج کی اس ٹیڑھ سے مدو میاں اچھی طرح واقف تھے۔ اس

لیے خود ان کی کوشش زیادہ تر یہی ہوتی تھی کہ کسی معاملہ میں پڑنا اٹھائیں لیکن پھر بھی کہیں پھنس جاتے تھے۔ اور یہی ایک مرتبہ پھر ان کے ساتھ ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا، اور وہ بھی گرمیوں کے رمضان کا بازار میں سناٹا ساتھا۔ کچھ دکانیں تو دھوپ کی وجہ سے بند تھیں اور کچھ رمضان کی بنا پر۔

ویسے تو رمضان میں مسلم آبادی والے علاقوں ہمیشہ ہی احتراماً ہوٹل اور چائے خانوں پر پردے پڑے رہا کرتے تھے، لیکن اس سال تمام کھانے پینے کی یہاں تک کہ پان سگرٹ کی بھی دکانیں بند کرادی گئی تھیں۔ پچھلے سال کے ہندو مسلم فساد کے بعد سے الگ الگ مذہبی پہچانوں کو نمایاں کرنے کی خواہش لوگوں میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ محلہ کے بے فکروں کو نہ صرف ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا بلکہ اپنی اہمیت جتانے کا ایک ذریعہ بھی۔ روز نئی نئی تجویزیں سوچی جاتی تھیں۔ اور انہی میں سے ایک یہ تھی کہ رمضان کے مبارک مہینہ میں کسی ایسے غیرے کو بھی اس بات کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ وہ سربازار روزہ نہ رکھنے کا اظہار کرتا پھرے۔

مدو میاں روزے سے تھے۔ مگر چونکہ وہ اس میں یقین رکھتے تھے کہ روزہ کامیاب جب ہی ہوتا ہے جب آدمی روزمرہ کے کاموں میں فرق نہیں آنے دیتا، اس لیے آج وہ ٹھیک ٹھیک دوپہر میں کہیں سے چلے آرہے تھے۔ کھانے پینے اور پان سگرٹ کی دکانوں کو بند دیکھ کر انہیں بھی بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ پیاس چمکی ہوئی تھی اور تھکاوٹ طاری تھی۔ ایسے میں اگر بازار میں برف لگی ٹھنڈی بوتلیں نظر آئیں اور زردہ کی مہک ناک میں پہنچتی تو بھلا دل پر کیا نہ گزرتی۔

تبھی اچانک ان کی نظر دو آدمیوں پر پڑی جو بے چینی سے کبھی ادھر کو

دکانوں کی طرف جاتے تھے اور کبھی ادھر کی۔ مدو میاں انہیں پریشان دیکھ کر ان کے پاس گئے اور ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔

"بھائی صاحب" ان میں سے ایک بولا۔ "ہم ادھر ایک صاحب سے ملنے آئے تھے لیکن وہ شاید یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔ اب ہم کچھ کھانے پینے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر یہاں تو کھانے پینے کی سب دکانیں بند ہیں۔ پیاس کے مارے اس گرمی میں جان نکل جا رہی ہے۔"

مدو میاں نے انہیں دلاسہ دیا اور سوچا کہ کسی نہ کسی دکاندار کے پاس تو پانی ہوگا ہی ان کو پلوا دیں گے۔ مگر جس دکاندار سے بھی انہوں نے پانی کے لیے کہا اس ہی نے انکار کر دیا۔ دراصل پہلے دن کچھ پان سگرٹ اور چائے خانے والوں نے چپکے چپکے کچھ بکری کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب چند جوشیلے نوجوانوں کو اس کا پتہ لگا تو انہوں نے طے کر لیا کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہے ان پر اپنا خوف بٹھائیں گے۔ نتیجہ میں بازار میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بوتلیں ٹوٹ گئیں، کتنے سگرٹ کے پیکٹ غائب ہو گئے، اور ایک دو روزہ چوروں کے تو ٹھنڈے پانی کے کیتلر بھی غائب ہو گئے۔ اس لیے اب کسی دکاندار کی ہمت نہیں تھی کہ کھلے عام یہ ظاہر کرے کہ وہ روزہ سے نہیں ہے۔

مدو میاں اپنی ناکامیابی پر کچھ کھسیانے سے گئے۔ ان دونوں کو تو اپنے گھر لے جا کر پانی پلوایا اور جو کچھ موجود تھا کھلوایا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جی میں ٹھان لی کہ اس جبر کے خلاف آواز ضرور اٹھائیں گے۔

اسی ارادے سے شام کو، روزہ کھولنے کے بعد، چوراہے پر بنو پان والے کی دکان پر پہنچ گئے۔ بنو کی دکان اس علاقہ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ کبھی صرف پان سگرٹ کی دکان تھی۔ مگر اب یہاں چائے اور لسی وغیرہ بھی ملنے لگی

تھی مسجد پاس ہی تھی اس لئے مغرب کی نماز کے بعد اس دکان پر اچھی خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ سٹیریو کی جھمجھاتی آواز کے سایہ میں لوگ چائے اور لسی کی چسکیاں لیتے رہتے تھے، لکا، تھمس اپ اور ڈبل سیون کے کاگ کے پے جھاگ اڑتے، اور زردوں کی مہک سگرٹوں کے دھوئیں اور پاس کے کبابچی کی دکان سے اٹھتے والی خوشبو میں مل جل کر فضا میں گھلتی رہتی۔ یہاں تہمد اور داڑھی والے بزرگ کی نظر آتے تھے اور رنگ برنگی ٹی شرٹیں اور جینز یا طرحدار کرتے پہنے نوجوان بھی۔ یہ لوگ گھنٹوں بیٹھے کھڑے ادھر ادھر کی باتیں یا کسی مسئلہ پر بحث کرتے رہتے یا پان چباتے، دھواں اڑاتے، دکان کے تختے کے سہارے ٹیڑھے کھڑے سامنے گھورتے رہتے تھے۔ اسی دکان پر اس علاقہ کی ظاہری زندگی سے متعلق اہم فیصلے ہوا کرتے تھے۔

مدو میاں کی باتیں سن کر کئی لوگ ان کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ مگر کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ دکانیں بند کرانا کوئی غلط کام ہے۔ آخر مسلمان کی مسلم علاقہ میں اپنے کلچر کا خیال نہیں رکھیں گے تو پھر اور کون رکھے گا۔ اور پھر ایسی باتوں کا اثر دوسروں پر کتنا اچھا پڑتا ہے۔ سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان اپنے عقیدہ میں کتنے پکے ہیں۔ یہ تو اسلامی ڈسپلن کا بہترین اظہار ہے۔ ایک دو لوگوں نے کچھ دبی دبی آواز میں مدو میاں کی طرفداری بھی کرنا چاہی مگر عام موڈ دیکھ کر چپ ہو گئے۔ اپنے کو اکیلا پا کر مدو میاں کا پارا اور چڑھ گیا۔ اپنے دونوں بازو اٹھاتے ہوئے گرج کر بولے:

"تم نہیں مانتے تو مت مانو۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ ان بازوؤں میں ابھی اتنا دم ہے کہ اپنے ارادے کو خود پورا کر سکوں۔ کل سے میں سبیل لگاؤں گا۔ دیکھوں کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔"

لوگوں نے مدو میاں کے اس دعوے کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مجمع میں پیچھے سے کسی نے پھبتی بھی کسی۔ چلو مدو میاں اسی بہانے کوئی مفید کام تو کر گئے۔ مگر یہ کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ واقعی مدو میاں اپنی دھمکی پر عمل کر بیٹھیں گے۔ اس لیے اس وقت سب حیران رہ گئے۔ جب دوسرے دن دوپہر کو انہوں نے دیکھا کہ بازار کے آخری کونے پر، جدھر سائیکل کی مرمت کرنے والے اور موچی وغیرہ بیٹھتے تھے، مدو میاں شامیانہ اور قنات لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک بڑا سا بینر ٹنگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے: پانی پیو تو یاد کرو پیاس حسین کی۔ اور ایک تخت پر دو بڑے بڑے پانی بھرے مٹکے اور کچھ آبخورے اور گلاس رکھے ہوئے ہیں۔

پہلے دن تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جو بھی دیکھتا مسکرا کر گزر جاتا۔ لیکن جب دوسرے دن بھی مدو میاں نے سبیل لگائی اور ان کی نگرانی پر تعینات نوجوانوں نے دیکھا کہ سبیل پر راہ گیروں کی، خاص طور پر گاؤں والوں، بکنے والوں اور مزدوری کرنے والوں کی، تعداد بڑھتی جا رہی ہے تو یہ سوچنا پڑا کہ اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کارروائی کرنا ضروری ہے۔ ورنہ اوروں پر بھی اس کا برا اثر پڑے گا۔

تیسرے دن، جب مدو میاں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے، تو اچانک ایک غلہ آکر ایک مٹکے میں لگا۔ اور پھر ایک اور دوسرے مٹکے میں۔ اور اس سے پہلے کہ مدو میاں سلام پھیر کر نماز سے اٹھیں کئی غلے آئے اور دونوں مٹکوں کا پید بہ نکلا۔ مدو میاں بہت گرجے برسے، ادھر ادھر دیکھا، لوگوں سے پوچھا، مگر نہ انہیں کوئی غلیل والا نظر آیا، نہ ہی کسی نے ہامی بھری کہ اس نے کسی کو غلیل چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

عام خیال یہ تھا کہ اس واقعہ کے بعد مدو میاں کی ہمت پست ہو جائے گی مگر اس کے اگلے دن دیکھا تو مدو میاں لکڑی کے ایک نے بنائے لمبے سے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے ان کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے آئس بکس رکھے تھے۔ اور کاؤنٹر کے نیچے کئی کریٹ مختلف قسم کے کولڈ ڈرنکس کی بوتلوں سے رکھے ہوئے تھے۔ بس نہیں بلکہ انہوں نے قناعت اور شامیانہ کی جگہ باقاعدہ لکڑی کا ایک کیبن بھی بنوانا شروع کر دیا تھا۔

مدو میاں کی اس حرکت سے نوجوانوں میں سخت غصہ پھیل گیا۔ آخر یہ خبطی اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔ اس غصہ میں ان کولڈ ڈرنکس کے دکانداروں کا غصہ بھی شامل تھا جن کی دکانیں دن بھر بند پڑی رہتی تھیں اور جن کے گاہک مدو میاں اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

بات بگڑتی دیکھ کر کچھ بزرگوں نے مدو میاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ مدو میاں خوامخواہ ہی لڑکوں سے الجھ رہے تھے۔ آخر یہ بچے کوئی [illegible] کام تو کر نہیں رہے تھے۔ جو کچھ کر رہے تھے۔ اپنے مذہب ہی کے لیے [illegible] کر رہے تھے۔ رہی شدت پسندی تو یہ تو صرف عمر کا تقاضہ تھا۔ اب شدت [illegible] نوجوانوں میں نہیں ہوگی تو کیا بوڑھوں میں ہوگی۔

مگر مدو میاں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ الٹے بگڑ کر بولے "یہ مذہب میں مذہب کے نام پر کلنک ہے"

مدو میاں کے اس اپیل پن پر جن کو ان سے کچھ ہمدردی تھی وہ بھی جھنجھلا [illegible] اور ان سے بالکل بے تعلق ہو گئے۔ اگر کسی کی شامت ہی آگئی ہو تو کوئی [illegible] کر سکتا ہے۔ اور شامت کو آنے میں دیر نہیں لگی۔

[illegible]

ممدو میاں عادت کے مطابق بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک پتھر اُگراں کے تسبیح والے ہاتھ میں لگا۔ اور تسبیح ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ دردکے باوجود ممدو میاں نے جلدی سے تسبیح کو اٹھایا، چوم کر کاؤنٹر پر رکھا اور تلملاتے ہوئے باہر آئے۔ گرج کر بولے۔

"کون حرامزادہ ہے! ذرا سامنے آئے۔"

ان کا یہ کہنا تھا کہ ایک دم چاروں طرف سے کئی اجنبی مشٹنڈے نکل آئے اور ممدو میاں کی جانب دھمکی بھرے انداز میں بڑھنے لگے۔

"کون ہے! گالیاں کیوں بک رہا ہے بے فضول میں؟"

ایک نے کہا۔

"ابے ایک تو خود رمضان میں حرام کام کرتا ہے۔ ٹھنڈا بیچ کر اور اوپر سے دوسروں کو برا بھلا کہتا ہے" دوسرا بولا۔

"ٹانگیں توڑ دو اس کی" کسی نے کہا۔

"ذبح کر دو سالے کو" کوئی غرایا

ممدو میاں سناٹے میں آگئے۔ غصہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ اور اس کی جگہ سارے جسم میں برف سی تیر گئی۔ پتھر جیسے قدموں سے چلتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے جاکر کھڑے ہوگئے۔ ایک ہاتھ میں ایک ننھی سی ہتھوڑی کس کر پکڑلی اور دوسرے سے کاؤنٹر کو مضبوطی سے پکڑلیا۔ وہ ان لوگوں کے پاس آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر انہیں بالکل پتہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کے پاس آنے پر کریں گے کیا۔ بس خواب کے سے عالم میں انہیں آگے بڑھتا ہوا دیکھ جا رہے تھے۔

کاؤنٹر کے پاس آکر وہ لوگ گئے اور ممدو میاں کو گھورنے لگے۔:

جلد سی دیہاتی سلرٹی ہوئی، چمکتی آنکھیں مدو میاں پر جمی رہیں۔ ان کے ہونٹوں پر ایک ٹیڑھی سی مسکراہٹ تھی۔ اور ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک آگے جھکتا ہوا بولا۔

"لا ہمیں نہیں پلائے گا بوتل "

دوسرے نے آگے بڑھکر ایک بوتل اٹھائی، مدو میاں کی طرف دیکھتے ہوئے باچھیں پھیلا کر ہنسا، اور بوتل سڑک پر دے ماری۔ ایک چھناکے کے ساتھ بوتل پھٹ کر بکھر گئی اور وہاں سب نے بڑے زور کا ٹھٹھا لگایا۔ اور پھر وہ خاموشی سے کھڑے ہوکر مدو میاں کو گھورنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کاؤنٹر پہ پڑا ہوا ایک تنکا اٹھایا اور کاؤنٹر کے سہارے کھڑا ہوکر دانتوں میں خلال کرنے لگا۔

مدو میاں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ بس انہیں تکے جارہے تھے اور ان کے آگے کچھ کرنے کا انتظار کیے جارہے تھے۔ اتنے میں مسجد کی جانب سے کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر مدو میاں کی جان میں جان آئی لیکن اچانک وہ مسٹنڈے بھی چست ہوگئے۔

"کیوں بے تو جائے گا یہاں سے یا ہم تجھے کچھ توڑیں پھوڑیں۔ تیری یہ دادا گیری نہیں چلے گی۔ بند کر دکان کو "

مگر مدو میاں کو اب مدد کی امید تھی۔ انہیں یقین تھا کہ جیسے ہی محلہ والے نزدیک آئیں گے یہ غنڈے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ منہ سے تو کچھ نہ بولے لیکن کاؤنٹر کے پیچھے ذرا تن کر کھڑے ہوگئے۔ اتنی دیر میں نمازی پاس آگئے ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کیا بات ہے مدو میاں؟"

مگر اس سے پہلے کہ مدو میاں اپنی آواز پائیں ان غنڈوں میں سے ایک بول اٹھا۔

"بات کیا ہے صاحب۔ سمجھا رہے ہیں کہ بھیا رمضان کی توہین نہ کرو تو گالیاں دیتا ہے:"

مجمع میں سے کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں

"سچ۔ سچ! مدو میاں کتنی بری بات ہے!"

مدو میاں کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنے میں ایک آواز آئی۔

"ارے یہ ایسے نہیں مانے گا۔ پھینک دو اٹھا کے سالے کو اور اس کے سامان کو۔"

اور پھر چاروں طرف سے چیزوں کے ٹوٹنے پھوٹنے اور بوتلوں کے پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مدو میاں کو اب احساس ہوا کہ اس وقت ان کا کوئی دوست نہیں ہے۔ وہ صرف دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

وہ دوڑ دوڑ کر ایک ایک کی خوشامد کرنے لگے۔

"بھیا! ارے بھیا! سنو تو..."

"دیکھو میں مذہب کا مخالف نہیں ہوں۔"

"ارے میں تو خود روزے سے ہوں۔"

"ارے بھئی! میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں۔"

مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ اس میں زیادہ تر محلے کے لوگ تھے۔ مگر وہ تماش بینوں کی طرح الگ کھڑے ہوئے تھے۔ مدو میاں کو گڑگڑاتا دیکھ کر ان میں ایک کھسیاہٹ کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ جیسے جیسے مدو میاں کی گڑگڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی ویسے ہی ویسے ان میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی

مدو میاں چلا رہے تھے۔
"مارے ظلم نہ کرو!"
"تمہیں خدا کا واسطہ!"
"تمہیں رسول خدا کا واسطہ!"
"تمہیں حسین کا واسطہ!"

اچانک تماشبینوں میں سے ایک شخص تڑپ کر باہر نکلا اور اس نے مدو میاں کے سر پر ایک بوتل کھینچ ماری۔ مدو میاں تیورائے اور کاؤنٹر کے پیچھے گر پڑے۔ ایک پل کے لیے سب کچھ تھم گیا اور پھر ایک دم سے بھونچال سا آگیا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کرنا چاہ رہا تھا۔ بوتلیں پھٹ رہی تھیں۔ ان کے ٹکڑے اڑ اڑ کر لوگوں کو لگ رہے تھے۔ مگر کسی کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جس کے جو ہاتھ لگ رہا تھا توڑ رہا تھا۔ جس کو کچھ نہیں مل رہا تھا بھنائے ہوئے چیتے کی طرح چکر کاٹ رہا تھا شامیانہ گر پڑا۔ کاؤنٹر اور لکڑی کے تختوں کے پرانچے اڑ گئے۔ کسی نے مٹی کا تیل جلا کر کپڑے اور تختوں کے ٹکڑوں پر پھینک دی۔ تھوڑی ہی دیر میں آگ چاروں طرف بھڑک اٹھی۔

اچانک کوئی چلایا "پولیس!" اور منٹوں میں سارا مجمع پگھل کر غائب ہوگیا۔

جب پولیس وہاں پہنچی تو کوئی عصر کا وقت ہوگا۔ چاروں طرف دھواں پھیلا تھا۔ بہتے ہوئے سیال میں یہ بتانا مشکل تھا کہاں شراب ہے اور کہاں خون۔ ادھ جلے ملبے میں سے دو بازو باہر نکلے ہوئے تھے۔ بینر کا جو حصہ جلنے سے رہ گیا تھا اس

پر "پیاس حسین کی ہے" کے الفاظ چمک رہے تھے اور ایک کونے میں کسی چیز سے دبا ہوا کسی اسلامی کیلنڈر کا ایک صفحہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ جس پر سبز جلی حروف میں لکھا ہوا تھا محرم کا مہینہ برکتوں اور نیکیوں کا مہینہ ہے!"



(ایک بنگلہ افسانہ)
سنیل گنگوپادھیائے

مترجم: شاہد محمد جشپوری

دوراُداس

"اے بلاؤ تو، بدھو کو بلا"
"بلایا، استاد"
"ٹیک کر جا، اور دوڑ کر آ۔ کتے کی چال، بلی کی چال نہیں، سمجھا؟"
"سمجھ گیا استاد، حلق سے چائے اتار لوں"
"جاتے جاتے پتہ لگانا، نو بجے بس کا راناگھاٹ لوکل، لیٹ ہے یا نہیں"
"اسٹیشن جاؤں؟"
"ہاں جا۔ اور بدھو کو بولنا فوراً آئے"

چائے خانہ سے اٹھ کر ڈبو چلا گیا۔ اس کی چال نرالی ہے۔ دیکھنے پر ایسا لگتا ے کہ اس کے جسم کے کسی حصے میں کوئی مرض ہے۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ کر چلنا ہیں جانتا۔ دائیں بائیں یا پیچھے سر گھماتا رہتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ کبھی بھی یکساں طور باہر نہیں رہتے۔ ایک ہاتھ پاکٹ میں ضرور رہے گا۔ چلتے چلتے وہ بار بار ڑک پار کر کے ادھر سے ادھر فٹ پاتھ بدلتا رہتا ہے۔ کسی خاتون کو دیکھتے ہی

اس کی نظر پھیکی سی آتی ہے۔ تب وہ منہ لٹکائے ہونٹ چبائے اور آنکھیں پھیر پھیرتا ہے جتنا زیادہ تقاضا مند ہوگی اس کی پرچھائیاں اتنی ہی بڑھتی جائیں گی۔

"اے پہری، ادھر آ"

"کیا استاد؟"

"دیکھ تو اس مشین کو کیا ہوا؟ سالا چلتا نہیں ہے کل سالے میں تیل بھرا"

"پتھر ختم ہو گیا ہوگا"

"دھت تیری کا"

"یہ کیا استاد، پھینک دیا، استاد جی؟"

"چم...... مار..... اور آئے گا"

پہری چپ ہو گئی۔ استاد یعنی پلتو کی عادت سے وہ آگاہ ہے۔ ایک ایک دن پلتو کو ایسا ہوتا ہے۔ اس دن وہ چیزوں کو برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ ابھی جو قیمتی لائٹر پھینک دیا، اگر اب پہری اسے اٹھا لے، تو خوب گالیاں کھائے گی۔ ذرا دیر پہلے سگریٹ خرید کر روپیہ تڑاتے وقت پلتو کے ہاتھ سے ایک روپیہ زمین پر نیچے گر پڑا تھا۔ پلتو نے اسے نہیں اٹھایا۔ قریب ہی ایک بھکاری بچہ، ایک اور آدمی کے سامنے کھڑا اپنی رٹ لگا رہا تھا۔ پلتو نے اس کو بلا کر روپیہ دکھا کر بولا۔

"اے لے لے یہ لے"

آج پلتو اور بھی بہت کچھ پھینک دے گا یا خراب کرے گا۔

پلتو، پہری، ڈبو، بدھو ــــــ ان میں سے ہر ایک کا ایک اچھا نام بھی ہے۔ لیکن طویل عرصہ تک ان ناموں کا استعمال نہیں ہوا ہے، کسی نے ان اچھے ناموں سے نہیں بلایا۔

وہ سب چائے خانہ کے ایک کیابن میں بیٹھے ہیں۔ پردہ گرا ہوا نہیں ہے۔

ہوئے کہاں کوئی نہیں جائے گا۔ نہ جانے پر ہوٹل کا بیرا بھی ادھر جھانک کر نہیں دیکھے گا۔

اپنے کپ میں بچی چائے تھی پلٹو نے وہ کیس ٹرے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ذرا جھانک کر احتیاط سے نیچے فرش پر رکھے ہوئے جھولے سے ایک شراب کی بوتل نکالی۔ اپنے آپ کو پورا بھرنے کے بعد پرّی سے بولا "دے، کپ دے۔ کے سامنے نہیں نکالا۔ وہ ذرا سی میں بہک جاتا ہے۔ دیکھتی ہو کیا مال ہے شو

پرّی بوتل کا لیبل پڑھ کر بولی ——— ارے لبس۔ بہت خوب ؟ !

پلٹو کپ اٹھا کر ایک گھونٹ میں تمام پی گیا چہرے پر ہلکی لکیر تک نہیں ابھری۔ ہلکی نہیں آئی۔ پرّی ایسی نظروں سے اس کو تکتی رہی جیسے شاباشی دے رہی ہو۔ رہی ہو ——— یوں نہ ہو تو پھر استاد کیا معنی ——— !

وہ تلخ عرق پیے کا ردعمل صرف پلٹو کی آنکھوں ہی میں دیکھا گیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

کپ پھر سے بھر کر پلٹو بولا ——— ایسے میں کون سب سے زیادہ یاد آتا ہے۔ جانتے ہو؟ پگلا ——— پگلا چلا گیا اور میرا دایاں ہاتھ ہی کٹ گیا ہے"

پرّی بولی ——— "سالا پگلا کیوں پالیٹکس والے ایک ایک دن ایک ایک طرح کی باتیں کرتے ہیں"

پلٹو سنجیدہ ہو گیا۔ اپنے آپ کہنے لگا ——— پگلا کی وہ رانڈ بھی جھنجھوڑتی۔ ڈبو آکر بولا ——— بڈھو نہیں آسکے گا۔ وہ بولا ا سے بخار ہے"

پلٹو غصہ سے بولا ——— "وہ بولا یا تو نے دیکھا" ؟

"دیکھا، بڈھو سویا ہوا ہے، اماں جی مجھ سے بولی"

پلٹو اٹھ کھڑا ہوا۔ " چل، دیکھ آؤں۔ تیرے لیٹ ہے" ——— ؟

"بیس منٹ"

راستے میں وہ تینوں ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ بکھر سے جاتے ہیں، آگے پیچھے۔
یہاں کے راستے، مکان، دکان اور دام زندگی کا جو اصل ہے، یہ لوگ اس اصول
سے کچھ ہٹ کر ہیں، الگ تھلگ ہی ہیں۔ یہ لوگ ضرورت کے وقت احتیاط برتنے
میں اور جلد بازی بھی ہو جاتے ہیں۔

انسان شکاری ہے۔ ایک زمانے میں جانوروں کے شکار پر جب انسانی تہذیب
کی بنیاد پڑی تھی۔ وہ تہذیب، ایک طویل عرصہ گزر ابیت گیا ہے۔ اب اس کرۂ
ارض پر قوی ہیکل دیو پیکر بڑے بڑے جانور تقریباً مٹ چکے ہیں۔ اب ایسے جانوروں
کی پرورش کی جاتی ہے جو انسان کے کھانے میں آتے ہیں یعنی جو انسانی غذا میں شامل
ہیں۔ پھر بھی انسان کا ہاتھ کھجاتا ہی رہتا ہے۔ انسان اب انسان ہی کا شکار کرتا ہے
بلند عمارتوں میں تہذیب یافتہ انسان بھی انسانوں کا شکاری ہے ——————
اور یہ لوگ ان شکاریوں کا ایک اور رخ ہیں، اک اور رخ ——!

سامنے سے چار پانچ کا ایک اور ٹولی آرہی ہے۔ یہاں کے تمام راستے تقسیم
کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح، دو ٹولیوں کا ایک ہی وقت میں ایک ہی راستے سے
چلنے کا قانون نہیں ہے۔ جنگل کا قانون بھی ایسا ہی ہے۔

لیکن پلٹو موجود نہ ہو، تو عموماً اس کی ٹولی کو کوئی چھیڑتا نہیں ہے۔ لیکن اب خود
پلٹو ہی نے ان کو کسی رکاوٹ کے بغیر جانے دیا۔ اپنی ٹولی کو لے کر وہ دیوار سے
لگ کر کھڑا رہا۔ ہاتھ کا سگریٹ آدھا بھی نہیں جلا تھا کہ اسے پھینک کر اس نے
دل لگا کر ایک اور سلگایا۔

ریل لائن پار کرنے پر بستی کا علاقہ —— بستی کے ایک کونے میں بڈھا
گھر۔ بڈھو کوئی تیس سال کا ہوگا۔ وہ چادر اوڑھ کر سویا ہوا ہے کٹیا کے قریب

ایک دبلی پتلی چھوکری کھڑی ہے۔

بلتو کمرے میں داخل ہو کر بڈھو نے چادر کو ایک جھٹکے سے کھینچ پھینک کر بولا ——" او —— سالے —— "

" سچ یار، مجھے بخار ہے۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔"

" الو... سالا کہیں کا... تیرے بخار کی....... "

بڑی ہنس رہی تھی۔ بلتو کو جس طرح چیزیں خراب کرنے کی عادت ہے، اسی طرح بڈھو کو بخار کا ہے ہمیشہ ایسا ہوتا ہے

بلتو شراب کی بوتل نکال کر بڈھو کے منہ میں ٹھونستے ہوئے بولا ——" پی سالے، تیرے بخار کا باپ بھاگے گا۔"

دبلی پتلی چھوکری تیز لہجے میں بلتو سے بولی: " یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ آج نہیں جائے گا۔ میں کہتی ہوں، نہیں جائے گا"!

بلتو ہنسا۔ اتنے بھیانک طور پر ہنسنے کی، اس نے مشق کی ہے یا یہ ہنسی اس کی فطرت ہے؟ جو بھی ہو اس کی ہنسی سے بدن میں کپکپی ہونے لگتی ہے۔

جھٹ سے، وہ لڑکی کا ایک ہاتھ پکڑ کر مروڑتے ہوئے بولا ——" دوں، توڑ دوں؟" تکلیف سے چیخ کر لڑکی بولی —— اف، لگتا ہے "

بلتو ہنستے ہوئے اور بھی مروڑنے لگا۔ بڈھو فوراً اٹھ بیٹھا۔ التجا اور غصہ بھرے ملے جلے لہجہ میں بولا —— کیا کرتے ہو استاد —— تم —— عورتوں کو ہاتھ کیوں لگاتے ہو ——؟"

بلتو ان الفاظ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے گال پر ایک چپت جمایا —— بولا ——" جنتر لے لے —— چل —"!

لڑکی اپنے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولی —— مرو —— آج تم سب

مرد. میں بری کے نام پر خیرات دوں گی۔ شستہ مالی کر پوجا کروں گی۔ تم لوگوں کے چاہے جلد کر کیرتن کروں گی "

دس کا ایک نوٹ فرش پر پھینکتے ہوئے پلٹو بولا ——— چلا مالی تیرے بڑھو کو ٹھیک واپس لادوں گا۔ میں مروں یا جیوں۔ تیرے بڈھو کو ٹھیک لوٹا دوں گا۔ گوشت منگا کر رکھے گی کبھی ——— ہم!

اس کے بعد بستی کے پیچھے رکھے ہوئے ایک جیپ کار میں سوار ہو کر بے مقصد ہی وہ لوگ کوئی پندرہ منٹ تک گھومتے پھرے۔ بے مقصد، بے مطلب ——— جیپ میں چکر کھاتے کھاتے ہی بوتل خالی ہو گئی۔ پلٹو بوتل کو راستے پر دے مارا اور چھن چھن آواز کے ساتھ اس کے ٹکڑے بکھر گئے جیپ ریلوے اسٹیشن کے سامنے آکر رکی۔ تینوں اترے اور ترّی جیپ ڈرائیو کرتی ہوئی کہیں اور چلی گئی۔

پلاٹ فارم پر بھی وہ لوگ ایک ساتھ کھڑے نہیں ہیں۔ بکھرے ہوئے ہیں۔ ٹرین آتے ہی تینوں مختلف ڈبوں میں گھس گئے جیسے کوئی کسی کو جانتا تک نہ ہو۔ کوئی پندرہ منٹ دوڑنے کے بعد ٹرین دو طویل اور ایک مختصر سیٹی بجاتی، رفتار دھیمی کر کے رک گئی ——— اندھیرے میں، میدان میں ——— کیوں رکی۔؟ کوئی نہیں جانتا ———!

تین ڈبوں سے ٹپاٹپ وہ تینوں اترے۔ ایک دو لمحہ کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد تینوں مل کر ایک ہی ڈبے میں داخل ہو گئے ——— ٹرین پھر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

پلٹو کے ہاتھ میں پستول، ڈابو اور بڈھو کے ہاتھوں میں چھرے ——— کمپارٹ میں ۱۹، ۲۰ مسافر۔ پلٹو خونخوار دانت دکھاتے ہوئے بولا ——— کوئی

آواز لگائے گا تو گولی چلا کر اڑا دوں گا۔ نکالو سالے، کس کے پاس کیا ہے ۔ سو کمپارٹمنٹ کے لوگ بے حرکت، بے آواز۔ صرف ایک ادھیڑ عمر عورت کی کانپتی ہوئی ہچکی سے آواز آئی۔ وہی صرف ایک عورت ہے اکمپارٹمنٹ میں۔ کسی نے کچھ نہیں نکال کر دیا۔ بڈھو ایک بوڑھے کے سامنے جاکر بولا ___ ”گھڑی اتار سالے۔ منہ پھاڑ کر دیکھتا کیا ہے ___؟“
سالا کہہ کر رشتہ قائم کرنے کی وجہ سے ہی یا گھڑی کھول دینے کی مانگ پر ___ بہر حال بوڑھا حیران رہ گیا۔

بالکل بے وجہ یا صرف مثال قائم کرنے کے لیے ہی، پلٹو نے اس کے قریب جو مسافر بیٹھا ہوا تھا اس کے سینے پر پستول لگا کر چند نہایت ہی خراب گالیاں دیں اور اس کے بعد اس مسافر کے منہ پر ایک گھونسا ___ ایسا گھونسا مارا کر فوراً ہی اس کے منہ سے خون نکل آیا۔ پھر کیا تھا روپیہ، پیسہ اور گھڑیاں ٹپا ٹپ گرنے لگیں۔ ڈبوان کو چن چن کر تھیلی میں بھرنے لگا۔ بڈھو ہر ایک کے پاس جا کر اس کی تلاشی لینے لگا۔ ایک مسافر کے کمر سے سات ہزار روپیہ نکلا۔ اتنا روپیہ ساتھ لے کر رات کے ٹرین میں وہ کیوں نکلا ہے؟ اس سوال کا جواب کون دے۔

ادھیڑ عمر عورت کسی طرح بھی اپنے گلے کا ہار دینا نہیں چاہتی۔ عورتوں کو زیورات بہت ہی عزیز ہوتے ہیں۔ پلٹو خود ہی اس عورت کی طرف بڑھا۔ ہار پکڑ کر کھینچ کر توڑنے لگا لیکن آسانی سے ٹوٹا ہی نہیں۔ عورتوں پر پلٹو فطرتاً ہی بے رحم ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے عورت کے سینے کو داب کر دوسرے ہاتھ سے ہار کو کھینچنے لگا۔ ہار ٹوٹا، تو عورت کے گلے سے ایک ایسی چیخ نکلی جیسے اس کی جان نکلی جا رہی ہو۔ جسمانی تکلیف سے یا ہار کے لٹ جانے سے ___!

سب کچھ کسی طرح ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے ہاتھ تیزی کے جلدی میں ہے۔ دو مسافروں کا انتخاب کر کے ڈبّو اور بڈھو ان کے سینے پر چھری رکھ کر ان کے پینٹ کھلوا رہے ہیں۔ یہ محض تماشہ نہیں ہے۔ ایک ایک پینٹ کی قیمت ۱۰۰۰۰ روپے ضرور ہوگی۔ جو نکر ٹریلین کے میں ایک نے پینٹ اور شرٹ دونوں اتار دیئے۔ دوسرا زیادہ شرمیلا ہے۔ وہ کسی طرح پینٹ کھولنا نہیں چاہتا۔ بڈھو کا مزاج بگڑ گیا اور اس نے چھرا اس کے پیٹ میں گھسا دیا ——— شرم کی قیمت ——!

خون دیکھنے کے ساتھ ساتھ کمپارٹ کا منظر بدل گیا۔ اتنی دیر تک سب خاموش تھے۔ اب خوف سے چلانے لگے۔ یہ لوگ بھی اب جلدی سے سامان سمیٹ کر تیار ہو گئے۔ ٹرین تب بھی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ وہ لوگ کود کر پیچھے اتر گئے اور کرے میں سے چلانے کی آوازیں کئی گنا تیز ہو گئیں۔

اس کے بعد بم پھینکنے کی ذمہ داری بڈھو پر ہے۔ بھاگتے بھاگتے تھیلے میں سے بم نکال نکال کر اس نے ایک ایک کر کے تین بم پھینکے۔ ریل رک گئی۔ چند پولیس والے پھرتی سے ادھر ادھر دوڑنے لگے ..... صرف اس کمپارٹ کو چھوڑ کر جس میں ڈکیتی ہوئی تھی، وہ دیگر ڈبوں کے قریب گئے، دوڑے اور پھر پلکو وغیرہ جس طرف بھاگے تھے، یہ پولیس والے ٹھیک الٹی طرف، مخالف سمت میں دوڑے ——— شاید سنسان اندھیرے کی تلاش میں ——!

پرّی جیپ لے کر انتظار کر رہی تھی۔ وہ لوگ سوار ہوتے ہی پوچھی۔ "مال والا کیسا ہوا ——— اچھا ——؟!"

پلکو بولا ——— "برا نہیں اچھا ——"

جیسے رس گلے کا رس ہو، بالکل اسی انداز میں پلکو نے بڈھو سے کہا۔ "اے

تیرے ہاتھ میں خون لگا ہے، میرے کپڑے میں مت لگا۔"

جیپ دوڑ رہی ہے۔ صاف صاف پروگرام۔ اس سے قبل کے دو پروگرام بھی اسی طرح کامیاب رہے ہیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد ہی دیکھا گیا کہ دو اور جیپ ان کا پیچھا کر رہے ہیں ——— ایسی بات تو نہیں تھی ——!

پری بے فکر ہے۔ جیپ کافی آگے ہے لہٰذا ڈرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ کچھ دیر ریس چلنے پر پری بولی ——— "استاد سامنے کے چک پوسٹ پر نمبر ہے۔ گاڑی سلو کرنی پڑے گی۔"

پلٹو گردن موڑ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کر کے بولا ——— "دیکھ تو اس جیپ میں او۔سی ہے کیا۔؟ اگر او۔سی۔ ہو تو ——"

ڈبوا اتنی دیر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں دوربین کی طرح دور کی چیزیں کو سامنے کھینچ لاتی ہیں۔ اب اس نے کہا ——— "پولیس ہے ملٹری ہے۔"

ملٹری سے ریس کرنا بے معنی ہے۔ اس کے علاوہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ملٹری ان کا پیچھا نہیں کر رہی ہے۔ وہ سائڈ دیں تو چلے جائیں گے۔ ذرا آگے دائیں طرف ایک پتلی گلی ہے، اس گلی میں موڑنا ہو تو جیپ کی رفتار کو کم کرنی ہوگی۔

پلٹو بولا ——— "سائڈ کر، پری سائڈ لگا ——"

لیکن رفتار کم ہوتے ہی اس گاڑی سے گولیوں کی ایک بوچھار آئی اور کوئی راستہ نہیں ہے ——— قسمت کا پھیر ——— ہو سکتا ہے کہ اس علاقے میں کرفیو لگا ہوا ہو، اور ملٹری اتری ہو۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے کر ڈالنے اس علا [illegible]

آفت آگئی ہے۔

اچانک بریک دباکر جیپ روک کر ہر ی ایک چھلانگ لگاکر اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ وہ اتنی پھرتی سے غائب ہوگئی کہ اس کے ساتھی تک لمحہ بھر پہلے اس کے ارادے کو بھانپ نہ پائے تھے۔ ڈبو بھی اتر پڑا۔ پنٹو کے ہاتھ میں پستول ہے۔ لیکن اس سے ملٹری کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بھاگنے کے لیے پنٹو اور بڈھو راستے پر کم چھپنے لگے۔

دو ڈاکو بہت دور نکل آئے تھے لیکن ملٹری بھی گاڑیوں سے اتر کران کا پیچھا کرنے لگی بیٹھے پر گولی لگنے سے بڈھو منہ کے بل گرا۔ پنٹو ایک موٹے چیل کے درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا۔ ابھی بھاگا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک آدمی بڈھو کی طرف بڑھتا آرہا ہے۔ بدلہ لیے بغیر بھاگ جانا پنٹو کی فطرت نہیں ہے۔ اگر بڈھو ابھی زندہ ہو تو ــــــــــــ

بوٹ سے جس ملٹری والے نے بڈھو کے جسم کو دھکا دیا تھا، پنٹو نے ایک ایک کرکے تین گولیاں چلاکر اس کے بدن کو چھلنی کر دیا۔ اس کے بعد کہیں سے ایک گولی اس کے دائیں بازو میں آ لگی۔

پنٹو کے ٹولی کی بدقسمتی ــــــــــــ وہ فوجی افسران نے دو جیپ کے سامنے آگیا تھا۔ ٹرین سے چند مسافر اتر کر فوجی افسران کے جیپ کو روک کران کو ڈکیتی کی اطلاع دی تھی اور اسی لیے ملٹری نے ان کا پیچھا کیا تھا۔

گولی لگنے سے پنٹو زمین پر گر پڑا اور پھر ساتھ اٹھ کر بھاگنے لگا۔ لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا گردن دبوچ لیا۔

بازو کے زخم سے پنٹو تب نڈھال تھا۔ پگلے کتے کی طرح پلٹ کر جھپٹا لگانے سے پہلے ہی ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ پھر بھی سنبھل کر پنٹو بولا ــــــــــــ

"ساد من بھیا ــــ!"

فوجی افسر نے سوال کیا ــــ "کون ــــ؟"

"سادھن بھیا، میں پلٹو بھلن پلٹو، چھوڑ دیجئے ــــ"

"کون پلٹو ؟"

ہاتھ ذرا سے ہلکا ہوا تھا اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو چھڑا کر پلٹو تیزی سے بھاگا۔ بھاگنے سے پہلے پلٹو اپنے مقابل والے کے منہ پر اپنے سر سے ایک دھکا اور ایک موٹی سی گالی ہی دے پایا تھا۔ اب کی بار اسے اور کوئی پکڑ نہ پائے گا ــــــ

پیچھے سے آواز آئی ــــ "ہالٹ ــــ گولی چلا دوں گا ــــ"

پلٹو اور رکنے والا۔ اس کے دونوں قدموں میں ابھی دم ہے۔ اس نے بڈھو کو مارنے کا بدلہ لے لیا ہے۔ اسے اب اور کوئی فکر نہیں ہے۔

پھر سے آواز آئی ــــ ہالٹ ــــ ٹھہرو ــــ

پلٹو کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اسٹین گن کی گولیوں سے اس کا جسم چھلنی ہو گیا تھا۔ ایک لفظ بھی وہ نکال نہ سکا۔ جسم زمین پر گر جانے سے پہلے ہی وہ آخری سانس لے چکا تھا۔

۲

"کیا پلٹو، تیری کیا خبر کیا ہے ــ"؟

"سادھن بھیا، میری ماں مر گئی ــ"

"ارے ــــ کب ؟ ــــ اِس ــــ"!

"گھر والے بھی ؟"

"تیرا اُترا ہوا سر دیکھ کر میں تو سوچ رہا تھا پہلے مجھے ٹھیک پہچان نہ سکا کیا ہوا تھا ۔۔۔ ؟"

"کچھ نہیں۔ بس سردی بخار وغیرہ۔ اسی لئے سر اترا ہوا تھا ۔۔۔"

"اچھا۔ خبر تک نہیں ملی۔ تیری ماں مجھے بہت چاہتی تھی۔"

"تم لوگ تو محلے میں نہیں تھے ۔۔۔"

"ہاں ہم تو اب دہلی میں رہتے ہیں۔ تم لوگ اب کہاں رہتے ہو۔ ؟ تیرا باپ تو یقیناً زندہ ہیں ۔۔۔ ؟"

"ہاں۔ بابا نے کھر دا میں ایک چھوٹی دکان کر لی ہے۔ ہم لوگ وہیں رہتے ہیں۔"

"تیری صورت ایسی بگڑی بگڑی کیوں ہے۔ ؟ پڑھا لکھا اور نہیں کیا ۔۔ ؟"

پنکو شرما گیا۔ سر جھکا کر بولا ۔۔۔ "مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ دماغ نہیں ہے۔"

سادھن مسکراتے ہوئے بولا ۔۔۔ دیکھ تو رہا ہوں کہ دماغ خوب ہے۔ اسکول فائنل میں کتنی بار فیل ہوا ؟"

"دو بار ۔۔۔"

"بار بار تین بار۔ نہیں ہوگا کیا ۔۔۔ ؟"

"تم تو جانتے ہو سادھن بھیا۔ ماں نہیں ہے۔ باپ مجھے اور نہیں پڑھائے گا۔"

"تو تو اب کیا کرے گا ۔۔۔ ؟"

"کوئی نوکری وکری دیکھنا ہوگا۔ موٹر ڈرائیونگ سیکھ رہا ہوں۔ اگر ڈرائیور کی نوکری ملے تو ۔۔۔"

"اس عمر میں مجھے نوکری کون دے گا۔ وہ تو یہ قدر کیا ہے [illegible]"

"ایسں :"

"وہ ہو گیا۔ وظیفہ پوری کر کے کیا کر سکتا۔ دیکھو اگر کسی کی کوشش سے نوکری مل سکتا تو ۔۔۔"

"تمہاری تو کئی جگہ جان پہچان ہے۔ میرے لیے ذرا کوشش کرو نا۔"

"اچھا دیکھوں گا۔ آج کل نوکری چاکری کا بازار بہت تنگ ہے ۔۔"

"تم کیا پھر دلی لوٹ جاؤ گے ۔۔؟"

"ہاں۔ اب ایک ماہ چھٹی ہے۔ جانتا ہے نا اب میں آرمی میں ہوں ۔۔!"

"جانتا ہوں۔ تم لوگ ابھی اس حوتہر پوکر کے مکان میں ہوتا ۔۔۔؟"

"ہاں وہیں ۔۔۔ آتا ایک دن ۔۔۔ چلتا ہوں ۔۔۔"

"ٹھہرو تو۔ بہت دن بعد تمہیں دیکھا ۔۔۔"

"چل چائے پی جائے ۔۔۔"

سادھن پلٹو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر قریب کے چائے خانہ کی طرف بڑھا۔ جاتے جاتے دلی محبت کے جذبات سے وہ بولا ۔۔۔ "تیری ماں مر گئی سن کر میرا دل بہت اداس ہو گیا۔ وہ مجھے کتنا چاہتی تھی۔ میری ماں کو بھی یہ سن کر بہت دکھ ہوگا ۔۔۔"

۳

"ماں ۔۔۔ وہ دیکھو، سادھن بھیا؟"

"کہاں ۔۔؟ ارے وہ۔ ٹھیک ہی تو ہے۔"

"بلا دوں ۔۔؟"

"میلہ چل رہا ہے"

"ارے سادھن بھیا! سادھن بھیا - مجھے پہچانتے ہو؟"

"کون — ہو؟"

"میں پلٹو"

"ارے پلٹو - تجھے پہچان ہی نہیں سکا کتنا بڑا ہو گیا ہے"

"واہ - تم بھی تو بڑے ہو گئے۔ چلو ماں وہاں کھڑی ہیں!"

"اچھا — چل، مل کر آؤں"

سادھن آکر پلٹو کی ماں کو پرنام کیا۔ ماں نے آشیرواد دی — "جیو بابا جیو۔ خوش رہو۔ کتنے دنوں بعد تجھے دیکھا — "!

سادھن بولا — "ہاں چاچی۔ بہت دنوں بعد۔ پلٹو کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ پہچان نہیں سکا۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے — تو کون سے کلاس میں ہے رے پلٹو — "؟

"ساتواں — رتش بندو ودیالیہ میں"

ماں پوچھی — "سادھن، اب تو کیا پڑھ رہا ہے — "؟

"میں نے آئی۔ اے۔ سی۔ دیا ہے"

"خوب۔ اور بھی پڑھو۔ ماں باپ کا سر اونچا کرو۔ یہاں اچانک کیسے آئے"!

"دوستوں کے ساتھ مرشد آباد گھومنے آیا ہوں۔ اسی بہرم پور اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں ہم لوگ"

"ہوٹل میں — کیوں؟ تم ہمارے گھر میں رہو گے - چلو"

"نہیں چاچی۔ دوستوں کے ساتھ آیا ہوں۔ اس کے علاوہ ہم لوگ کل چلے جائیں گے"

"تیری ماں کیسی ہے؟ کلکتے میں تم لوگ کہاں رہتے ہو——؟"
"ہم لوگوں نے منوہر پوکھر میں ایک گھر خرید لیا ہے۔ ایک دن آئیے تاچاچی۔ ماں بہت خوش ہوگی۔ ماں سے آپ لوگوں کی بات کہوں گا——"
"اور میں گئی۔ ماں سے آپ لوگوں کی وہ تو بیمار میں——"
"کیوں پلٹو نہیں لے جا سکتا۔ ارے پلٹو تو ٹرین میں سوار ہو کر نہیں جا سکے گا۔ سیالدہ اتر کر بس نمبر ۸، بی۔ پر سوار ہونا——"
"ہاں ہاں، کیوں نہیں——"
"ماں بولی،" چل سادھن۔ ذرا ہمارے گھر میں بیٹھ، چل۔ قریب ہی ہے اتنے دنوں بعد تجھے دیکھی——"
"چاچی ذرا ٹھہریئے، میں دوستوں کو کہہ آتا ہوں——"
دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو کر ماں بولی——" بیٹھو۔ اس پلنگ ... ارے، رہنے دو۔ جوتے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ گھر کی جو حالت ہے۔ ... آئے تو شرم آتی ہے۔ ہاں تم سے شرم کی کوئی بات نہیں۔ جب دیش میں تھے تب تیری ماں سے دوستی تھی۔ ان کے گھر جو کچھ پکتا تو مجھے دیئے بغیر نہیں جاتی تھی۔ میں بھی پکا کر——"
"ہاں چاچی، مجھے یاد ہے——"
"تیری بہن چندنا کی شادی ہوگئی——؟"
"ہوگئی۔ دیدی بھی اب دلی میں رہتی ہے۔ جمائی بابو سنٹرل گورنمنٹ میں ... ہیں——"
"اچھا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ خوش رہے۔ اور تیرا چھوٹا بھائی تاتن——"
"وہ دارجلنگ میں پڑھتا ہے——" جھرنا بہن کہاں ہے چاچی——؟"

مجھے پتا تو نرسنگ میں ہے۔ ٹریننگ پاس ہو جائے تو شاید کہیں
کام مل سکتا۔ شادی وادی نہیں ہو سکی ـــ ہو گی کیسے گھر میں کوئی کماتا تو ہے نہیں۔
تمہارے بابا بیمار ہیں۔ کھانسی کی آواز سن رہے ہو، کھانسی اور دمہ کی بیماری
نے کسی کام کا نہیں رکھا ـــ"
"ہسپتال لے گئی تھی، وہ لوگ وہاں بھرتی ہونے کو کہتے ہیں، لیکن بھرتی ہونا
کیا آسان ہے"
"چاچی آپ کی صحت بھی تو گر گئی ہے پہلے آپ کتنی اچھی تھیں ـــ!"
"نہیں، نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں اچھی ہوں ـــ"
"اچھا تو میں اب چلوں؟ دوست انتظار کر رہے ہیں۔ بلتو کہاں گیا ـــ؟"
"بیٹھو اور ذرا۔ تجھے اتنے دنوں کے بعد دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ تم سب
لوگ خوش ہو، جان کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ کیسے کہوں ـــ"
"اے پلتو۔ کہاں گیا تھا۔ یہ کیا چاچی۔ آپ نے یہ سب کچھ کیوں منگوایا؟"
"نہیں ـــ نہیں ـــ"
"کچھ نہیں، کچھ نہیں، صرف ذرا سی مٹھائی۔ اتنے دنوں بعد دیکھی۔ تو نے مجھے
پرنام کیا اور میں تیرا منہ میٹھا بھی نہیں کراؤں ـــ؟"
"گاؤں میں رہتے وقت جب بھی آپ کے گھر جاتا تھا، کیا کیا کھاتا تھا۔ مجھے
سب یاد ہے ـــ"
"اور وہ سب باتیں ....."
اے پلتو، تیرا گال کیسے کٹ گیا رے ـــ؟
پلتو جیسے اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک بار ماں کی طرف اور ایک
بار سادھن کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد مجبوراً بولا ـــ "کل گر پڑا تھا ـــ"

پنکو کی ماں رو دی۔ آنکھوں میں آنچل داب کر بولی ــــ "نہیں، گیا نہیں تھا
کتنا بے رحم ہو سکتا ہے۔ قریب ہی ایک گھر میں پنکو کھیلنے جاتا ہے۔ وہ رئیس ہیں۔
جبکہ ہمارا یہاں کچھ نہیں ہے لیکن ہمارا بیٹا بھی تو بیٹا ہے۔ کیا اس کے ماں باپ
کے دل کو نہیں لگے گی ــــ وہاں اکھو بھائی کھیل رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ پنکو کے ہاتھ
سے دھکا لگ کر ایک قیمتی پھولدان گر کر ٹوٹ گیا۔ ہو سکتا ہے ٹوٹا ہو، لیکن
تو بچہ ہے۔ کیا اس نے جان بوجھ کر توڑا ہے ــــ وہ اس کے بیٹے کا ہاتھ لگ کر
بھی تو ٹوٹ سکتا تھا۔ اس کے لیے کون مارتا ہے ــــ دیکھو کیا مارا ــــ کرتے
میں خون لگا روتے روتے جب وہ گھر لوٹا، تب میرے دل میں ...... میں
کاغذ کے کھلونے بنا بنا کر بیچتی ہوں۔ کتنی محنت کرکے اسے پڑھا رہی ہوں .....
ہی تاکہ اگر آدمی بنا سکوں تو ایک دن ہمارے دکھ دور ہوں گے ــــ"

۴

پانچ برس کا لڑکا اچھلتے کودتے ہوئے آکر بولا ــــ "ماں، تم نے
سادھن کو میٹھا چاول دیا ہے۔ مجھے نہیں ــــ"
"چھی ــــ پنکو، سادھن نہیں، سادھن دا بولنا، تجھ سے بڑا ہے ــــ"
"تم نے سادھن دا کو پہلے کھیر دیا۔ مجھے نہیں ــــ"
لمبے برآمدے میں کارپٹ کے آسن پر خوب جم کر بیٹھا ہوا ہے آٹھ سال کا
ایک لڑکا ــــ سادھن ــــ اور کھیر کھانے میں مشغول ہے۔
ماں بولی ــــ "دیتی ہوں، جا پہلے منہ ہاتھ دھو آ ــــ"
پنکو کودتا ہوا ہاتھ دھونے گیا۔ ماں سادھن سے پوچھی ــــ "اور دوں۔۔

لے اور دو مجھے ــــ ناریل کے لڈو بھی لے ــــ واہ، کتنا اچھا لڑکا ہے
بڑوں کی بات سنتا ہے ــــ "

پلٹو بھی آکر سادھن کی دیکھا دیکھی جم کر بیٹھ گیا۔ بولا ــــ "مجھے بھی
سادھن داکی طرح لڈو دو ــــ "

"تو نے تو صبح بھی کھایا ہے۔ درد ہوگا پیٹ میں ۔"

"نہیں ــــ مجھے بھی دو ــــ "

"اچھا جلدی سے کھالو۔ پھر دونوں کھیلنے جانا۔ جھگڑنا نہیں۔ سمجھے ــــ "

سادھن کھیر کھاکر اٹھا۔ پلٹو کی ماں نے اس کا منہ دھلواکر تولیے سے پونچھ دیا۔ سادھن کے ناک سے بہہ رہی تھی وہ بھی صاف کی۔ اس کے بعد پلٹو کا منہ دھلواکر بولی ــــ "جاؤ ــــ کھیلنے جاؤ" ـ

اتنے میں سادھن کے ماں باپ آگئے۔ وہ لوگ ایک اور پڑوسی کے گھر گئے تھے۔ سادھن کی ماں سادھن سے بولی ــــ "چل اب گھر چلیں" ـ پلٹو کی ماں بولی ــــ "اتنی جلدی کیا۔ بیٹھو۔ بچوں کو تھک تھک کھیلنے دو ــــ "

سادھن کی ماں نے پلٹو کو پکڑ کر گود میں لینے کی کوشش کی لیکن پلٹو کود کر دور ہٹ گیا۔ سادھن کی ماں بولی ــــ "کنک، تیرا بیٹا کتنا سندر ہے سر پر گھنے بال، بڑی بڑی آنکھیں ــــ "

پلٹو کی ماں مسکرا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی۔ سادھن اور پلٹو کھیلنے چلے گئے۔

ندی کے کنارے اونچا باندھ۔ موسم برسات۔ کچھ دیر پہلے پانی برس چکا ہے۔ آسمان نے دھرتی کو دھو کر صاف کیا ہے۔ دوب پر اب بھی بوند بوند پانی ہے۔ شام کی ٹھنڈی، ٹھنڈی، بھیگی بھیگی ہوا چل رہی ہے۔ ایسے میں دو

بچے کھیل رہے ہیں۔

ایک کدم کے پھول کے درخت پر بے شمار پھول کھلے ہیں۔ لیکن پھول اونچی اونچی شاخوں پر ہیں، جہاں تک بچوں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ ایک ایک کر کے سبھی۔

پلٹو بولا ـــــ "سادھن دادا، تم درخت پر چڑھ سکتے ہو ـــــ"

سادھن نے بزرگوں کی طرح کہا ـــــ "برسات کے دنوں میں درخت پر چڑھنا نہیں چاہیے۔ درخت پر سانپ ہوتے ہیں ـــ بڑے بڑے سانپ ـــــ"

"میں نے سانپ دیکھا ہے۔ تم نے دیکھا ـــــ؟"

"بہت ـــــ!"

"کدم پھول کے درخت پر سانپ نہیں ہوتے ـــــ"

"ہاں ـــــ تجھے کس نے کہا۔ بڑا آیا جاننے والا ـــــ"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔ دیدی اور میں ایک دن اس درخت پر چڑھے تھے ـــــ"

"جا ـــــ جھوٹا کہیں کا ـــــ!"

"سچ۔ دیکھو گے۔ پھر سے چڑھوں ـــــ؟"

"چاچی سے بولوں گا۔ بھگا درخت ہے ـــــ آ ـــــ آنکھ مچولی کھیلیں ـــــ"

کچھ دیر بعد پلٹو بھاگتا بھاگتا گھر میں گھس کر بولا ـــــ "ماں، سادھن بھیا نے مجھے مارا ـــــ"

سادھن کی ماں بولی ـــــ "مارا۔ تجھے۔ بلاؤ سادھن کو، ابھی ڈانٹ دیتی ہوں ـــــ آؤ۔ اچھے بیٹے ـــــ کہاں لگی ہے چوٹ۔ پیار کروں...

تھوڑا سا یا بہت بہت ـــــ!"

پلٹو بولا ـــــ "تھوڑا!"

پلو کی اس بھول ـــــ سمجھاؤ، کھیلتے کھیلتے شکایت نہیں کرتے۔ کھیلنے میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ جاؤ ـــــ کھیلو۔

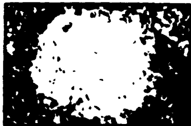
آنکھ مچول کھیلتے کھیلتے سادھن، پلٹو کو تلاش کرنے پاتا ہی نہیں۔ نہایت احتیاط سے ندی کے باندھ سے جھک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے پلٹو۔

ڈر کر سادھن چلا اٹھا ـــــ "اے پلٹو، کہاں گیا، ـــ پلٹو ـــ ٹو... ٹو...... ٹو......"

بالکل قریب سے آواز آئی ـــــ "ای ـــ ہاں"

سادھن اطراف دیکھنے لگا۔ لیکن کہیں دیکھ نہ پایا۔

کدم پھول کے درخت پر، پھولوں کے درمیان، پلٹو چھپا بیٹھا ہے۔ ہلکی ریک آواز میں بول اٹھا ـــــ "ای ـــ ہاں ـــ ٹوکی ـــــ مجھے پکڑ نہیں سکتے ـــــ تم مجھے پکڑ نہیں سکتے ـــــ"



خوف

ٹوو ڈٹلیوسن

ترجمہ: نصر ملک

یہ کہانی ڈنمارک کی مشہور و معروف ادیبہ، شاعرہ اور صحافی ٹوو ڈٹلیوسن کی عمدہ کہانیوں میں شمار ہوتی ہے اور میرے خیال میں انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے بعد اردو میں پہلی بار میں نے ہی اس کا ترجمہ کیا ہے۔ دیگر زبانوں میں اس کے ترجمے بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں اور مختلف لوگوں نے کیے ہیں۔ موصوفہ نے سن ۱۹۱۸ میں کوپن ہیگن کے غریب ترین علاقے میں پیدا ہوئی تھیں وہیں وہ پلی بڑھیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۹ میں شائع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈینش ادبی آسمان پر چھا گئیں۔ ان کی کہانیوں اور نظموں کے کئی مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور مقبول عام ہوئے۔ ان کا ناول زہر انہیں شہرت دوام بخش گیا۔ وہ ان کی پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں ابھرنے والی یورپی مادر پدر آزادی کی تحریک کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھنے میں مشہور تھیں۔ انھوں نے ۱۹۷۶ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

— مترجم

آج صبح گھر سے نکلتے وقت بڑا بابو جارج بہت خوش تھا اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اپنا بیگ بغل میں دبایا اور بڑے خوشگوار موڈ میں گلی سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے جان پہچان والے چند ایک ہی ملے جنہیں اس نے نہایت ادب سے ہاتھ ہلا کر سلام کیا حسبِ عادت وہ آج بھی بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ گھروں میں صبح سویرے دیر تک سونے والے لوگ گلیوں میں اخبار یا دودھ فروخت کرنے والوں کی ہی نہیں بلکہ دوسرے والے لوگوں کے جوتوں تک کی آواز پسند نہیں کرتے اور پھر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو بتلاتے رہتے تھے کہ "وہ ہے صبح سویرے چین کی نیند خراب کرنے والا" بڑا بابو جارج یقیناً کسی کی بھی نیند خراب کرنے والا "بدامن شہری" نہیں تھا ــــ وہ تو کسی کو بھی تکلیف نہیں دیتا تھا وہ تو محض اپنے کام سے کام رکھتا تھا کام کرنا ــــ تنخواہ لینا اور اس میں سے باقاعدہ ٹیکس ادا کرنا اور کسی بھی وجہ سے اڑوس پڑوس میں گھروں بنگلوں اور کوٹھیوں کے دروازوں کھڑکیوں کے قریب تک نہ جانا اس کا ایک عمر سے اصول تھا وہ لوگوں کو خواہ مخواہ پریشان کرنے کے قطعاً حق میں نہیں تھا۔ بڑی بڑی لانوں اور عالی شان بنگلوں اور موٹی توندوں والے ڈائریکٹروں کو صبح سویرے ان کی نیند سے

وہ بدمزگی کیوں کرے ـــــ یہ وقت تو ان کے آرام کے لیے مخصوص ہوتا ہے یہ الگ بات
ہے کہ میں اسی وقت ہزاروں دوسرے لوگوں کی طرح بڑے بابو جارج کو انہی کے آرام
کی خاطر کام پر جانا ہوتا ہے۔ اپنے انہی خیالات میں گم لیکن ساتھ ہی غیر ارادی طور پر محتاط
جارج بابو تنگ گلی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر صبح کی سرمئی نیم روشنی میں
جو دیکھا تو حیران رہ گیا کچھ لوگ فٹ پاتھ پر سوئے پڑے تھے ـــــ "اوہ اچھا ـــــ
وہ بھی تو انسان ہی ہیں ـــــ اپنی صبح سو کر گزارنا چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے گزاریں
آخر انھیں بھی تو اس کا حق حاصل ہے" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

بڑے بابو نے سامنے گرجا گھر کی دیوار پر لگی گھڑی پر وقت دیکھا تو اسے احساس
ہوا کہ وہ اپنے معمول سے لیٹ ہو رہا تھا اس نے اب اپنی رفتار تیز کر دی۔ گلی کے کونے
پر اس کی مڈھ بھیڑ نیلسن موچی سے ہوئی جو اپنے کام پر جا رہا تھا۔ جارج بابو نے ہر روز
کی طرح حسبِ معمول اپنا ہیٹ چھو کر اسے بھی سلام کیا لیکن نیلسن موچی اس کا جواب
دیے بغیر اس کے قریب سے یوں گزر گیا گویا اس نے بڑے بابو کو دیکھا ہی نہ ہو ـــــ
بڑے بابو پہلے تو قدرے حیران ہوا پھر اس نے سر جھٹک کر خود سے سرگوشی کی ـــ شاید
نیلسن آج جلدی میں ہو ـــ نہیں ممکن ہے وہ بھی میری ہی طرح اپنی سوچ میں گم ہوگا
بعض لوگ اپنی سوچوں میں یوں کھو جاتے ہیں کہ وہ راہ چلتے ہوئے دوسرے افراد کی
موجودگی محسوس ہی نہیں کرتے" جارج بابو کا موڈ قدرے خراب ہو گیا تھا ـــــ "آخر
نیلسن نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا ـــ اس نے مجھے دیکھا تو ضرور ہوگا ہر صبح
ہماری ملاقات اسی وقت اسی جگہ ہی تو ہوتی ہے اور پھر میں اپنے جوتوں کی مرمت بھی تو
ہمیشہ اسی کی ہی دکان سے کراتا ہوں ـــ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے ـــــ اس
نے جان بوجھ کر میرے سلام کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ جارج ابھی تک نیلسن موچی کے بارے
میں سوچ رہا تھا ـــ "نہیں ـــ وہ شاید کسی اور طرف متوجہ تھا تبھی تو مجھے دیکھ نہیں سکا

ہوگا۔ جارج بابو چائے والا سوچتا جا رہا تھا ۔ نیلسن شاید اب اپنی دکان پر پہنچ گیا ہوگا اور اس نے کسی ایسے گاہک کو جو اس کے ہاں جوتا پالش کرانے آیا ہوگا یہ بتایا ہوگا ـــــ "مسٹر بابو جارج نے آج ابھی صبح جب مجھے اپنا ہیٹ جھکا کر سلام کیا تو میں اسے خاطر میں لائے بغیر سیدھا دیکھتا اس کے قریب سے گزر گیا ـــــ نہیں بلکہ میں تو بڑے بابو کے بیٹے کے قریب تھا لیکن میں نے اسے اہمیت ہی نہیں دی" ـــــ جارج بابو نے لمبا سانس لیا اور سوچا "کہتا ہے تو کہتا پھرے ـــــ آخر نیلسن اور کر ہی کیا سکتا ہے وہ میرا کوئی ایسا بھید یا معاملہ تو جانتا ہی نہیں جس پر وہ میرے بارے میں بات آگے بڑھا سکتا ہو یا پھر کسی افواہ کی بنیاد رکھ سکے۔؟"

جارج بابو اپنے مکان کی قسطیں ادا کر چکا تھا۔ اس کی بیوی بر گیتے اس سے پیار کرتی تھی۔ بچے مناسب تعلیم و تربیت کے ساتھ جوان ہو چکے تھے اس کے بارے میں کوئی اگر انگلی اٹھاتا بھی تو کیوں ؟ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں یہ وقت ہی ایسا تھا کہ کسی ایک کے بارے میں کسی دوسرے کا ایک لفظ ہی اسے تباہ کرنے کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ جارج بابو کے بارے میں ایک بات واضح تھی کہ اس کا اپنا نقطۂ نظر اور سیاسی مسلک کیا ہے اور اس کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں۔ جارج بابو نے اس بارے میں خود ہی واضح کر دیا تھا اور یہاں تک کہ نیلسن موچی کی دکان پر بیٹھنے اور کسی قسم کا سیاسی اثر و رسوخ نہ رکھنے والے افراد بھی جارج کی زبانی اس کے اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں متعدد بار سن چکے تھے کہ "وہ تو محض اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور بس!" جارج بابو کی رفتار میں اب مزید تیزی آگئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں خیال ابھرا "کہیں نیلسن موچی دوسری پارٹی سے تعلق رکھتا ہو؟" اب تو جارج بابو اسی سوچ میں یوں گم ہو گیا کہ اسے اپنی بھی خبر نہ رہی ـــــ "مجھے اپنے بارے کم از کم اس موچی کی دکان پر بات نہیں کرنی چاہیے تھی کہ میرا سیاسی نظریہ کیا ہے اور میں اپنے کن کاموں سے کام رکھتا ہوں" جارج اب

الات کے تحت تیز رفتاری سے سوچے جا رہا تھا شاید اب وہ میرے گھر کی طرف
پہنچیں گے ——— میری بیوی رو پڑے گی جس نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا ہو
ا ——— وہ پوچھے گی کہ وضاحت کا موقع دیے بغیر اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے گھر
داخل ہو چکے ہوں گے ——— ممکن ہے ان میں سے کسی ایک نے بڑھ کر اپنا بیگ الٹ دیا
رکھا ہو شاید انھوں نے اس کے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہو ——— جارج بابو
سل سوچے جا رہا تھا ——— "ہم تمہارے خاوند کو تلاش کر رہے ہیں ——— دیکھو!
ان بات خود گھبرانے کی ضرورت نہیں ——— بتاؤ وہ کمینہ جارج کدھر ہے
معاملہ تمہارے خاوند ہی سے متعلق ہے" وہ بک رہے ہوں گے۔!

جارج بابو اب ریل گاڑی بیٹھا پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اس کے ہاتھ اتنے
پ رہے تھے کہ وہ اپنا اخبار تک نہیں کھول سکا تھا ——— یقیناً یہ ایک اہم معاملہ
ور جارج کے لیے ایک منحوس واقعہ بھی ——— لیکن یہ کوئی غیر سیاسی معاملہ بھی
سکتا تھا جس میں اتنا خطرہ بھی نہ ہو ——— شاید یہ محض اس کی اسی طرح کی سوچ ہو
طرح وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سوچنے لگ جاتا ہے۔
یہاں اس شہر میں تو اب تک کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا ——— ایک
رے سیاسی گفتگو کے باوجود سب خیریت ہوتی اور رہتی تھی وہ جب اس
یں منتقل ہوا تھا تو سبھی محلے والوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا ——— اس کی
جلد ہی تمام دکانداروں کو پہچاننے لگی تھی اور وہ بھی اسے ایک خوش مزاج خاتون
تے اس کے بچوں نے کئی دوسرے بچوں کو جلد ہی دوست بنا لیا تھا ان میں
بچے بھی تھے جن کے والدین بڑی بڑی کاروں، کوٹھیوں اور بنگلوں کے ساتھ جائیداد کے
مالک تھے" ——— جارج بابو نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا "شاید حالات معمول
جائیں گے ——— حکومت ہی تو بدلی ہے آخر یہی انسان ... ر ...

بھی بڑا ہو رہا تھا ــــــ اور کے بچوں کے اپنے اپنے گھر ہوں گے وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اپنے معاشرے کے پروقار باعزت شہری ہوں گے ـ وہ اپنا آمدنی ٹیکس ادا کرتے ہوئے سرکار کے ہاں بھی باعزت سمجھے جائیں گے!

ریل گاڑی سے باہر نکل کر جارج بابو نے اسٹیشن کی گھڑی میں وقت دیکھا ــــــ اپنے دفتر وقت پر پہنچنے کے لیے اسے اب تیز دوڑنا ہوگا اگر وہ بروقت دفتر نہ پہنچ سکا تو لوگ خواہ مخواہ کی باتیں بنائیں گے، اس نے سوچا ممکن ہے وہ کوئی اسکینڈل ہی کھڑا کر دیں۔ اسے اپنے دفتر میں ہیڈ کلرک کا عہدہ سنبھالے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس سے پہلے مس ہنسن نے یہ عہدہ حاصل کرنے کے لیے بہت تگ و دو کی تھی ــــــ وہ تو ایک سفارش بھی لے آئی تھی ــــــ لیکن چونکہ ملازمت کے تجربے میں وہ جارج بابو سے ایک سال پیچھے تھی اس لیے وہ ہیڈ کلرک نہ بن سکی تھی۔ دفتر میں مس ہنسن کے مقابلے میں اگر اسے یہ عہدہ نہ ملتا تو تمام ممبر یہ سوچنے میں حق بجانب ہوتے کہ شاید ہی وہ ہیڈ کلرک کی ذمہ داریاں نبھا سکے جارج بابو کو اب بھی یقین تھا کہ اس کی طرف سے دفتری ذمہ داریوں میں یا وقت کی پابندی میں ذرہ بھر بھی کوتاہی یا خیر ــــــ لوگوں کو باتیں بنانے اور اس کے بارے میں افواہیں پھیلانے کا موقع ضرور مہیا کر دے گی اور یقیناً ایسا کر کے وہ خوش ہوں گے۔ خاص کر مس ہنسن کو اگر ایسا کوئی موقع ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کے بارے میں افواہیں پھیلانے اور صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں ہرگز پیچھے نہ رہے گی ــــــ عین ممکن ہے کہ وہ اس کی دفتری بے قاعدگیوں کا ذکر نیسن موڈی سے بھی کرے اور وہ دوسرے دکانداروں اور اپنے گاہکوں کے کانوں میں اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتا پھرے گا ــــــ آخر لوگ بات سے بات پیدا کرتے بال کی کھال اتارتے اور افواہوں کو ہوا دیتے پھیلاتے ہی تو ہیں!

جارج بابو ابھی تک تیز تیز قدم اٹھاتا ایک طرح سے دفتر کی طرف بھاگے
جا رہا تھا۔ اف میرے خدا میں کن خیالات میں گھرا ہوا ہوں ۔۔۔ یہ خوف مجھے کیوں
: بوچے جا رہا ہے۔ اس نے لمحے بھر کے لیے رک کر سوچا اور بھول گیا کہ اس کے دائیں
. تھ والی سڑک کونسی ہے اس نے سر کو جھٹکا دے کر اپنی رفتار قدرے تیز کر دی۔ کیا
یہ ضروری ہے کہ مجھے اس سڑک کا نام یاد ہو" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ لیکن اب وہ اپنے
ب پر غصہ ہو رہا تھا ۔۔۔ سر پر پہنے ہوئے اپنے ہیٹ کو ہاتھ کا سہارا دے کر ہوا کے
: سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اور دفتر وقت سے
پہنچنے کا بھوت اس پر اب پوری قوت کے ساتھ سوار تھا۔ لیکن اپنے تحت الشعور میں
۔ رج بابو ابھی تک پیچھے والی اسی سڑک کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو وہ
مو ل گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی نام آ رہے تھے ۔۔۔ شاہراہ آزادی ۔۔۔
میں نہیں ۔۔۔ وہ تو شہر کے بیچ ٹاؤن ہال کے دائیں طرف پڑتی ہے ۔۔۔ آہا
۔۔ وہ تو ۔۔۔ خیابانِ جمہوریت تھی ۔۔۔ ارے میں بھی کیا پاگل ہو گیا ہوں ۔۔۔
یہ سڑک تو شہر میں داخل ہونے کے لیے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ ابھی بنائی جا رہی
ہے ۔۔ ہاں اس سڑک کا نام ۔۔۔ شاہراہ ساحل تھا ۔۔۔ یہ ہوئی نا بات!
سے اپنے آپ پر اعتماد آنے لگا تھا ۔۔۔ وہ نیلسن موچی اگر مجھے سر راہ نہ ملتا تو اس کا
یہ بڑھتا اور اگر اسے ملنا ہی تھا تو پھر اس نے میرے سلام کا جواب کیوں نہ دیا ۔۔۔
۔ رو۔ و پھر خیالات میں بہنے لگا تھا ۔۔۔ لیکن سڑک کا نام یاد کر کے وہ ایک طرح
سے فوری اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے اندر ہی اندر اپنے لیے ایک طرح سے تحفظ بھی
محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے جارج بابو خود کو ایسا غبارہ سمجھ رہا تھا جو کسی شریر بچے
کے ہاتھ میں آ جائے اور وہ بچہ کبھی تو اس میں ہوا بھرنے لگے اور ہوا باہر نکالنے لگے
اور پھر یہ عمل مسلسل تب تک جاری رکھے تا آنکہ غبارہ پھٹ نہ جائے۔

جارج بابو ابھی پہنچا تھا جب دفتر پہنچا تو اس نے استقبالیہ کمرے میں مس ہنسن کو وہاں
پہلے سے آئینے کے قریب سامنے کھڑے اپنے بال سنوارتے ہوئے موجود پایا۔

"صبح بخیر" جارج نے قدرے دھیمی آواز میں کہا اور سوچا کہ یہ بڑھیا جو ابھی تک مس ہی ہے اس کے لیے یہ کتنا تکلیف دہ ہوگا کہ وہ اپنی تمام زندگی ایک ہی دفتر میں کام کرتی رہے ۔۔۔ لیکن یہ عورت اب یہاں سے جا بھی کہاں سکتی ہے! ۔۔۔ یہ بھی اچھا ہی ہے کہ اب وہ اس طرح ہی ہے کہ اگر کوئی یہ تو نہیں کہہ سکے گا کہ میں ایک دن اسے اپنی کلیل بنالوں گا ۔۔۔ یا اس سے شادی کروں گا ۔۔۔ چلو خدا نے مجھے اس بدنامی سے تو محفوظ رکھا ہے نا ۔۔۔ جارج بابو لیکن اس عجیب و غریب سوچ پر خود حیران رہ گیا کہ مس ہنسن کے بارے میں آج یہ خیال اس کے ذہن میں اچانک کیسے آگیا۔ مس ہنسن اگرچہ ملازمت کے تجربے میں اس سے ایک سال پیچھے تھی عمر کے لحاظ سے کچھ نہیں وہ تو اس سے بیس برس آگے تھی ۔۔۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کامیابی کے لیے محض تجربہ ہی نہیں سرکاری دفتروں میں بعض اوقات عمر کا بھی کچھ حق سمجھ ہی لیا جاتا ہے لیکن اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا کہ مس ہنسن دفتر میں ہیڈ کلرک نہ بن سکی تھی اور دفتری ملازمین نے اس ذمہ داری کے لیے اسے ہی مناسب اور موزوں قرار دیا تھا بلکہ ان ملازمین میں سے بعض کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ دراصل جارج پیدا ہی اس منصب کے لیے ہوا تھا اور اکثر نے تو اسے "دیر آید درست آید" کا مقولہ یاد کراتے ہوئے کہا کہ اس ملازمت کا وہی تو حقدار تھا ۔۔۔ بس کچھ دیر ہو گئی یہ منصب اسے کہیں پہلے مل جانا چاہیے تھا۔

"صبح بخیر ۔۔۔ مسٹر جارج" مس ہنسن نے اپنے بالوں میں ربن لگاتے ہوئے کہا اور وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

"مسٹر کیوں ۔۔۔ محض جارج کیوں نہیں کہتی ہو؟" وہ خیالات کے دلدل سے

کل کر بولا۔

"اب آپ چونکہ ہیڈ کلرک بن چکے ہیں لہٰذا دفتری آداب کے تحت آپ کو ب "مسٹر" کہہ کر ہی مخاطب کیا جانا چاہیے ـــــ آپ اب "مسٹر" ہیں ـــــ مسٹر مس "جنس نے جواب دیا۔

غالباً وہ پہلے بھی جارج بابو کو مسٹر ہی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور دوسرے دفتری ملازمین کی طرح وہ اس کے ساتھ کوئی خاص بے تکلف بھی نہیں تھی لیکن آج تو نہ صرف اس کی آواز بلکہ لہجے میں بھی ایک نمایاں فرق واضح تھا۔

"انسانی بدبختی بھی کبھی کبھی عدالت و مخاصمت بن جاتی ہے اور انسان جب سوچتا ہے کہ دھرتی پر وہ کتنے مختصر سے وقت کے لیے آیا ہے اور اسے اپنی حقیقی زندگی کے لیے بھی کچھ زیادہ درکار نہیں تو پھر دوستی و غمگساری ہی اسے اس کی راہ دکھاتی ہے اور پھر وہ "زندہ رہنے دو اور زندہ رہو" کا اصول اپنا لیتا ہے۔"

جارج بابو اپنی عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے نہ جانے کن فلسفیانہ خیالات میں کھو چکا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے دوران ـــــ جارج بابو کے ایک شریک کار نے اسے ایک ایسے کلرک کی کہانی سنانا شروع کر دی جو ایک زرعی فارم پر ملازم تھا ـــــ وہ کلرک ہر روز صبح سویرے فارم پر آنے والے گوالوں سے دودھ خریدا کرتا اور اسے شہر بھجوایا کرتا تھا ـــــ فارم پر دودھ فروخت کرنے والے گوالے بھی عجیب وضع کے لوگ ہوتے ہیں ـــــ جارج بابو ـــــ اور پھر جارج بابو کے دوست نے اس متذکرہ کلرک اور دیہاتی گوالوں کے بیچ ہر صبح ہونے والے مکالموں کی نقل اتارتے ہوئے کہنا شروع کیا ـــــ ہر صبح گوالے اس کلرک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے "مسٹر فریڈرکس" ـــــ مسٹر فریڈرکس کہہ کر مخاطب کرتے، تھکتے نہیں

تھے ـــــ وہ گولے جیسا ہے ، اس کلرک اپنے خالصتہ دیہاتی انداز فکر میں بتاتے کو مسٹر فریڈرکسن ـــــ موسم بھی کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں ـــــ اب دیکھنا ـــــ موسم بہتر ہے تو ہم کتنے اچھے دن بسر کر رہے ہیں ـــــ ہمیں کچھ زیادہ تو درکار نہیں بس گزر بسر چاہیے ـــــ لیکن مسٹر فریڈرکسن ـــــ آپ یقین جانیے کہ خزاں کے موسم میں تو یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا ـــــ مسٹر فریڈرکسن ـــــ یہ حقیقت ہے کہ خزاں میں ہمارے ساتھ ہمارے مویشیوں کا بھی بہت ہی برا حال ہوتا ہے ـــــ مسٹر فریڈرکسن ـــــ آپ جانتے ہی ہیں خزاں آخر خزاں ہے اس میں بہار کہاں سے آئے گی !

جارج بابو نے اپنے شریک کار کی کہانی بڑے اطمینان سے سنی اور جب اس کے شریک کار کو اپنی فتح کا احساس ہونے لگا تو اس نے بھرپور قہقہہ لگایا ـــــ اتنی تھوڑی سی دیر میں جارج بابو جواب سنبھل چکے تھے ـــــ اپنے شریک کار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ـــــ سنو ـــــ جانسن ـــــ کیا یہ سبھی دودھ فروش ، دکاندار اور اس قبیل کے لوگ ایسے ہی جیسے ہیں ہوتے ہو ـــــ مثلاً ـــــ جارج بابو نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میری گلی میں ایک موچی ہے ـــــ روزانہ کام پر آتے جاتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو گلی کے نکڑ پر ملا کرتے ہیں ـــــ میں ہمیشہ اپنا ہیٹ اتار کر اسے سلام کرتا ہوں بھی مجھے صبح بخیر کی دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے ـــــ کبھی کبھی ہم چلتے چلتے موسم پر تبصرہ بھی کر لیتے ہیں ـــــ لیکن آج صبح نہیں معلوم ہے کیا ہوا ؟ جارج بابو نے اپنا پہلو بدلا ـــــ کافی کی چسکی لی اور پھر بولا " میں نے حسب معمول اپنا ہیٹ اتار کر اسے سلام کیا لیکن وہ موچی مجھے دیکھتا ہوا اکڑ دن اکڑائے سیدھا چلت گیا ـــــ اب بتاؤ ، تم اس کے رویے پر کیا کہو گے ؟ جارج بابو کھانے کی میز پر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے سبھی فنکار کار کی طرف سے اپنی کہانی پر داد کا طلب گار تھا ـــــ لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ان میں سے ایک دو محض ہلکا سا مسکرا کر رہ گئے اور

کچھ نے صرف اپنے شانے اچکا دیئے اور باقی تو گویا ایسے تھے جیسے انھوں نے جارج بابو کی بات سنی ہی نہیں تھی ——— انہیں اس بات پر ہرگز تعجب نہیں تھا کہ اس موچی نے جارج بابو کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا وہ بذاتِ خود جارج بابو اور اس کی عادتوں سے پوری طرح واقف تھے وہ جانتے تھے کہ جارج بابو کے بارے میں جو کچھ آج کل کہا اور سنا جا رہا تھا وہ اس موچی کو بھی معلوم ہی ہوگا۔ جارج بابو کے بارے میں اب ایسی باتوں کو پوشیدہ رکھنا مشکل تھا ——— وہ تو زبانِ زدِ عام تھیں ——— ہاں ان سے اگر اب تک کوئی آگاہ نہیں تھا تو وہ جارج بابو بذاتِ خود تھا ——— وہ ان باتوں میں حقیقت کی اصلیت سے تو خود بھی واقف نہیں تھے اور جارج بابو کے بارے میں اتنی سنگین افواہوں کے بارے میں خود سوچ بھی نہیں سکتے تھے ——— جارج بابو تو ایک مکھی تک نہیں مار سکتا تھا ——— اس نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی تھی ہاں وہ کسی اور کے ایسے مفاد میں جس میں کسی حد تک اس کا اپنا ہی فائدہ ہو اس کے لیے اپنا ذاتی نقطۂ نظر بدلنے کو عار نہیں سمجھتا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ اپنے سے زیادہ دوسرے کی دلجوئی اور مدد کا زیادہ خیال رکھتا تھا جارج بابو ان کے نزدیک اس اصول پر کاربند تھا کہ بغیر وجہ کسی کو اپنے دشمنوں میں ہرگز اضافہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسے لوگوں کی ویسے بھی کمی نہیں ہوتی جو بغیر وجہ بتلائے کسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

آج کل پورے ملک میں عوام میں ایک طرح سے اپنی اپنی رائے کے اظہار کا جنون پھیلا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنا اپنا نظریاتی اوورکوٹ اوڑھے اپنے ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور اپنے نظریات کا جھنڈا بلند کرنے میں مگن تھا۔ جارج بابو کے بھی اپنے نظریات تھے وہ ہر قسم کی قدامت پسندی، رجعت پسندی، تشدد و بربریت اور نفرت و حقارت سے بہت دور تھا ——— اسے مادر پدر آزادی کے پرستاروں اور بن بیاہی ماؤں کے جلوس بھی اچھے لگتے تھے مگر وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ اس کا اپنا مقام کیا ہے! جارج بابو اس بات سے

وہ ملازمت کے کچھ ہی [illegible] ہے — بالکل اسی
[illegible] کی طرح جس نے [illegible] کر اس کے سلام کا کبھی جواب نہیں دیا تھا البتہ وہ لبنی
[illegible] سے بہت [illegible] گیا تھا — جارج بابا ابھی تک اسے طرح فراموش نہیں کر سکا تھا
دفتر سے گھر واپس جانے کے لیے وہ ریلوے اسٹیشن پہنچا اور گاڑی میں سوار ہو کر گھر
کی طرف روانہ ہوا — گاڑی سے باہر نکل کر جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو ہر چیز اسے جیتی
جاگتی نظر آ رہی تھی — ہر چند کہ منحوس دن کا اثر ابھی تک محسوس ہو رہا تھا لیکن گھر
پہنچنے کے خیال سے وہ اسے کسی حد تک بھول چکا تھا — گھر جاتے ہی وہ سب سے
پہلے نہائے گا — اتنی دیر میں اس کی بیوی میز پر خاص گرما گرم کھانا سجا دے گی —
جارج بابو اپنی ناک میں کھانے کی خوشبو محسوس کر رہا تھا — ہرگتی نے اپنے گھر کے
باغیچے سے پھول توڑ کر گلدان میں سجا رکھے ہوں گے — بچے اس کے گرد اکٹھے ہو کر آداب
بجا لانے لگیں گے — جارج بابو کچھ اسی طرح کے خیالات میں گم تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے
بڑھتا جا رہا تھا — خدا کا شکر ہے میرے پاس اب اچھی اور مستقل ملازمت ہے
— لیکن اس میں خدا کے شکر کی کیا بات آخر میں نے خود بھی تو ہمیشہ ہمت و ایمانداری
سے محنت کی ہے — میں نے کبھی کسی کو اپنی راہ میں رکاوٹ بننے نہیں دیا تھا میں
نے کبھی کسی کو زحمت یا تکلیف نہیں دی — میں تو ہمیشہ دوسروں کے حقوق کی عزت
کرتا ہوں تبھی تو اپنے حقوق کی ان سے عزت چاہتا ہوں" جارج بابو سوچے جا رہا تھا اور
ہر نئے خیال کے ساتھ ہی وہ ایک انجانے خوف میں بھی مبتلا ہو جاتا تھا — غیر ارادی
طور پر اسے یاد آیا کہ وہ صبح اپنے ہی علاقے کی ایک معروف سڑک کا نام ہی بھول گیا تھا
یہ خیال آتے ہی جارج بابو نے اس سڑک کا نام پھر سے یاد کرنا چاہا — "شاہراہ آزادی"
— نہیں یہ تو نہیں — "شاہراہ جمہوریت" — ارے یہ تو شہر کے اس طرف ہے
— اور پھر وہ بے ساختہ پکار اٹھا — "شاہراہ ساحل" — یہ ہوئی نہ بات! وہ

یادداشت ہے [illegible] فوراً ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور سامنے سے [illegible] نیلسن [illegible] دوسری جانب سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا ——— جارج بابا سے دیکھتے ہی [illegible] اندر ہی اندر مشتعل ہو گیا اور اس نے نیلسن کے سلام کا جواب تک نہ دیا ——— "شام بخیر مسٹر جارج ——— آج موسم کتنا خوشگوار ہے" نیلسن موچی اس کے قریب سے گزر کر آگے جا چکا تھا۔

جارج کی جیسے جان میں جان آگئی ہو اور اسے پھر سے زندگی بسر کرنے کی مہلت مل گئی ہو ——— اس نے ایک گہرا سانس لیا ——— وہ پل بھر کے لیے رکا اور اس نے دور جاتے ہوئے نیلسن کو پیچھے مڑ کر دیکھا ——— پھر ایک لمبا سانس لے کر تیز تیز قدم اٹھاتے گھر کی طرف چل دیا ——— اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں کو بھگو رہے تھے ——— گھر کے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے دستک دینے سے لمحہ بھر پہلے ——— شام کی بھوری روشنی میں کھلے آسمان کی طرف دیکھا تو اسے فضا میں بہار کی خوشبو محسوس ہوئی ——— "نیلسن موچی حق بجانب ہے ——— بوڑھا موچی ——— کیا شخصیت ہے اس کی ——— وہ کتنا پر لطف اور باذوق انسان ہے" ——— آج واقعی موسم کتنا بدل چکا تھا موسم کی یہ خوشگواری بہار کی آمد کا سندیسہ تھی ——— جارج اپنے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

کتابوں کی باتیں

نکات فن ——————— مصنف: **آغا صادق**

مطبوعہ: ۱۶ ونڈر میر روڈ. لندن

اردو میں علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت حیرت انگیز ہے۔ خالص ٹیکنیکل قسم کی کتابیں بھی بڑے حسن اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ چھپ رہی ہیں "نکات فن" مصنفہ آغا صادق (مرحوم) کے بیٹے صاحب نوید حسن نے انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ. ونڈر میر روڈ. لندن سے شائع کی ہے۔ سرمایۂ زبان اردو (جلال لکھنوی)، آئینۂ بلاغت (محمد عسکری) آئینۂ سخن فہمی (مسعود حسن رضوی)، اور بحر الفصاحت (نجم الغنی) کے بعد نکات فن تقسیم ہند کے بعد پہلی مبسوط کتاب ہے جو علم عروض، شعر و سخن، الفاظ کی حرکت و سکون، شعری اوزان کے تصور، اصول تقطیع، بحور کی تشکیل، سقوط حروف اور زحافات وغیرہ سے متعلق ہے۔ اور ۳۵۱ صفحات کو محیط ہے۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کتاب میں بحور، اوزان، زحافات وغیرہ کی وضاحت کے لیے جو جدول، نقشے اور گوشوارے بنائے گئے ہیں سب کو صحیح کتابت اور طباعت کی مرحلوں سے بحسن و خوبی گزارنا، ہفت خواں سے کم نہیں ہے۔ آخر کے حصے میں موسیقی پر بھی مقالات ہیں۔ راگ راگنیوں کی اٹھان، ٹھمریوں اور کٹھریوں وغیرہ پر اسی طرح کی بحث ہے جس طرح واجد علی شاہ کی کتابوں، بنی، ناجو اور دلہن میں تفصیلی بحثیں ملتی ہیں۔ ان تمام فنون کی باریکیوں اور تکنیکی صورتوں کو سمجھنے کے لیے

ہے۔ شاہ مصنف نے "بُشارت" بضم ب صحیح بتایا ہے مگر اردو میں عوام و خواص سب "بِشارت" بہ کسرِ ب بولتے ہیں۔ اسی طرح "پارس" کو لکھا گیا ہے کہ اس لفظ میں "ر" ساکن اور "س" موقوف ہے۔ یوں طاؤ حسن [illegible] کو دیتے ہیں عراق و پارس و بلخ ہر الفاظ "ر" متحرک کے ساتھ بھی نظم کیا گیا ہے ؎

بخارا جا چکا، پارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض نیم جاں کب تک

(علامہ شبلی نعمانی)

اسی طرح "تبدیلی" اور "تا بعدار" کو غلط بتایا گیا ہے۔ اردو میں بہرحال یہ دونوں الفاظ اہلِ زبان حضرات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح "جلا وطن" "ج" مفتوح کے ساتھ بولنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اردو میں تو لوگ "جِلا وطن" "ج" کسرہ کے ساتھ ہی بولتے ہیں۔ "حکومت" کو "ح" مفتوح بولنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اردو میں "ح" مضموم ہی بولتے ہیں۔ "مُہلت" بہ ہر سہ حرکت لیکن اردو والے "م" مضموم بولتے ہیں۔ "عِیال" بکسر "ع" لکھا گیا ہے مگر اردو والے "ع" مفتوح بولتے ہیں۔ "بنگڑ" کے لیے لکھا گیا ہے کہ "ل" کے سکون سے غلط ہے مگر اسے کیا کیا جائے کہ میر انیس نے کہا کہ

لوٹ لو، پھونک دو، تاراج کرو بہتر ہے
کلمہ گو ہو، یہ تمہارے نبی کا گھر ہے

(میر انیس)

لازم ہے تم کو پاس کلامِ مجید کا
کلمہ نبی کا پڑھتے ہو تم، یا یزید کا

(میر انیس)

اسی طرح "قبیل" کے بجائے "قِبَل" "ق" مکسور اور "ب" مفتوح۔ "لاغر" "غ" مکسور، "ساعی" "ع" مکسور، "متوفی" درست "متوفّٰی" غلط۔ "مجاز" بضم میم بمعنی سفارش [illegible] کا درست ہے۔ "محبت" رکھا ہے کہ "محبت" لفظ کے لیے کہا گیا

کرنا مداخل ہے۔ ہمارا شاعر الفاظ کے اعراب و اصوات کو عوام میں مستعمل ہونے کے طریقے کے سبب زیادہ لفظ میں رکھتا ہے اور یہی طریقہ زبان کی ترسیل میں مدد دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے "رَقم" لفظ کو سکون اوسط یعنی "رَقْم" بروزن "زخم" لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات درست ہے۔ یہ لفظ اپنے دونوں معنی (رقم: بمعنی تحریر کرنا اور "رقم" بمعنی روپیہ پیسہ) میں متحرک الاوسط ہے۔

مثال (۱) جو جری ہیں انھیں حاجت نہیں اظہار کی ہے
تم مردوں کا رقم بارڑھ پہ تلوار کی ہے
(دولہا صاحب عروج لکھنوی) بمعنی تحریر

مثال (۲) تمہیں ناز ہو نہ کیونکر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ رقم نہ ہاتھ لگتی، دریا اختیار ہوتا
(داغ دہلوی) بمعنی نقدی

لے کے دل آپ جگر چھوڑ گئے سینے میں
اک رقم یاد رہی، ایک رقم بھول گئے
(داغ دہلوی) بمعنی نقدی

اسی طرح ص۵ پر مصنف کتاب ہذا تحریر فرماتے ہیں "چیونٹی کو بعض شاعروں نے 'فعلن' باندھتے ہیں جو صحیح نہیں۔ چیونٹی کا وزن "چیونٹی" (بروزن) فاعلن درست ہے۔ مثلاً چیونٹی ننھی سی تو اک جان ہے (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/ فاعلان) لیکن میر انیس نے "چیوں ٹی" باندھا ہے:

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دادِ کش ضعیفوں کے رازق تیرے نثار

ع چیونٹی بھی اور چوں میں نہ تھی آدمی تو کیا (میر انیس)

اب ایسی صورت میں ہم لغت کو مانیں یا اپنے شاعر کو۔ اسی طرح متعدد کلمات کی "صحت" والے باب میں کئی الفاظ کی حرکت و سکون اور اعراب سے اختلاف ممکن

مصنف نے کیا کیا ہوگا کتنا حصہ عمر عزیز کا اس میں صرف ہوا ہوگا۔ اس کتاب کے مطالعے کے بغیر اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ اس طرح "نکات فن" اردو کی پہلی کتاب ہوگئی جو بیک وقت اتنے فنون کا احاطہ ایک ساتھ کرتی ہے۔ مرتب اور ناشر قابل مبارک باد ہیں۔

کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت بعض باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں کہ میں اُن سے ناواقف تھا، خاص طور پر "سقوط حروف" والے باب کی بہت سی باریکیاں۔ جہاں مصنف نے الفاظ کی حرکت و سکون کی بحث چھیڑی ہے وہ بھی بڑی دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ "تقطیع کے اصول" اور زحافات کی کھینچا تانی سے باخبر رہنے کے لیے مبتدی شعرا کو خاص طور پر فکر کرنی چاہیے: "بحور کے اوزان و ارکان" پر بڑی اچھی بحث ہے۔ کہیں کہیں ارکان کے معاملے میں اکثر واقفین فن نے بعض ارکان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً بحر متقارب مقبوض اثلم شانزدہ رکنی کے ارکان اس کتاب کے مصنف نے فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن (تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی) بتلائے ہیں۔ مگر علی حیدر نظم طباطبائی نے ایک بحث میں یہ ارکان مانے۔ انھوں نے یہ کہا کہ اس کے اصل ارکان ہیں

مفاعلن فاعلن فعولن، مفاعلن فاعلن فعولن

اس طرح ارکان کی تعداد گھٹ جائے گی اور یہ بحر اب شانزدہ رکنی کے بجائے دوازدہ رکنی ہو جائے گی۔ مگر سوا نظم طباطبائی کے اور کسی نے یہ بحث نہیں اٹھائی۔ نجم الغنی بھی "بحر الفصاحت" میں "فعول فعلن" ہی مانتے ہیں۔

میری دلچسپی کے اس کتاب میں دو ابواب خاص ہیں۔ ا۔ "حرفی کلمات کے حرکات و سکنات (ص۵۰ ص۵۱ ص۵۲ ص۵۳) اور "مفرد کلمات کی صحت"۔ ایک اور باب "ہم وزن الفاظ" بھی قابل توجہ ہے۔ یہاں مصنف سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ مصنف نے بہت سے الفاظ کے اعراب و اصوات کو لغت کے سہارے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو میں اعراب و اصوات میں چین

ہے کہ یہ لفظ فارسی میں "نحوست" ہے۔ جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہے "نحوست" کوئی لفظ نہیں ہے۔ ناواقف لوگوں نے یا کسی مولوی نما مدرس نے بنا لیا ہے۔ فارسی میں بھی "نحوست" ہی صحیح لفظ ہے اسی طرح "نجوم" بہ فتح "ن" مگر اردو میں "ن" بالضم ہی مستعمل ہے۔ عوام وخواص سب "نُجوم" ہی بولتے ہیں۔ اسی طرح "سے" اس کی بجائے "پیچھے" کے ملنے میں تامل ہے۔ دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ "اس کے بجائے" رائج ہے نثر میں حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد کسی نے "اس کی بجائے" نہیں لکھا ہاں وہ لوگ جو اردو زبان ڈکشنری سے پڑھتے ہیں ضرور اس طرح کی عبارت لکھتے ہیں "آپ کے بجائے کوئی دوسرا کہتا تو مزہ چکھا دیتا" ہی اردو میں ملے گا اس عبارت کو اس طرح بھی بولتے ہیں "بجائے آپ کے کوئی دوسرا کہتا...... " اب اگر کوئی یہ لکھے "بجائے آپ کی کوئی دوسرا ... " تو پہلوئے ذم پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اسی پہلوئے ذم کو بچانے کے لیے "کی" "کے بجائے" "کے" کا استعمال شروع کیا گیا ہو۔

"نکات فن" میں کچھ ابواب معرکے کے ہیں جو اردو کے اس دور میں بے حد مفید اور پُراز معلومات ہیں۔ "تحقیق زبان" کے بہت سے مسئلے طالبان علم و دانش کو بھی ٹھٹھک کر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً "نورچشمی" "طول عمرہ" "قریب المرگ" "دائم المریض" "کلام الملوک ملوک الکلام" "روشن الدین" وغیرہ کو مصنف نے غلط بتایا ہے یہ بات درست ہے۔ مگر عام طور پر لوگ بولتے اور لکھتے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے "روشن الدولہ (کی کچہری لکھنؤ)" "معرکۃ الآرا" بھی غلط ہوئے "معرکۃ الآرا" کی "آرا" کو کچھ پڑھے لکھے بھی عربی سمجھتے ہیں اور "رائے" کی جمع تصور کرتے ہیں جب کہ "آرا" "آراستن" سے مشتق ہے رائے سے نہیں۔ جو لوگ "بڑی معرکۃ الآرا بات ہے" بولتے ہیں ان کا مطلب بڑی اہمی یا قابل داد بات سے ہوتا ہے "اچھی رائے والی بات" نہیں ہوتا۔

"راگ رنگ" اس کتاب کا آخری حصہ ہے (علم جو موسیقی اور اس کی مختصر تاریخ سے متعلق ہے اس کے متعلق میری معلومات صفر ہیں تاہم اس باب کے مطالعے سے مجھ جیسے عامی کو بھی بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ مصنف نے ایک جگہ "بھیرویں" کو روگ لکھا

شہجہاں تک ہیں نے سنا ہے بھیرویں کو لوگ "مرالی" کہتے ہیں۔ بسم اللہ خاں کو مشہور نماز گی انداز کہا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی بسم اللہ خاں مارلی کے لیے مشہور رہے ہوں مگر اب تو وہ خاص شہنائی بجانے کے لیے مشہور ہیں۔ کتاب کے آخر میں اوزان موسیقی کے لیے نقشے بھی بنے ہیں جن میں "تین تال" "جھپ تال" "چوتالہ" "روپک" "دادرا" "اور کہروا" دھروکی تصریحات درج ہیں۔ پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ فاروقی مرحوم نے کیسے ان مختلف النوع موضوعات پر عبور حاصل کیا تھا۔ ایک حیرت انگیز بات اور ہے کہ اتنی خوب صورت کتاب کی کوئی قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً اس لیے کہ یہ کتاب "نکات فن" واقعی انمول ہے۔

تبصرہ نگار: سید محمد عقیل۔ الہ آباد

لسان، فلسفے کے آئینے میں ——————— عتیل مامون

ناشر: وشیل دولت پبلی کیشنز، سلم چوک، گلبرگہ صفحات ۱۳۲ قیمت: ۳۶/۰

بظاہر یہ کتاب آٹھ مضامین کا مجموعہ ہے مگر غور کیجیے تو ان سب مضامین میں گہرا ربط ہے۔ آغاز ہوتا ہے گرونا تک کے فلسفے میں نام سے جو خود ایک علامت ہے۔ دوسرا مضمون غالباً اسی علامت نگاری پر ہے اور تیسرا مابعدیات معنیات پر۔ اس کے بعد فلسفہ لسان پر مختصر سا مضمون ہے اور اسی کا سلسلہ ہیڈیگر کے نظام فکر میں لسان اور ہسرل کی لسانی مظہریات کے مضامین میں جاری ہے۔ ان سبھی مضامین میں مغرب کے سر برآوردہ ماہرین کے لسانی نظریات سے بحث کی گئی ہے اور یہ بحث لسانیات اور فلسفے کی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ زبان میں الفاظ کس حد تک معنی ادا کر سکتے ہیں اور ان کی صوتی، نحوی اور معنوی حدود کیا ہیں۔ بہرک فام کی تصنیف "فرائڈ" کی کی لغت اور حدود کے ابتدائی مضمون سائنسی علم کے حدود کا خلاصہ بھی ایک باب کی شکل میں شامل کر دیا گیا ہے۔ آخر میں نئی فکر، سماجی تغیر اور لسان اور لسانی تمدن میں لسان اور اسطور کے عنوان سے ایک مختصر باب ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود کتاب نہایت شستہ اور رواں اسلوب میں لکھی گئی ہے اور فلسفہ لسان کے بعض اہم

مفکروں کے بنیادی خیالات کو نہایت فکر انگیز ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ اردو میں اپنے ڈھنگ کی پہلی اور اہم کتاب ہے۔

تبصرہ نگار: م۔ ح

• گناہ سخن (مجموعہ کلام) ——————— قاضی موہن سوز

ناشر: ۲۲۲۔ وی بی ہاؤس، مرکھ مارک۔ نئی دہلی صفحات: ۱۷۰ قیمت: ۵/-

گناہ سخن اردو کے ایسے چاہنے والے شاعر کا مجموعہ کلام ہے جو اردو رسم خط سے بے بہرہ رہ گیا مگر اس کی بول چال کی زبان اردو ہے اور اس کا ادبی ذوق اردو ہی کی روایات میں پروان چڑھا ہے اس اعتبار سے یہ کسی ہندی شاعر کی اردو غزلیں نہیں ہیں بلکہ اردو والے ہی کی غزلیں ہیں جس کو حالات نے اردو رسم خط سے آشنا نہیں ہونے دیا اسی لیے ان میں اردو کے اہم شاعروں کی جھلکیاں صاف ملتی ہیں شاعر نے ان جھلکیوں کو اپنے دکھ درد اور اپنے وسیع تر جذباتی شعور سے زیادہ تیکھا اور تابناک بنانے کی کوشش کی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

دل بھی مجرم ہے اسے ہم کیوں بتائیں پیار راز
اب یہ ٹھانی ہے کہ خود سے بات آہستہ کریں

ہر کوئی سنگ اٹھائے تھا کہ سر پھوڑنا ہے
ڈر نہیں تھا کہ وہ پتھر کہیں بھگوان نہ ہو
معرکہ ختم ہوا جنگ ابھی جاری ہے
دل کی مانیں کہ صد رکی ہی ڈھولیں ؟
بازاروں میں قتل و غارت کا سامان رہا اور خوب رہا
ہر ایک کے پہلو میں اس کا بھگوان رہا اور خوب رہا
جفا پرستی، دراز دستی، تو شیشۂ دل کو توڑ پائی

شاہ حسن کی شاعری اردو غزل کی مضبوط اور مستحکم روایات میں رچی بسی شگفتہ
اور دل دوز شاعری ہے جو غزل کی سرحدوں کو اور بھی وسیع کرتی ہے۔

تبصرہ نگار: م ح

• سرسید اقبال اور علی گڑھ ———— اصغر عباس
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ　　صفحات ۹۳　　قیمت ۱۰/-

اقبال سے علی گڑھ اور سرسید کے ذہنی اور جذباتی تعلق کے نشانات بڑی
محنت اور دیدہ ریزی سے یکجا کیے ہیں اور فکرِ اقبال میں سرسید اور علی گڑھ سے
ہم آہنگی اور یکرنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے

تبصرہ نگار: م۔ح

• فنی تنقید و تحقیق ———— ڈاکٹر حسن آرزو
ناشر: دل فزا پبلی کیشنز سہسرام　　صفحات ۱۲۰　　قیمت ۳۰/-

یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں علم الاعداد کی بنا پر مختلف
زاویوں کی کیفیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ و علم نجوم کی مدد لی گئی ہے بعلم نجوم کی
نافیں اور ہمارے شعرا نہایت دلچسپ اور [illegible] مضمون ہے۔ اسی طرح امیر خسرو پر مقالہ
ہے، دریافت کہ خسرو پانچ بادشاہوں کے درباری تھے انھوں نے پانچ تاریخی مثنویاں
لکھیں، پانچ دیوان مرتب کیے، پانچ زبانوں میں شاعری کی فارسی میں پانچ لاکھ اشعار
لوٹے، نثر میں رسائل کے پانچ دفتر لکھے۔ پانچ [illegible] روں میں عمر کا بڑا حصہ گزارا، پانچ علم
فنون میں کمال حاصل کیا اور ان کی مثنوی ۹ [illegible] بحر میں ۹ بحروں کو استعمال کرکے بھی
علم شناسی کا ثبوت دیا نئی دریافت ہی ہے۔ رنگین کے بارے میں یہ انکشاف
انھوں نے خود چالیس سال کی عمر میں اپنے فوت ہوجانے کی تاریخ لکھی تھی۔ سب سے
دلچسپ مضمون "اقبال کا تصورِ زباں ــــ ترسیل کی ناکامی" ہے۔ اقبال کے تصورِ زبان
کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کبھی برگساں کے خالص تسلسل زماں سے ہم کنار ہوتے

ہیں کبھی اس سے دست و گریباں، کبھی نیوٹن کے تصور زماں و مکاں کی تنقید کرتے ہیں، کبھی آئین سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے زماں مکاں کی نفی کرتے ہیں، کبھی زروان کو زمان و مکاں کی ایک علامت بنا کر پیش کرتے ہیں اور کبھی اسے رومی کی زبان سے ایک حقیقت کی ز[illegible] بتاتے ہیں، کبھی اسے عشق کی تقویم میں دیکھتے ہیں [illegible] مقام دل میں۔ غرض کبھی سوالیہ نشان چھوڑ دیتے ہیں کبھی سوال کا حل پیش کرتے نظر آتے ہیں:

زمان کے بارے میں اقبال کے بیانات کے تضاد کو حسن آرزو نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور روایتی اثرات کی واضح طور پر نشاندہی کی ہے۔

ایک اور دلچسپ مضمون قاضی عبدالودود پر بھی ہے جس میں حسن آرزو کے قاضی صاحب کا میادی مدد[illegible] ہے اور ان کا مولوی عبدالحق اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا سخت نکتہ چیں ہونا دراصل علم الاعداد کی باہمی کشش اور مخالفت کی وجہ سے ہے کیونکہ موخرالذکر حضرات کے نام کے اعداد قاضی عبدالودود کے نام کے اعداد کے مخالف ہیں

اقبال بڑے بت شکن اور موحد ہیں مگر حسن آرزو نے ان کو بھی انجم شناس مزکی کی حیثیت سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ غرض کتاب بڑی دلچسپ ہے۔

فصیل شب - (مجموعہ کلام) ———————— حامد اللہ آبادی

حامد اللہ آبادی ان شاعروں میں ہیں جو اپنے درد و کرب کو شعر میں ڈھالتے ہیں وہ بے اختیارانہ اور والہانہ طرز میں کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک غزل طرز زیست ہے۔ اس لیے کلام میں تیکھا پن اور گداز ہے جو دور حاضر کے اکثر غزل گو شعرا کے کلام میں نہیں ملتا۔ فصیل شب " ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے اور ان غزلوں میں ان کے دل کا درد سو بن کر پھوٹ بہا ہے۔

"روشنی" (مجموعہ کلام) ——————— وجاہت سندیلوی

ملنے کا پتہ: الصوت منزل سندیلہ (یوپی)

وجاہت سندیلوی نے طویل شاعری کی حیثیت سے نام پیدا کیا مگر ان کے شعری مجموعے ان کے ستھرے شاعرانہ ذوق کے بھی آئینہ دار ہیں۔ وہ غیر ضروری حشو و زوائد سے پاک شعر کہتے ہیں اور سنبھل کر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت کا احترام بھی ہے اور نئی تجربے کا انداز بھی۔

"کتھا" ——————— خالد اگا سکر

آٹھویں دہائی کی مراٹھی کہانیوں کا نمائندہ انتخاب اردو ترجمے کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ترجمہ نہایت شستہ اور رواں ہے اور کہانیاں بھی ایسی منتخب کی گئی ہیں جو اردو کہانی کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔ شروع میں ۳۲ صفحات کا معلومات افزا اور خیال انگیز دیباچہ ہے جس میں آٹھویں دہائی کی اردو کہانی کا بھی ذکر ہے اس تقابلی مطالعے میں البتہ بعض جگہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ اردو کہانی شہر ہی میں سمٹ کر رہ گئی ہے (۲۶) درست نہیں۔ یوں ہوتا تو نہ سریندر پرکاش کی کوکا ہوتی نہ غیاث احمد گدی کے افسانے۔ اسی طرح حسین الحق کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی کہانیوں میں زندگی بکھری بکھری سی ہے (۲۵)، صحیح نہیں۔ اس کے علاوہ اردو دہائی کے بعض اہم نام چھوٹ گئے ہیں۔ بہرحال اس سے مراٹھی کہانیوں کے ترجمے کے ذریعے جو ادبی خدمت انھوں نے انجام دی ہے اس کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

"یادبسیرے" (کہانیاں) ——————— از انور خاں

ناشر: تخلیق کار، ۳۰، فراش خانہ، دہلی ۶ صفحات ۱۲۰ قیمت: ۳۰/۰

"یادبسیرے" انور خاں کی ۱۸ واقعی مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان سبھی کہانیوں میں انور خاں نے تجربے کے پھیلاؤ کے بجائے ارتکاز پر زیادہ زور دیا ہے۔ کہانیاں ہے کو ہیں ایسی خاصی افسانوی غزلیں ہیں جنھیں بڑی نرمی، شائستگی، لطافت

ریشانی ہے۔ یاد بسیرے شاید اس مجموعے کی سب سے اہم بہ صورت کہانی ہے
نہیں۔ دنوں بعد شہر سے آبائی گاؤں کی طرف ایک اچھے بھلے خاندان کی واپسی کا
منظر ہے مگر انور خاں نے اسے داخلی لطافت احساس اور نزاکت اسلوب سے غزل کا
پیرایہ دے دیا ہے۔ کہانی میں کوئی واقعہ نہیں مگر وقت اور اس کے ساتھ سماجیاتی
مسلوں نے کیا کھیل کھیلا ہے کہ اپنے وطن میں لوگ اجنبی ہو گئے ہیں ان کی گود میں
صرف یادوں کے پتے رہ گئے ہیں۔

"ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کئی پتے شاخوں سے جدا ہو کر فضا میں ڈولنے لگے۔ ایک پتہ لہراتا ڈولتا خورشید کی گود میں آگرا۔ اس نے عقیدت سے پتے کو ہاتھ میں لیا اور اس کی چکنی شفاف سطح پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ حبیب ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ اس پتے کو آنکھوں سے لگا لیتا۔" (ص ۱۰)

احساس کی یہی لطافت اور نفاست ان کہانیوں کی قدر مشترک ہے جسے وہ ناں زمانے کی دشت برد اور ترقی کی اندھی دوڑ میں روندے جانے سے بچا لائے ہیں۔

مصری ٹائپ ۶۶ دہلی

عصری ادب

شمارہ ۶۷ — اپریل تا جولائی ۱۹۹۲ء

نگراں
محمد حسن

مدیران
ڈاکٹر روشن آرا
سید ضیاء الدین احمد

فی شمارہ: بیس روپے — زرِ سالانہ: پچھتر روپے
بیرونی ممالک سے: ایک پاؤنڈ فی شمارہ (علاوہ محصول ڈاک)
پاکستان سے: فی شمارہ بیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ تصنیف
ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹
فون نمبر: ۷۲۳۳۴۷۳

(ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سید ضیاء الدین احمد نے این۔ کے انٹرپرائزز ۱۳۹۴ فراش خانہ دہلی سے چھپواکر ادارۂ تصنیف ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹ سے شائع کیا)

فہرست

حرفِ آغاز

اس بار "عصری ادب" اپنے دامن میں کئی خاص سوغاتیں لایا ہے اور ان
اقوں میں نیاپن بھی ہے۔

غالباً سب سے اہم ہے پروفیسر ہربجن سنگھ کا ترانۂ ہندی کا تنقیدی
نظم جتنی پرانی ہے تجزیہ اتنا ہی نیا ہے اور بعض شین اور قاف گننے تک
نہیں ہے متن کے حدود میں سختی کے ساتھ رہنے کے باوجود شعر فہمی کی
کیسی جہات اس تجزیے میں روشن ہوئی ہیں اس کا اندازہ مطالعے
بعد ہی ہوگا۔ پروفیسر احتشام ندوی نے تقابلی ادب کا تعارف کرایا
ور عربی کے مآخذ سے کرایا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔

اس بار حصۂ نظم پر خاص طور پر توجہ کی گئی ہے۔ دو ایک پرانی نظموں
علاوہ جو موجودہ حالات سے ہم آہنگی کے باعث دہرادی گئی ہیں ہر نظم
ی دردمندی سے اور ہر غزل ایک انوکھی کیفیت سے دوچار ہے اور ان
ات نے ایک قوس قزح بکھیر دی ہے۔

افسانوں میں انور خاں، شین حیات، اور رفعت نواز تینوں کے
نے معرکے کے ہیں اور تینوں کے خاتمے نہایت قابل توجہ ہیں۔ انور خاں
سانہ قبرستان کے ذکر سے معمور ہے مگر اس کے عقب میں زندگی کی جیسی
جاگتی مولسری کی جھلک ہے کہ موت پر گویا فتح یاب ہو جاتی ہے شین حیات
سانے کا اختتام مظلوموں کی مقاومت پر ہوتا ہے مگر کیسا اختتام! اتنا
بلکہ ہر دو پھر تین پھر نہ جانے کتنے ہاتھ اٹھتے ہیں جو اس مزاحمت بلکہ
ومت کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور رفعت نواز کا افسانہ جو دو سلسلوں

کے درمیان کشمکش کا آئینہ دار ہے گو خاصے میں زور زیادہ خوشگوار ہو گیا ہے
مگر بے رحمی کے ساتھ باپ اور بیٹے کے جدا گانہ نقطۂ نظر کو ایک دوسرے کے
مقابل رکھ دیتا ہے۔
شخصیات کے ضمن میں اس بار بلراج ساہنی کے علاوہ سرو جنی نائیڈو
پر اقبال متین کا خاکہ توجہ طلب ہیں —— ایسی نئی اور پرانی چنگاریاں
ہمارے خاکستر میں بہت ہیں جن سے حال کی تیرگی میں جگنوؤں کی سی چمک
پیدا ہو سکتی ہے۔
پھر سائنسی معلومات اور سائنسی نقطۂ نظر کے بارے میں ایک مضمون
بھی ہے جو قارئین کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

رخصت ہونے والوں کو سلام

۱۔ ڈاکٹر معصوم رضا راہی — مکالمہ نویس، شاعر، ناول نگار
۲۔ کرنل بشیر حسین زیدی — ماہر تعلیم
۳۔ ستیہ جیت رے — فلم ساز، شاعر اور فن کار
۴۔ سرور تونسوی — مدیر "شانِ ہند"

ہم سے رخصت ہو گئے۔ ادارہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا ہے
اور انھیں سلام عقیدت پیش کرتا ہے۔ ادارہ

آڑے ترچھے آئینے

آئیے نئے سرے سے سوچیں:
آٹھ سال اور ہیں اور بیسویں صدی ختم ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ ختم ہوں گے سوچ بچار کے بہت سے زاویے۔ بس ماندگی اور بچھڑے پن کو ماضی بہت پیارا لگتا ہے اور ہر آن وہ مستقبل کے ڈر سے بند ریا کی طرح اپنے مردہ ماضی کی کھکھوڑل کو سینے سے لگائے گھومتی ہے ہمارا معاشرہ بھی ماضی کے حصار میں بند ہے ـــــ ضرورت سے کہیں زیادہ!
ہماری ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی پرانی سوچ کے جواز میں نئی وزنی دلیلیں ڈھونڈھ لائیں یا یہ ثابت کر دیں کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے زمین آسمان وہی ہیں اور جن حقیقتوں سے ہم دوچار ہیں وہ زمین آسمان کی طرح قدیم ہیں۔
آئیے، ماضی سے دامن چھڑا کر نئی نظروں سے نئے اُفق دیکھیں، نئے رویے اپنائیں اور زندگی کے ہر رُخ پر از سرِ نو نظر ڈالیں۔ زندگی، معاشرہ، انسانی رشتے، ادب، سائنس، حقیقت اور جمالیات بھی اس نئی فکر کے منتظر نہیں۔
ڈریے نہیں، راستہ پیچھے کی طرف نہیں ہے آگے کی طرف جاتا ہے۔ ؎

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر نکلو
زندگی شمع لیے در پر کھڑی ہے یارو

یہ بہت ہوا کہ امریکا، برطانیہ، کناڈا، یورپ اور خلیجی ممالک میں اردو کے فروغ پر اپنی پیٹھ تھپتھپالی اور اردو کے مستقبل سے مطمئن ہو بیٹھے۔ قابلِ قدر ہیں

دو نسلوں سے ہندو پاکستان سے بہت دور رہ کر بھی اپنی زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اردو زبان کی بقا کا ہو یا اردو ادب کے فروغ کا مسئلہ تو گہرا ہوا ہے ادب کے فکری اور فنی تموّل سے اور یہ تموّل یہ فکری یہ بلندی، افکار اور ندرت اظہار پوری اردو برادری کی مشترکہ ذمہ داری ہے اگر کناڈا اور برطانیہ میں بسنے والے صرف ہندو پاکستان کے اہل قلم سے سرٹی فکیٹ وصول کرتے رہیں اور ان پس ماندہ ممالک کے چھوٹے چھوٹے قصبوں کی ادبی محفلوں کی ناشکیبائی کا ٹ بیچ ہی میں پھنسے رہیں اور ہندستان اور پاکستان کے اردو والے بھی کسی طرح کی تحریریں لکھتے رہیں تو پھر آج کی دنیا کی آگہی کی روشنی سے اردو ادب کو جگمگانے کا کام کون کرے گا اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو کی عالمی برادری اپنی ذمہ داری پہچانے۔ بڑے پیمانے پر عالمی ادب کے ہی نہیں عالمی فکر کے شاہکاروں کے ترجمے ہوں۔ آج کی دنیا میں چھپنے والے اور آج کی دنیا کو متاثر کرنے والے سبھی اہم مضامین کی گونج اردو والوں تک ان کی اپنی زبان اور محاوروں کی دلنشینی اور سلاست کے ساتھ پہنچے اب یہ مضامین خواہ سائنس کے ہوں یا زندگی کے سائنٹفک نقطۂ نظر سے گزارنے کے بارے میں ہوں خواہ فلسفیانہ جہت کے ہوں یا جمالیاتی کیفیت کے۔

سوال محض معلومات کا نہیں ہے رویے کا ہے زندگی کے ان گنت پہلوؤں کی طرف ہمارا رویہ کیا ہو، پھر اردو دنیا خصوصاً ہندستان اور پاکستان میں روایت پرستی ذہن اور جذبے کا سانچہ بن گئی ہے یوں بھی ہم کلیشے اور فرسودہ اصطلاح کی بیساکھیوں کے بغیر اعتماد سے قدم اٹھانے کے عادی نہیں مگر دنیا میں ادب وہی زندہ رہتا ہے جو واقعی فکر و احساس پر اعتماد کرے اور اعتماد کرنا سکھائے۔ یہی اعتماد کی کھوج، یہی بغیر بیساکھیوں کے نئے مسائل پر اپنے رویے طے کرنے کی للکار پوری عالمی اردو برادری کو درپیش ہے۔

کچھ نئے سوال

آیئے نئے طرز سے سوچیں،

- سرمائے کی دنیا ختم ہوئی۔ انسان ذاتی منافع سے قدم آگے نہ بڑھا سکا اور عالمی مارکیٹ ذاتی منافع کی بنیاد پر مستحکم ہے مع اپنے تمام ستم ظریفیوں کے
- مشینی زندگی سے مفر نہیں۔ کل نل کے رواج نے سقے اور بہشتی کو بیکار کیا تھا، بجلی آنے سے مشعلچی بیکار ہوئے۔ بڑے کارخانوں سے دستکار اور چھوٹے صنعت کار اُجڑے۔ اب کمپیوٹر اور لیزر سے آسانیاں اور بیروزگاری دونوں بڑھیں گی۔ ان سے مفر نہیں۔
- ہر ملک کی معیشت کا انحصار دوسرے زیادہ ترقی یافتہ ملک کی معیشت پہ ہے یعنی سب کے داتا جاپان اور امریکا ـــــ سوال ہے کہ اس مفروضے کی کیا حیثیت ہے جسے "قومی آزادی" کا نام دیا جاتا رہا ہے اور جس کی خاطر لاکھوں اپنی جان سے گئے۔ لاکھوں اپاہج ہوئے لُٹے اور برباد ہوئے کیونکہ آزادی اور اقتصادی غلامی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ آزادی محض اقتدار کی رنگت بدلنے کا نام نہیں ہو سکتا۔
- جب اقتصادی سطح پر قومی فلاح ممکن نہیں اور سب کے داتا فورڈ اور اِک فیلر ہی کو ہونا ہے تو اپنے اوپر ہی نظر کو زکیوں نہ رکھی جائے؟ ذات اور صرف اپنی ذات۔ جیب اور صرف اپنی جیب، خوشحالی اور صرف اپنی خوشحالی؟ لمحہ اور صرف لمحۂ موجود۔
- نئی اخلاقیات ـــ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنی زندگی کو کس طرح سنوار سکتے ہیں دوسروں کو کم سے کم نقصان پہنچا کر یعنی دنیا میں جو قانون نافذ

[illegible] ENLIGHTENED SELF INTEREST روشن خیال مفاد پرستی
کا قانون ہے اور اس قانون کا نفاذ ہر ایک پر لزوماً فرداً ہوتا ہے۔

♣ اس قانون کی گرفت میں آپ کی ذات آتی ہے خاندان نہیں، کیونکہ خاندان کا تصور تو معیشت نے آپ سے چھین لیا ہے۔ مشترکہ خاندان ٹوٹ چکا۔ عورت اور مرد کے رشتے اب (خاندانی منصوبہ بندی بلا ضبط تولید کی چھپ) نسل بڑھانے اور بچے پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف جنسی پیاس بجھانے کے لیے ہیں اور اس کے لیے گولیوں سے لے کر نرودھ اور بچہ گرانے تک کی قانونی سہولتیں موجود ہیں۔ پھر جنسی ضرورت پوری کرنے کے بعد طویل سماجی رفاقت اور ایک دوسرے کے مزاج داری اور نباہ کیسا اور کیوں؟ بچے اگر ہو بھی گئے تو چڑیا کے بچوں کی طرح پر نکلتے ہی پھر سے اڑ جائیں گے اور چلیں جی چاہے گا چلے جائیں گے اس کا نام ہوا نیوکلیائی خاندان جس میں والدین کی اگر کوئی ذمہ داری ہے تو بس بلوغت تک۔ باقی عمر یا تو جدائی میں یا پھر جنریشن گیپ (نسلی خلیج) کی نذر۔ طلاق بے معنی اور ماں باپ اور بیٹے بیٹیوں کی پسند کی یکسانیت اور تہذیبی اور نسلی ہم آہنگی غیر ضروری!

♣ اس سے عشق و عاشقی کا بھی ایک نیا تصور ابھرنا لازمی ہے۔ عورت اور مرد چونکہ یکساں رتبے کے ہیں یا کم سے کم مانے جاتے ہیں سو یا تو پرانے تصور کو برقرار رکھ کر بیوی جہیز کے لیے بیاہ کر لائیے اور جہیز کم ملنے پر اسے زندہ جلا دیجیے یا پھر عورت الگ زندگی گزارنے کی جدوجہد میں ہر روز جھگڑے، اور اس جھگڑے میں بچوں کی پرورش کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا رہے عشق جسم کی تڑپ اور اس کی کرشمہ سازی کا بیان بھی نہ رہے صرف لمحے دو لمحے کی جنسی پیاس بن جائے اور اپنے سارے الوہی تلازمے بھول جائے۔ نشاط و کرب سے بے غرض ارتعاش احساسات تک محدود۔ سو ہماری عشقیہ شاعری کا کیا ہوگا؟

٭ یوں ہے تو کیا ماضی کی پناہ گاہوں میں سکون ہے؟ مذہب اور ذاتی عقیدے کی پناہ گاہ ہے تو سکون کا باعث ہو سکتا ہے لیکن اگر عمل اور معقولیت سے فرار کا وسیلہ ہے تو اس کی افادیت محدود ہے پھر اس میں تصوف، رواداری اور صلح کل کا رنگ ہو تو آہستہ آہستہ توکل کے راستے سے مجہولیت، پست ہمتی اور یاس ماندگی آجاتی ہے اگر کٹرپن اور تفاخر کا رنگ آجائے تو فرقہ پرستی اور تعصب، دوسرے مذہب والوں کے خون سے زمین رنگین کر دیتے ہیں پھر لیزر اور کمپیوٹر کے دور میں مذہب اور روحانیت شاید لمحاتی تسکین فراہم کر سکتے ہوں، حل فراہم کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں ممکن ہے مسائل کو اور زیادہ الجھا دیں۔

٭ کیا ماضی کی طرف گہری وابستگی کا رویہ موزوں ہے (خصوصاً وہ رویہ جو ہم ایشیائیوں نے اپنا رکھا ہے)؟ کیا واقعی تاریخ پرستی اور ماضی کی پرستش (خواہ وہ گزرے جاہ و جلال کی شکل میں ہو، قومی اور نسلی تفاخر ہو یا وطن پرستی یا اخلاقیات، مذہب اور روحانیت سے اندھا لگاؤ) ہمیں بہت دور لے جا سکتی ہے؟

انسان شاید بہت تنہا رہ گیا ہے مگر تنہائی کی اس مملکت میں اسے بہرحال اپنے سوال اپنے طور پر (اور اپنے طور پر ہی) حل کرنے ہوں گے خصوصاً ادب اور فکر کی قلمرو میں، کہ ادب محض کار فضول یا لکڑی دو گھڑی کی پھلجھڑی نہیں دوسروں سے پہلے خود اپنے رو برو جواب دہ ہونے کا وسیلہ بھی ہے۔ نئے سوالوں کی آگہی نہ ملی تو ادب میں سنگلے کی سائیں سائیں کے سوا اور کچھ سنائی نہ دے گا۔

زوالِ روس کے بعد کے فکری مسائل

اک شور ہے دنیا میں اُجالا نہیں ممکن

اک شور ہے دنیا میں اُجالا نہیں ممکن، مارکسزم کا بلبلہ پھوٹ گیا مشرقی یورپ اور مشرقی جرمنی میں بغاوت کا علم بلند ہوا سوویت یونین کو، روس سے اشتراکیت کا گلوبہ خاتمہ ہو گیا اور اب وہاں ایک ریاست کے بعد دوسری ریاست خود مختاری کا اعلان کر رہی ہے دنیا نے گویا مارکسزم اور اشتراکیت دونوں کو رد کر دیا اور دنیا کے سرمایہ داروں اور ان کے مفکروں اور دانش وروں کے جھنڈے پوری دنیا میں بڑے کر و فر سے لہرا رہے ہیں. تو کیا دنیا کا مقدر صرف خواب اور شکست خواب ہی ہے؟ کیا انسانی ارتقا محض ایک دھوکا ہے؟ کیا دنیا کے انسانوں کے تقدیر میں ایک رات کے بعد دوسری رات ہی لکھی ہوئی ہے، کیا مظلوموں اور محنت کشوں کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے؟

ان سوالوں اور ان جیسے ان گنت سوالوں پر غور کرنے سے پہلے سوالوں کی درجہ بندی کر لی جائے. معاملات دو ہیں گو ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں پہلا مسئلہ ہے اشتراکیت کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کا جس کی مختلف شکلیں سوویت روس، یوگوسلاویہ، پولینڈ، ہنگری اور مشرقی جرمنی — دوچین اور کیوبا — میں اور رومانیہ اور البانیہ میں نظر آئیں. کیا اس نظام اپنے رہنے بسنے والوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکا یا نہیں؟ اگر کر سکا تو کس حد تک اور اگر نہ کر سکا تو کس حد تک؟ اور اگر ناکامی ہوئی تو اس کی نوعیت کیا تھی اور اس کی ذمہ داری کس حد تک اہل اقتدار کے سر تھی اور کتنی

خود نظام کے سر؟

دوسرا مسئلہ ہے خود مارکسی طرزِ فکر اور طرزِ فلسفے کے مارکسزم کے طور پر کہ کیا فلسفے یا فکری نظام کی حیثیت سے مارکسزم قابل قبول ہے یا نہیں۔

پہلی بات یہ کہنی ہے کہ مارکسزم کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے جو ہمیشہ کے لیے ہو اور جس کا رد و قبول ممکن نہ ہو۔ مارکسزم سائنس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یعنی اگر عقل کی کسوٹی پر پورا اترے تو اسے قبول کیجیے پورا نہ اترے تو اسے رد کر دیجیے۔ وہ عہد بعہد تبدیلیوں کا بھی منکر نہیں اس لیے جو اس کی گواہی اور عمل کی شہادت مارکسزم کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آخر کیا پتا پڑی کہ لگ بھگ ۷۰ سال بعد سوویت روس اور ۴۵ سال بعد مشرقی یورپ کے ممالک کو اپنے انتظامی ڈھانچے اور سیاسی نظام کو بدلنے کی ضرورت پیش آئی۔ اگر دشمنوں سے بھی پوچھیے تو دو ہی باتیں بتائیں گے ایک یہ کہ وہاں انفرادی آزادی نہ تھی دوسرے یہ کہ وہاں معاشی آسودگی کی کمی تھی۔

جہاں تک انفرادی آزادی کا سوال ہے جس کے نہ ہونے کا شکوہ سولزے نتسن اور پاسترناک کے حوالے سے کیا جاتا رہا ہے اسے کسی حد تک تسلیم کر لینے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ بات لینن ہی نہیں کمیونسٹ نظام کے سبھی معماروں نے کہی ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد کچھ عرصے تک اشتراکی نظام میں پرولتاری ڈکٹیٹر شپ قائم رہنا ناگزیر ہے۔ یہ مستقل طور پر قائم نہیں رہے گی مگر کچھ مدت ضرور رہے گی خاص طور پر اس وجہ سے کہ یہ نظام طبقہ واری ہے اور استحصالی طبقے کے اثرات حکومت اور اقتدار ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اتنے زیادہ کہ وہ محنت کشوں کے اقتدار کو ہلا سکتے ہیں اور اپنے قومی اور بین الاقوامی اثرات سے اس کا تختہ پلٹ سکتے ہیں۔

سو کچھ تعجب کی بات نہیں کہ انفرادی آزادی کے سوال کو سوویت یونین اور

کمیونسٹ ممالک کی اشتراکی اور نیم اشتراکی حکومتیں اس طرح حل نہیں کرسکیں جس طرح کہ غیر اشتراکی یا نیم جمہوری حکومتوں میں ہوا ہے۔ اس مجبوری میں اضافہ کیا اس بات کا کہ سوویت روس پہلے، عالمی جنگ کے دوران بڑی مدت تک دنیا کا تن تنہا اشتراکی ملک رہا ہے اور چاروں طرف فاشسٹ اور سرمایہ دار ملکوں سے گھرا رہا ہے اور ان کی جارحیت کا شکار رہا ہے۔ یہ بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اشتراکی نظام انفرادی آزادی کے مسئلے کو حل نہیں کرسکا۔ یہ الگ سوال ہے کہ یہ مسئلہ کس طبقے کے فرد کا ہے، فٹ پاتھ پر دم توڑنے والے فرد کا یا عیش محلوں میں بسنے والے فرد کا۔

اس سے جڑا ہوا سوال ہے معیشت کا۔ ظاہر ہے کہ دشمنوں سے گھرا ہوا ایک ملک جو حال کے زمانے تک پس ماندہ تھا جینے کے لیے فوجی تیاریوں کے لیے مجبور تھا اور فوجی تیاریاں کیسی؟ ایٹمی جنگ کی تیاریاں جس میں ہر روز سائنس کی ایجادات نت نئے ہتھیاروں کا اضافہ کر رہی تھیں لہٰذا ایک ایسے ملک کے بجٹ پر اس کا اثر لازمی تھا اور اس کا اثر اتنا تو پڑنا ہی تھا کہ وہ معاشی خوشحالی وہاں نہ آئے جو بورژوا یورپی ممالک یا امریکہ میں آئے جہاں یا تو جنگ عظیم لڑی ہی نہیں گئی یا جن کی فوجی تیاریوں کا پورا بوجھ امریکہ نے اٹھا رکھا ہو۔

جو احباب (اور ان میں کمیونسٹ ملکوں کے رہنے والے بھی شامل ہیں) اسٹالن کے منہ پر کالک مل کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں بڑی زبردست کمیوں کے باوجود یہی وہ نظام تھا اور ہے جس نے

۱۔ روس جیسے پس ماندہ زرعی ملک کو جاگیردارانہ سطح سے ابھار کر صنعتی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچایا کہ آج دنیا کے دو بڑے ملکوں میں ہے۔

۲۔ روس کو دوسری جنگ عظیم کی بدترین تباہیوں کے باوجود، صرف ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹ فوجوں کے مقابلے میں فتح دلائی اور اس تباہ شدہ ملک کو بہت ہی مختصر مدت میں دوبارہ تعمیر کر دیا کہ اپنے

پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ جہاں جہاں پر جنگ لڑی گئی وہ کسی ملک دوسرے اور تیسرے درجے کے ملک بن کر رہ گئے مثلاً انگلستان اور فرانس وغیرہ نے ترقی کی تو اول تو وہاں زمینی جنگ لڑی نہیں گئی دوسرے ترقی تمام تر امریکہ کے سہارے ہوئی صرف سوویت روس نے جو کچھ ترقی کی اسپتنک بنائے، چاند پر کمندیں ڈالیں، ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنائے وہ بے ساختگی کی اور اس کام میں اسٹالن کی انفرادی کوششوں کو بھی دخل تھا۔

۳. اس پورے زمانے میں روس کے قید خانوں اور سائبیریا کے کس کس ٹریننگ کیمپوں کا ذکر تو بہت ہوا مگر کسی نے ابھی تک یہ نہیں کہا کہ روس میں بھکاری بہت ہیں یا بیروزگاروں کی بڑی تعداد ہے یا لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ہیں اور قحط میں بھوک سے مرتے ہیں مطلب اس کا یہ ہوا کہ یہ دور سابق میں پس ماندہ ملک جنگ عظیم کی ساری تباہیوں کے باوجود اس قابل رہا کہ اپنے بے حد طاقتور دشمنوں کے مقابلے کے لیے دفاعی تیاریاں بھی کرے اور اپنے کروڑوں باشندوں میں سے ہر ایک کو روٹی، کپڑا اور مکان بھی فراہم کرے۔ (یہ مان لیجیے کہ کپڑا موٹا جھوٹا، روٹی ادنیٰ درجے کی اور مکان معمولی رہا ہوگا) مگر کیا یہ کارنامہ معمولی ہے؟

۴. دور حاضر کی بات جانے دیجیے بڑے سے بڑے کمیونسٹ دشمن نے سوویت روس کے اس معاشرے میں بھیک، نشہ آور دواؤں، قحبہ خانوں اور نائٹ کلبوں کا ذکر نہیں کیا یعنی خوش حال بورژوا معاشرے کے برخلاف یہ کسی قدر کم خوش حال معاشرہ بورژوا معاشرے کے انحطاط سے محفوظ تھا اسمگلنگ کا دھندا استحصال کے بھیانک روپ، جسم فروشی سے محفوظ۔

چنانچہ اس معاشرے میں یکساں تھیں اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ استحکام نہ ہونے سے عوامی نمائندوں کے بجائے خود ایک طرح کی نوکر شاہی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ نشانیاں اس کی سولزنیٹسن اور پاسترناک کے ناولوں اور قصوں میں ملتی ہیں اور اس کی وجہ سے پورے معاشرے میں ایک قسم کی گھٹن محسوس کی جانے لگی اور آخر کار یہ ظاہر ہوتا آیا ہے یعنی

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام

گویا جو کچھ ہوا ہے وہ صرف اتنا ہوا ہے کہ سوویت نظام اور اشتراکی نظام کی دو بنیادی خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے،

اول یہ کہ یہ نظام انفرادی آزادی کا مسئلہ حل نہ کر سکا اور اس مسئلے کے حل کرنے سے پارٹی کے کارکنوں میں خود اپنی آمرانہ نوکر شاہی پیدا ہو گئی جس نے استحصالی رخ اختیار کر لیا۔

دوسرے یہ کہ معاشی ضرورتوں کو یہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام کی سطح پر پورا کرنے میں ناکامیاب رہا (اس کے اسباب سے بحث نہیں) اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یاران طریقت نے ضروریات سے متعین ہونے والی معیشت کے بدلے بازار کے تقاضوں سے متعین ہونے والی معیشت اپنانے کا فیصلہ کیا (گویا گھڑی کی سوئیوں کو اشتراکی نظام کے بجائے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف گھما دیا۔)

بجا اور درست، اگر واقعی انسانیت بازار کی ضرورتوں سے مجبور کر ہی خوش رہ سکتی ہے تو یونہی سہی۔ مارکسزم ہو یا اشتراکیت، ان سب کو رد کیا جا سکتا ہے مگر ٹھہریے۔ اس مرحلے پر ایک نظر سرمایہ دارانہ نظام کے اعلیٰ ترین مراکز پر بھی ڈالتے چلیں۔ امریکی سماج کی برائیاں گنانا مقصود نہیں لیکن اتنا تو دوست دشمن سبھی مانیں گے کہ امریکی نظام اپنے ایگ، اپنے تناؤ بھرے اعصاب زدہ مزاج، نائٹ کلبوں اور پورے کل معاشرے کے پیش نظر کسی مثالی نظام نہیں ہے اور یہاں کی نوج

دیہی زندگی اور جسمانی محنت خواہ اقوام کے نیک نظر سوویت نظام اس سے کہیں بہتر تھا یا کسی حد تک ہے یہاں دو کروڑ باشندوں کی بجائے ... کو وطن سے خارج فوراً حاصل شدہ کاری ہوئی ... کے لئے میں جان دینے والے امریکی نوجوان ہیں جن کی لاشیں ... کے احاطے سے اٹھائی جاتی ہیں۔

اشتراکیت ہے کیا بصرف یہی تو ہے کہ پیداوار خواہ زراعتی ہو یا صنعتی اس لئے نہ کی جائے بلکہ انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہو یعنی آپ کی اور ہماری زندگی پر حکمرانی مارکیٹ کی نہ ہو ہمارے فطری تقاضوں کی ہو۔ ظاہر ہے بات سیدھی سادی ہے مگر ہے خاصی دشوار۔ کیونکہ انسان صدیوں سے خود غرضی اور جمع خوری کی بیماریوں میں مبتلا ہے اور وہ اپنا قدرتی پتلے تو اپنے تقبوضات سے ہزاروں سال نے اسے استحصال سکھایا ہے، ذاتی جائیداد حاصل کرنے اور ذاتی دولت کمانے کی سیکھ دی ہے اس میں لالچ پیدا کیا، ذاتی اور نجی دولت کا تصور پیدا کیا ہے۔ گویا سوال تھا اور ہے —— اس لالچ خود غرضی اور نجی سوار تھ سے آزاد انسانی شخصیت کی تعمیر نو کا۔ اور جو احباب صنعتی پیداوار میں ذاتی نفع یا خود مزدوروں میں بھی انفرادی کوششوں کا معاوضہ ذاتی آمدنی کے تصور داخل کرنا چاہتے ہیں وہ گویا نئے انسان کی تشکیل سے ناامید ہو کر پرانے راستے کا رخ کرتے ہیں۔ اشتراکی نظام کو رد کر کے مارکیٹ کے نظام کو نافذ کرنے کے اس کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں۔

کیا مادی جائیداد اور جمع خوری کے لالچ کے علاوہ انسان کے لیے بہتر کام کرنے کے لیے دوسرے محرکات نہیں ہو سکتے۔ کیا انسان سدا اچھی لالچوں میں گھرا ہوا ملکیت اور دولت کے کھاتے ہی تصنیف کرتا رہے گا۔ ہو سکے یاد ہو کہ ہمارے خواب کی بات یہ ہے کہ اس نئے انسان کی تشکیل کا خواب کیا دائمی دیکھنے کے قابل تھا بلکہ ایسے انسان کا خواب جو محض جوڑے ہوئے پیسوں اور حاصل کی ہوئی دولت

اور وہ اتنے طاقتور ہو کہ دوسروں کا استحصال کرنے کی اپنی صلاحیت سے دستبردار ہو جائے۔ آپ کو وہ نظام چاہیے بلکہ اپنی کامیابی کے اس سے مختلف اور اس سے بہتر معیار تلاش کرے۔ سوشلزم اور کمیونزم اگر اس کی تشکیل نو میں کامیاب ہو سکے دیکھیں مگر یہ کوشش تو مبارک ہے تاکہ آدمی منافع خوری، دولت پرستی جائیداد اور استحصال کے چکر سے نکلے اور اپنی ضروریات کے مطابق پیداوار پر ہی خوش رہے اور اس پیداوار کا معیار ہی نہیں اس کی اپنی زندگی کا معیار بھی بلند ہو۔ اس کی اپنی شخصیت زیادہ ذہنی اور جذباتی آسودگی اور سربلندی پائے اور نون، تیل، لکڑی کے چکر سے آزاد ہو۔ اگر اس خواب کی تعبیر سرمایہ دارانہ نظام فراہم کر سکتا ہو تو کرے۔ استحصال اور استبداد کو بند کرے اور فرد کی آزادی کے علمبردار نئے ویت نام اور نکاراگوا بنانا بند کریں اور انسانیت کی عالمی ترقی میں معاون ہوں جو اسٹار وار اور ایٹمی تجربوں سے کہیں عظیم کام ہے۔

اب اس مسئلے کے دوسرے پہلو پر غور کیجیے، کیا مارکسزم ناکام ہو گیا؟

مارکسزم کیا ہے؟ اس کی اصل ہے مادی جدلیت یعنی یہ اصول کہ دنیا میں جو کچھ بھی ترقی ہو رہی ہے وہ طبقاتی جدوجہد کا نتیجہ ہے اور طبقات دو ہیں ایک استحصالی اور دوسرا وہ جس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس مسئلے کے چار پہلو ہیں اور چاروں پہلوؤں پر الگ الگ غور کرنا چاہیے۔

پہلا عملی پہلو ہے یعنی موجودہ سماج میں استحصال ہے اور اسے طبقاتی ٹکراؤ کے ذریعے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس مسئلے پر لوگوں کی رائیں مختلف ہیں بعض ایسے ہیں جو سوچتے ہیں کہ ٹکراؤ سے یہ مسئلہ حل نہیں بلکہ تدریجی ارتقا سے حل ہو جائے گا کچھ ایسے بھی ہیں جو اہل ثروت کو خدا کا مقرر کردہ غریبوں اور استحصال ہونے والوں کا محافظ جانتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو سرمایہ داری کے اندر ہی نجات کا امکان دیکھتے ہیں اور یہ بھی سوچتے ہیں کہ وقت خود راہنما رہا ہے۔ ممکن ہے بعض کے فکری رد بے دست ہوں لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے اور تحفظ

قائم ہے لیکن معاشی یا آزاد معیشتی نظام جو [illegible]
فراہم کرنے کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے ہوئے ہیں وہ کسی دوسری جگہ کی [illegible]
سب باشندوں کو روزگار اور روزگاری سے محروم افراد کی ضروریات [illegible]
پوری نہیں کر پاتے ہیں۔

مثال کے طور پر جاپان صنعتی دوڑ میں بہت آگے نکل چکا ہے مگر اس سماج میں بھی روٹی روزی کا حق سب کو نہیں ہے۔ امریکہ میں بے روزگاروں کی فوج موجود ہے اور اس کی پوری معیشت ہتھیار بنانے کی صنعت پر کھڑی ہے۔ برطانیہ دوسرے درجے کی طاقت بن چکا ہے اور اس کی معاشیات امریکہ پر منحصر ہے اس کے مقابلے میں سوویت نظام میں لاکھوں خرابیاں ہوں اور وہ اپنے باشندوں کو امریکہ اور برطانیہ کا سا اعلیٰ معیارِ زندگی نہ بھی دے پایا ہو تو بھی یہ ہر ایک کہتا ہے کہ وہاں بھکاریوں اور بے روزگاروں کی فوج نہیں ہے سب کو روٹی روزی حق ہے اور سب کے سر پر مکان کی چھت ہے یا تھی۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبقاتی اور وہ حل نے بہرحال اس مسئلہ کو مکمل طور پر نہ سہی جزوی طور پر حل تو کیا اور اس کی مثالیں مشرقی یورپ کے ممالک ہی سے نہیں چین، کیوبا، ویت نام سے بھی فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ان ممالک سے بھی کم سے کم قحط اور بھوک مری کی خبریں نہیں آتیں۔ کم و بیش یہی صورت حال مشرقی یورپ کے اشتراکی یا نیم اشتراکی ملکوں کی بھی ہے۔

دوسرا پہلو اس مسئلے کا یہ ہے کہ استحصال ہی کا انکار کر دیا جائے کہ دراصل آزادی اسی کا نام ہے کہ معیشت کی اجتماعی اور سماجی نوعیت نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد ہی کھلے بازار اور انفرادی منافع خوری پر ہو۔ یہ صحیح ہے کہ سوویت روس نے جو حصہ معاشیات اور معیشت کی سطح پر کیا، اس میں ذاتی جائیداد اور نجی ملکیت اور دولت جمع کرنے کی آزادی نہیں تھی اور اسے استحصال کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اور اصل سوشلزم کی اصل ہی یہ ہے کہ پیداوار ضرورت کے لیے ہو منافع کے لیے نہ ہو منافع

[illegible] ہے کہ [illegible] میں ہے کہ انسان کی صلاحیتیں ۲
[illegible] ہے کہ [illegible] انسانوں میں ذاتی منافع خوری اور خود غرضی
[illegible] کی جگہ [illegible] انہیں استعمال کر کے [illegible] مشکلوں
کی ایک کا دور ختم [illegible] (OPEN COMPETITION) کا جو نظام قائم کیا تھا اس کے مقابلے
میں سوشلزم اور مارکسزم ایک ایسے انسان کا تصور پیش کر رہے تھے جو ذاتی غرض
سے بلند ہو کر صرف سماجی فلاح اور وسیع تر انسانی بہبودی کے تصور کی بنا پر
محنت کرے اور پوری جان کام کرنے میں لگا دے۔

اگر کمپیوٹر یا مشینیں کم وقت میں اس کے تقاضوں کو پورا کر دیں تو بجائے
فکر میں گھلنے کے مشینیں بہت زیادہ وقت بیکار پڑی ہیں اور کام میں
دلچسپی کی وجہ سے اس کا زیادہ حصہ ہے وہ آرام کرے اور عام انسانوں کو اور اپنے
ہمنوں کو اعلیٰ ترقی معاشی سرگرمیوں میں شریک ہونے کا وقت اور حوصلہ دے
خلاقیت کو دن [illegible] بہتر زندگی کے لیے تحقیق اور فکری مشغلے۔ اس لیے مارکس
نے اس دور کا خواب دیکھا تھا جب ذہنی اور جسمانی محنت یکساں ہو جائیں گی اور
محنت کش طبقہ مشینوں کی مدد سے اتنی کم مدت میں کام کر کے ضروریات پوری کر کے
جو اتنی کم مدت میں فکری سطح پر کام کرنے والے کرتے ہیں۔

اب سوال یہی ہے کہ ضرورت سے ہماری کیا مراد ہے؟ بے شک ضرورت سے
مراد ہے متعلقہ علاقے اور ملک کے لوگوں کی ضرورت کا سامان۔ بلاشبہ اس سے یہ
بھی مراد ہے کہ اس سامان میں تنوع بھی ہو اور مقداری کے لحاظ سے ذہنی معیار
کے اعتبار سے یہ سامان بہتر ہو اور سب لوگوں تک پہنچے۔ لیکن جب آپ سب لوگوں
تک پہنچانے کی بات کرتے ہیں تو اس سامان میں کسی قدر یکسانیت لانی ضروری
ہے اور اس کا معیار بھی اتنا بلند نہیں ہو سکتا جتنا مارکیٹ کے منافع کے لیے پیدا
ہونے والے سامان کا ہو سکتا ہے لیکن یہ محض عارضی صورتیں ہیں۔ معاشرے کا معیار
[illegible] تو معیار بھی بلند ہوگا۔

[illegible] ضرورت کا [illegible] کم سے کم [illegible]
[illegible] ہے کہ [illegible] جہاں [illegible] ادبی [illegible] اشتراکی [illegible]
[illegible] حکومتوں کے بیچ [illegible] کی خوبیوں [illegible] خیال [illegible]
تسلیم ہے [illegible] انقلاب [illegible] تعلیم بھی درست ہے کہ [illegible]
ملک بھر انقلاب جیسی طرز [illegible] سکتا مگر اس کے باوجود [illegible] ممالک میں [illegible]
انقلابی تحریکیں اور آزادی اور سوشلزم کے لیے جہاد کسی فیصلہ کن موڑ پر [illegible]
ہیں اشتراکی حکومتوں کو اپنا فرض ادا کرنا ہو گا اور اشتراکی سماج کے شہری کو ملکی
یا محدود خود غرضانہ تصور ملکیت کے بجائے عالمی انقلاب کے اسی تصور سے زیادہ اور بیشتر
پیداوار کے لیے حوصلہ ملنا چاہیے۔

اس منزل میں مشین منافع خوری سے وسیلے کی حیثیت سے احساس مروت کو کچلنے والے آلے کی شکل اختیار نہیں کرتی جسے قرار دیا جس کی نفی اقبال کے لفظوں میں اس طرح لازم آئے کہ ع

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بلکہ وسیع تر ..... ضروریات کے تقاضے کے مطابق انسان کی محنت کو بچانے والی اور اسے آسودگی سے زیادہ وقت اور آرام دینے والی چیز بن جاتی ہے اور انسان ایک سائنٹفک فکر دشمن اور فکر دشمن (ANTI RATIONAL) اور منطق دشمن رد یا اختیار کرنے کے بجائے سائنس، فکر اور منطق سے قریب تر ہوتا ہے اور قنوطیت اور بے بسی اور سپردگی، بجائے امید، حوصلے اور اعتماد حاصل کرتا ہے یہی اس نئے انسان کا تصور ہیں جو سوشلزم کا مقصود ہے۔

مسئلے کا تیسرا پہلو ہے کہ استحصال کو ختم کرنے والی اس جمہوریت کا طریق کار کیا ہو۔ ظاہر ہے مارکسزم نے اس کا طریق کار طبقاتی آویزش قرار دیا ہے اور اسے فکری اور سائنسی ثبوت بھی دے چکے ہیں پرانے معاشروں کی تبدیلیوں سے [illegible] کرنے اور بھاپ بن جانے سے فراہم کیا ہے ملاحظہ ہو TEXT BOOK OF MARXISM (MOSCOW)

یوں طبقاتی جھگڑا صرف انقلاب سے قبل والی صورت حال ہی میں نہیں ہوتا اس عبوری صورت حال میں بھی موجود رہتا ہے تاوقتیکہ استحصال کرنے والے طبقے کا وجود ختم نہ ہو جائے اور جب طبقے ختم ہو جائیں یا ان کی استحصالی نوعیت ختم ہو جائے تو اینگلز کے لفظوں میں ایک ایسا دور شروع ہوگا جب دنیا کو حکومت کی فوجوں کو اور پولیس وغیرہ کے نظام جبر کی ضرورت نہ رہے گی اور یہ چیزیں آثار قدیمہ میں شمار ہو کر عجائب خانوں میں سجادی جائیں گی اور یہی منزل کمیونزم کی منزل ہے

جہاں تک طبقاتی آویزش کے طریق کار کا سوال ہے اتنی بات واضح ہے کہ اس کی رہبری ان طبقوں کے ہاتھوں میں ہونی لازمی ہے جن کا استحصال کیا جا رہا ہے اور جن کے لیے فوری طور پر سماجی تبدیلی، زندگی اور موت کا سوال بنی ہوئی ہے ظاہر ہے کہ ان طبقوں میں مزدور، کسان اور محنت کش سب سے آگے آگے ہیں اور چونکہ اس قسم کی جدوجہد میں صرف ضرورت کا احساس ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ نظریاتی شعور اور مجاہدانہ ڈسپلن بھی ضروری ہوتا ہے اس لیے اشتراکی جماعتیں اور کمیونسٹ پارٹیاں بنیں اور انھیں محنت کشوں کے طبقوں میں یہ انقلابی شعور پھیلانے، ان میں سماجی تبدیلی اور انصاف طلبی کے احساسات جگانے اور ایک اصول اور نظریے کے مطابق جدوجہد کا حوصلہ پیدا کرنے اور اس کی رہبری کرنے کا کام سنبھالنا پڑا اور اس طرح کمیونسٹ پارٹیوں کو پوری طبقاتی جدوجہد کی لڑائی میں سربراہ کا منصب حاصل ہو گیا۔

یہ طے ہے کہ جن ممالک میں بھی آج تک کمیونسٹ انقلاب آیا ہے ان میں سے ہر ملک میں انقلاب کا راستہ مختلف رہا ہے اور کوئی دو ملک ایسے نہیں ہیں جہاں بالکل ایک ہی انداز سے انقلاب آیا ہو۔ روس میں مزدوروں نے انقلاب کی رہبری کی اور ہر علاقے میں سوویت بنا کر انقلاب سے پہلے ہی اپنی متبادل حکومت بنا لی۔ چین میں کسانوں نے رہبری کی اور سرخ فوج کی شکل میں انقلابی تحریک کو مجاہدانہ رخ دے دیا، کیوبا میں ان دونوں سے مختلف صورت پیش آئی، مشرقی

یورپ کے ممالک میں ہٹلر کے فاشسٹ قبضے کے خلاف دوسری جنگ عظیم کے دوران آزادی کی جدوجہد کے جلو میں اشتراکی انقلاب آیا سوویت نام میں اس کی شکل سامراجی جارحیت کی مخالف تحریک کی ہو گئی۔ غرض جتنے ملک اتنے ہی راستے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس راہ میں کئی مجاہدانہ تحریکیں کامیاب نہیں ہوئیں اور زمین خون سے لالہ زار ہو گئی۔ ایران میں تودہ پارٹی، انڈونیشیا اور چلی میں تمام جمہوریت پسندوں کا قتل عام اور خود اسپین میں دوسری جنگ عظیم سے قبل کی صورت حال اس کی صرف چند مثالیں ہیں۔

جس طرح انقلاب کے دوران طبقاتی کشمکش مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور کسی مخصوص نصاب کی پابند نہیں ہوتی اسی طرح انقلاب کے بعد بھی ہر ملک کی روداد مختلف ہوتی ہے اور یہ روداد صرف کامیابیوں ہی کی نہیں ہوتی ناکامیوں کی بھی ہوتی ہے کہیں کمیونسٹ پارٹیاں اپنا حوصلہ اور عالمی انقلاب کے لیے اپنا جوش کھو بیٹھتی ہیں اور اس کے کارکن اور رہبر نوکر شاہی کی نذر ہو جاتی ہیں کہیں سمجھوتہ بازی میں پھنس جاتے ہیں کہیں نظریاتی غلطیوں اور عملی فروگزاشتوں کا بھی شکار ہوتے ہیں (مثالیں چین کے تہذیبی انقلاب کی دستاویزوں میں اور اس کے بعد خود تہذیبی انقلاب کی تنقید میں ملیں گی) یہ بات البتہ افسوسناک ہے کہ کمیونسٹ پارٹیاں ٹب کے پانی کے ساتھ ساتھ بچے کو بھی پھینکتی آئی ہیں جس کا کوئی جواز نہیں ہے سیاست اور فکر دونوں میں ——— موڑ پھیر آتے ہیں ہر موڑ پھیر کے ساتھ کچھ افراد (یا گروہوں) کے نام جڑ جاتے ہیں اب اگر وہ غلط اور گمراہ کن بھی ہوں تو ان کی تاریخی حیثیت کا انکار تو ممکن نہیں ہوتا دوسرے خود مارکسی فلسفۂ فکر کے مطابق کوئی نظریہ محض کسی ایک فرد واحد کی ذہنی اُپج نہیں ہوتا اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی عصری بلکہ طبقہ، احساس اور فکر کا عنصر کارفرما رہتا ہے لیکن روز اول سے مارکسی فکر اس کی نفی کرتی آئی ہے۔

استالن نے اقتدار پایا تو اپنے سبھی حریفوں کو غدار قرار دے کر انھیں مروا دیے

معتقدات کا گرویدہ تھا ان میں ٹراٹسکی جیسا اہم رہنما بھی تھا بے شک اس کے خیالات کی سخت تنقید کی جاتی ..... اس طرح اس کا خاتمہ ہرگز ضروری نہیں تھا۔ اسٹالن کے بعد آنے والوں نے اسٹالن کے ساتھ وہی سلوک کیا حد یہ ہوئی کہ بچارے کی ہڈیوں تک کو مقبرے سے نکال کر دوسری جگہ دفن کیا گیا اور ہر قسم کے گناہوں، گمراہیوں اور کمزوریوں کی ذمہ داری اسٹالن پر ڈال دی۔ اس اسٹالن پر جس نے لینن کی وفات سے لے کر خود اپنی وفات تک سوویت روس کے اشتراکی سماج کی سربراہی کی تھی دوسری جنگ عظیم جیتی تھی اور سوویت روس کو ایک پس ماندہ زرعی ملک کی سطح سے اوپر اٹھا کر دنیا کے دو اعلیٰ ترین ملکوں کے درجے تک پہنچایا تھا۔

اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اسٹالن کے بعد بر آنے والا اپنے سے پہلے حکمراں اور سربراہ کو سوویت یونین اور اشتراکی دنیا کی تاریخ ہی سے خارج کرنے پر تُلا ہوا ہے انتہا یہ ہوئی ہے کہ اسٹالن کے زمانے کی لکھی ہوئی سوویت کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ واپس لے لی گئی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ سوویٹ یونین کی کوئی مستند اور معروضی تاریخ ہی مرتب نہ ہو پائے گی آج تو خرشچیف سے لے کر برزنیف تک سبھی پر سوالیہ نشان لگایا جا رہا ہے اور جیسے ہر مذہبی رہنما کی سوانح لکھتے وقت یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ان کے نزول سے پہلے پوری دنیا گمراہی اور جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کھوئی ہوئی تھی اسی طرح ہر نئے اشتراکی سربراہ کے کارناموں کی داستان لکھتے وقت دیکھنے میں آرہا ہے لطف یہ ہے کہ صرف روس ہی میں نہیں چین میں بھی یہی حال ہے ماؤزے تنگ اور چو این لائی کی 'تکفیر' آخر کیا ضرور ہے؟

آئیے اب ہم مسئلے کے چوتھے پہلو پر غور کریں۔ یعنی کیا واقعی مارکسزم بحیثیت ایک نظام فکر کے ضروری ہے؟ اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے بڑے حصے میں استحصالی نظام قائم ہے۔ آدھی دنیا بھوکی ہے، ننگی ہے، جہالت اور بیماری کا شکار ہے اور خود بورژوا ترقی یافتہ ملکوں کے معاشرے، بیروزگاری سے آزاد نہیں ہیں

پس ماندہ ملکوں کی لوٹ میں شریک ہیں یا انھیں بڑا کر منافع کماتے ہیں اور ان کی نام نہاد آسودہ حال معاشرے بھی اعصابی تشنج، توہم پرستی، قنوطیت اور اسپیکسلائز نشہ پرستی اور جنس زندگی کی انحطاطی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس غربت، جہالت، بیماری اور بھوک کو کس طرح ختم کیا جائے سرمایہ داری نظریہ اسے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے اس کا ثبوت امریکہ میں بیروزگاروں کی تعداد سے فراہم ہوتا ہے مزید ثبوت چاہیے تو اس نظام میں آنے والی تیزی اور مندی کے چکر کافی ہیں جنھیں ماہرین اقتصادیات الارم اور RECESSION کے ناموں سے یاد کرتے ہیں دوسری طرف روس، چین اور کیوبا کم سے کم یہ تو دکھا ہی چکے ہیں کہ وہاں بیروزگاری نہیں رہی (بے شک روس پر آپ سائبیریا کے CONCENTRATION CAMP کا الزام لگائیں، اسٹالن پر قتل عام کی فرد جرم نافذ کر دیں) مگر چین میں کوئی سائبیریا نہیں اور کیوبا میں بھی اس قسم کے قید خانوں کا ابھی تک کسی نے ذکر نہیں کیا۔ ہنگری، پولینڈ، رومانیہ اور چیکوسلواکیہ میں حرکے ذکر تو ہوئے مگر بڑے پیمانے پر کیمپوں کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی صورت ہے پس ماندہ ملکوں کے لوگوں کی نجات کی تو وہ یہی ہے جسے مارکسزم نے طبقاتی کشمکش کہا ہے اب اس طبقاتی کشمکش کی صورت کیا ہوگی اور اس کی رہنمائی میں محنت کش طبقوں اور ان کی پارٹی کا کیا مقام اور کیا درجہ ہوگا؟ یہ سوال وقت کے ساتھ نئی نوعیت اختیار کرتا رہے گا اور اس میں برابر اضافے اور ترمیم کی گنجائش رہے گی۔ بے شک سوشلزم کمیونزم سے جدا ہے اور جب کروڑوں انسانوں کو انتہائی غربت کی سطح سے کم سے کم وقت میں اوپر اٹھانے گا کہ طرز زیست کے اعلیٰ معیار میں کمی آئے گی۔ سب کو ضرورت کی چیزیں تو مل جائیں گی مگر کم کم ملیں گی اور اعلیٰ درجے کی نہیں ملیں گی اور کنزیومرزم کے مطابق نہیں ملیں گی۔ اب آپ اسے جبر کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ یہ جبر عیش پسندی پر ہے، یہ جبر سماجی ضرورت پہ ہے، یہ جبر ذاتی ملکیت پر ہے، ذخیرہ اندوزی پر ہے جائیداد

کے بجائے دولت کی نمائش کرنے پر ہے۔ نفع خوری اور منافع بازی پر ہے۔
حالیہ بحران سے جو باتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن لوگوں نے یہ
نظام نافذ کیا ان میں خود منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، ذاتی ملکیت اور طاقتؔ
پوجا کا رجحان پیدا ہو گیا اور پارٹی کے اندر خود ایک حکمرانوں کا طبقہ پیدا ہو گیا اور اس
نے افسرشاہی کے رویے اپنا لیے یہاں اس پر غور کیا جانا چاہیے کہ اس خطرناک
بیماری کو دور کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے اور ایسے کون سے ضوابط ہیں جن کی
بنیاد پر افسرشاہی پنپنے سے روکا جا سکتا ہے یہ سوال معمولی نہیں ہے نہایت اہم ہے
کیونکہ اسی سے جڑا ہوا معاملہ ہے بہتر انسان کی نشوونما کا۔ کیا ذاتی ملکیت اور ذاتی
اقتدار انسانی جبلت ہے یا محض حالات کی پروردہ ہے اور اسے حالات کے بدل
دینے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ معاشرے ہی میں نہیں پارٹی میں بھی جمہوریت
کا زیادہ عمل دخل ہو اور کسی شخص یا گروہ کی بڑھتی ہوئی طاقت یا اقتدار پرستی پر
نظر رکھی جائے مختلف الخیال گروہ ہوں اور افراد کو زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں یعنی
محنت کشوں میں انفرادی زرطلبی اور ملکیت پرستی کے رجحان کو دور کرنے کے طریقے
اختیار کیے جائیں۔

ان چار پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد سوال ہے ادب پر ان تصورات کے اثرات
کا۔ ترقی پسند ادب کی اصطلاح اردو میں رائج ہوئی مگر مارکسزم کے اثرات نے
پوری دنیا کے ادب کو متاثر کیا اور مختلف طریقوں سے اپنا اثر جمایا۔ ان اثرات کی
نوعیت آج کیا ہے؟

مارکسزم نے فلسفیانہ سطح پر چار تصورات پیش کیے ہیں۔ ایک اقدار کے اضافی
ہونے کا سوال یعنی ہر چیز اور ہر تصور زمان و مکان کا تابع ہے اور قدر مطلق کا کوئی
وجود نہیں دوسرے اقدار اور زندگی کے ہر وقت تغیر پذیر ہونے کا تصور یعنی ادب

ہو یا فلسفہ، فزکس ہو یا کوئی مادی وجود، وہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے ارتقائی شکل
حالت میں رہتا ہے اس لیے زندگی کا کوئی موڑ محض نقطہ نہیں ہے سلسلے کا ہیولا
ایک عمل ہے اور اسی کے پس منظر میں ہر نقطہ کو سمجھا جانا چاہیے۔ تیسرا تصور جدلیت کا
ہے یعنی ہر شے اپنے اندر ٹکرانے والے دو اجزائی آویزش سے بڑھتی ہے اور چوتھا
تصور خیال اور مادے یعنی ادب اور زندگی کے ایک دوسرے اثر انداز ہونے کا
یعنی مادہ خیال کو بدلتا ہے اور خیال مادے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

غور کیجیے تو یہی تھے جنھوں نے عالمی ادب میں مارکسی اثرات کو رائج کیا۔

جب کوئی قدر مطلق نہیں ہے تو انقلابی ادب یا ترقی پسند ادب کا تصور بھی
مطلق نہیں ہو سکتا جب ہر تصور تغیر پذیر ہے تو یہ تصور بھی ضرور تغیر پذیر ہوگا جب
ہر شے میں جدلیت کارفرما ہے تو ترقی پسند ادب میں بھی یہ جدلیت موجود ہوگی
اور جب ہر تصور زندگی یا ماحول سے ابھرتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے تو
ترقی پسند ادب بھی حالات سے پیدا بھی ہوگا اور ان پر اثر انداز بھی ہوگا دونوں
قسم کا رشتہ رکھے گا اثر پذیری کا بھی اور اثر اندازی کا بھی۔

یہ باتیں مان لی جائیں تو سیدھا صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پرانے زمانوں
کو چھوڑیے آج کے زمانے میں بھی کم سے کم تین قسم کے معاشروں کے ادبیات میں
ترقی پسندی کی جن مختلف (متضاد نہیں) شکلیں ہوں گی۔ ایک اس معاشرے
میں انقلاب کے لیے کوشاں ہے یا اس کا منتظر ہے وہاں ایسا تمام ادب ترقی
پسند ہوگا جو کسی نہ کسی شکل میں سماجی تبدیلی کے لیے ذہنوں کو تیار کرتا ہے
یہ شک وہ اس تبدیلی کی سمت اور شکل واضح نہیں کرپاتا مگر محض کی طرف توجہ
دلاتا ہے اور انقلاب کی جذباتی اور جمالیاتی فضا تیار کرتا ہے۔ سے قبل انقلابی
کہا جا سکتا ہے اس قسم کے ادب کے اندر بھی جدلیت کی موجودگی ناگزیر ہے
یعنی اس میں ایسے عناصر بھی ہوں گے جو دقیانوسیت پرست اور رجعت پسند
ہوں (اور ممکن ہے مصنف کا رویہ ان عناصر کی طرف ہمدردانہ بھی ہو) اور ایسے

تکمری ہوں گے جو سماجی تبدیلی کی خواہش پیدا کرتے ہوں اور صحت مند تبدیلی
لا رجحان پیدا کرتے ہوں (مثالیں لینن کے ٹالسٹائے پر مضمون اور مارکس کے
پرالسد پر مضمون سے فراہم کی جاسکتی ہیں) دوسرا اس دور کا ادب ہوگا جس میں
انقلاب ہو رہا ہو اس وقت کا ادب یقیناً خندق کے اس پار یا اس پار کا ادب
ہوگا۔ اس دور کے ادب کا لہجہ زیادہ تر ہنگامی اور خطابیہ ہونا لازم ہے اور اس
دوام سے دشتہ، ان انقلابی لمحوں کے دوام سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ
مصنف کے اپنی عصری وابستگیوں اور گہرے جذباتی شرکت سے بھی اس
م کے ادب کے جمالیاتی پہلو کا تعین ہوگا۔ تیسرا ادب اس دور کا ہوگا جب
انقلاب ہو چکا ہو۔ ایسے معاشرے کے ادب میں دو قسم کی تقسیمیں واضح ہوتی
ہیں گی۔ ایک ان طبقوں کا ادب جو ابھی خواندگی اور تہذیب سے روشناس
رہے ہیں دوسرے اس طبقے کا ادب حسن کی وراثت اور روایت کا رستہ پرا۔
بعد انقلاب دور کے ادب کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شخص،
ٹی یا ادارہ ادب کا تجزیہ تو کر سکتے ہیں مگر ادب پیدا کرنے کا کوئی نسخہ نہیں بتا
سکتے یا کوئی ایسا فارمولا ایجاد یا متعین نہیں کر سکتے جو اچھے ادب کی تخلیق کی
ضمانت دے سکے اسی طرح کوئی ادب کسی ایک قسم کے لہجے یا اسلوب کا پابند نہیں
جا سکتا (اور اسی لیے محض ہنگامی یا خطابیہ لہجے کو اس دور یا کسی اور دور کے
ترقی پسند ادب کی پہچان قرار نہیں دیا جا سکتا۔)

ان باتوں کو اگر مان لیا جائے تو پھر مختلف ادوار کے ادب کے بارے میں
اس قسم کے نتیجے نکلتے ہیں۔

پہلے دور کے ادب میں (یعنی قبل انقلاب کے ادب میں) دقیانوسی
رجعت پسند عناصر اور ترقی پسند عناصر کو الگ الگ کرنا ہوگا اور یہی اس کی
جدلیاتی نوعیت ہوگی۔ یہ صورت حال اقبال وغیرہ کے ہاں پیش آتی ہے
یا تو جوش بیان میں ان کے صرف ترقی پسند پہلو پر زور دے کر انہیں اعلان

اور اشتراکی شاعر تک کہہ دیا جاتا ہے یا پھر دوسرے حصے پر زور دیا جاتا ہے
اور انہیں فاشسٹ اور رجعت پسند قرار دیا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے دور کے ادب یعنی انقلابی ادب کا جواز تو انقلابی صورتوں کے
دوران ہی پیدا ہوتا ہے ان صورتوں کے بغیر جو "انقلابی" ادب پیدا ہوتا ہے
وہ چونکہ غیر حقیقی ہوتا ہے لہٰذا اس پر رجائی یا ہنگامی ادب کا الزام عائد ہوگا
اور ان میں سے بیشتر حصہ نعرے بازی پر مشتمل ہوگا۔

۳۔ تیسرے دور کے ادب یعنی بعد انقلاب ادب میں جان آئے گی۔ ادب کی اپنی
ذہنی اور جمالیاتی وابستگیوں سے جن کی مدد سے وہ صرف اپنے دور کی ترقیوں
کا ذکر نہیں کرے گا بلکہ ان کی ناتمامیوں کا بھی ذکر کرے گا۔

خلاصہ بحث کا یہ ہے کہ ادب پر فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے
کہ سوشلسٹ ریجیم کا کوئی سکہ بند تصور وضع نہیں کیا جا سکتا اور ترقی پسند ادب
کی پہچان (۱) نہ تو محض اس کے موضوع کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔
(۲) نہ محض اس کے خطیبانہ لہجے یا تبلیغی انداز پر کی جا سکتی ہے بلکہ اس کے عمومی
نقطہ نظر کی بنیاد پر کی جانی چاہیے شاعر اور ادیب ہمیں معاشرے کا کوئی صالح اور
بہتر تصور دیتا ہے اور آرٹ کے ذریعے جمالیاتی ہم آہنگیاں (فن کار اور
جمہور، فرد اور معاشرے کے درمیان) پیدا کرتا ہے تو یہی ترقی پسندی ہے جسے
دوسرے لفظوں میں روشن خیالی کہا جا سکتا ہے اسی طرح محض لہجے کا خطیبانہ یا
تبلیغی ہونا ضروری نہیں یہاں تو کاج اور ہیئت کی کشش کی طرف توجہ
بھی ضروری ہے جسے بعد کے مارکسی مصنفین مثلاً ارنسٹ فشر نے اور آگے بڑھایا کہ
آرٹ مکمل اور مربوط اکائی کے طور پر زندگی کو پیش نہیں کرتا کہ یہ ایسا تصور
ہے جو مقدرات اور ناقابل تغیر دنیا کا حصہ قرار دیتا ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت کے طور
پر پیش کرتا ہے جسے مخاطبین بدل بھی سکتے ہیں اور اس کو خود اپنے تئیں نئے معنی
اور نئی معنویتیں دے سکتے ہیں۔ یہی بات التھیوسر سے لے کر رولاں بارتھ تک

وسیم محمد حسین تک کی تنقیدی تحریروں میں STRUCTURALISM اور POST STRUCTURALISM بن کر سامنے آئی۔ ان نظریات سے بحث کرنا اس وقت مقصود نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے ادب میں بھی مارکسی نظریات کے انطباق کی اب کوئی ایک سکہ بند صورت نہیں ہے اور اسے محض خطیبانہ انداز اور ہنگامی موضوعات تک محدود نہیں رکھا جا سکتا اور ۱۹۳۳ء سے آج تک اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر جو سہل پسند فیصلے کیے گئے ہیں ان کا پھر سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ آج ترقی پسند ادب کے صرف دو معنی ہیں ایک ایسا ادب جس میں ماضی کی طرف واپسی، دقیانوسیت، تقدیر پرستی، توہم پرستی اور فرقہ پرستی کے بجائے تعقل اور روشن خیالی ہو، دوسرے ایسا ادب جو استحصال کے خلاف اور سماجی انصاف کے حق میں آواز بلند کرتا ہو۔ اور یہ تعریف آج بھی باسی نہیں ہوئی ہے۔

ایک بار پھر ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ آخر ایسا کیا ہوا کہ عالمی سطح پر اشتراکی نظام بحران کا شکار ہوا۔ اس کو عام طور پر دو توجیہیں پیش کی جاتی ہیں اور دونوں اپنی جگہ کسی حد تک درست ہیں ایک یہ کہ سرمایہ دار حکومتوں نے اشتراکی نظام کے خلاف سازش بُنی اور رفتہ رفتہ اپنے جاسوسوں اور کارپردازوں کے ذریعے اشتراکی حکومتوں کو قبضے میں کر لیا یہاں تک کہ بعض احباب تو خروشچیف اور گورباچوف کو انہی طاقتوں کا جاسوس قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان حکومتوں میں پارٹی چلانے والے لوگ منافع خوری، افسر شاہی اور کرپشن کا شکار ہو گئے جب تک پولینڈ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ کی پوری اقتصادی صورت حال سامنے نہ ہو کچھ نتیجہ نکالنا مشکل ہے مگر اس پر غور کرنا ضروری ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔

خروشچیف نے اسٹالن کو برا بھلا کہنا شروع کیا (جو شاید ضروری تھا) اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک نیا نعرہ بقائے باہم کا بھی دیا یعنی عالمی انقلاب کو رد کرکے صرف ایک پُرامن مقابلے کو اپنا لیا جو سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کے درمیان ان کے خیال کے مطابق جاری رہے گا اور وقت خود اشتراکی نظام کی برتری ثابت کردے گا لازمی بات ہے کہ اشتراکی نظام کے ملکوں کے پاس سرمایہ دارانہ ملکوں کی طرح نہ تو بیرونی ملکوں سے تجارت کے ذریعے استحصال کے وسیلے تھے اور دہتیار ڈھالنے اور ہتھیاروں کی تجارت کے ذریعے تھے اور مارشل پلان کی آسانیاں اور قرضوں کا نظام تھا اور نہ وہ پس ماندہ ملکوں کی لوٹ مار سے اپنے خزانے بھر سکتے تھے اس کے علاوہ ان کو اپنے ہر فرد کو یکساں مواقع اور یکساں آسانیاں بھی فراہم کرنی تھیں یعنی اپنے ہاں کے مرفہ الحال طبقے کا پیٹ کاٹ کر بھوکے ننگے طبقوں کو ان کی سطح تک لانا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی اقتصادیات پر مزید بوجھ تھا اور اس وجہ سے اب تک جن طبقوں نے فائدہ اور تجربہ حاصل کیا ہے وہ طبقے ان حکومتوں کے خلاف تھے اکثر ان کے خلاف سازشوں میں بھی مبتلا تھا کیونکہ ان سے ذاتی ملکیت اور ذخیرہ اندوزی کا اختیار چھین لیا گیا تھا تیسرے پورے سوشلسٹ نظام کو سرمایہ دار ملکوں کے بیرونی خطروں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی دفاعی طاقت پر بہت زیادہ خرچ کرنا پڑ رہا تھا جو ان پر مزید اقتصادی بوجھ بن گیا تھا۔

جب پُرامن بقائے باہم کی باتیں ہونے لگیں تو عالمی انقلاب کی خاطر قربانیاں دینے اور پیٹ پر پتھر باندھنے کا جوش بھی روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں کم ہونے لگا شاید یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ خروشچیف کے زمانے میں سوویت روس نے امریکہ کی دھمکی میں آکر کیوبا سے اپنے میزائیل ہٹا لیے تھے اور کیوبا کو امریکہ کے رحم و کرم پر یکہ و تنہا چھوڑ دیا تھا یہ بھی یاد رہے کہ ویتنام کی مدد بھی سوویت روس نے بہت بعد میں شروع کی ہے۔ اس کے علاوہ

ماؤزے تنگ سے اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ماؤ سرمایہ داروں سے جنگ کو اہمیت دے رہے تھے اور سرمایہ دار طاقتوں کو کاغذی شیر کہتے تھے جبکہ خروشچیف پرامن بقائے باہم کی بات کر رہے تھے اور ایٹمی خطرات کے پیش نظر مسلح انقلاب ہی کو عالمی وجود کے لیے خطرہ قرار دے رہے تھے۔

عالمی انقلاب کے تصور سے نظر ہٹی تو ان سبھی ملکوں کے نوجوانوں کا خیال خود اپنی زندگی میں حاصل مراعات اور سہولتوں کی طرف جانے لگا ادھر سرمایہ دار نظام کی کھس پیٹھ بھی جاری تھی ان اشتراکی ملکوں میں رہنے والے لوگ نائٹ کلب اور ہیروئن اور ڈرگ نہ سہی تو کم سے کم جین کی خواہش کرنے لگے۔ کام چلاؤ روز مرہ زندگی کے سامان کے بجائے بہتر قسم اور زیادہ قیمتی چیزوں کی طلب ہونے لگی اور اس نا آسودگی کو مغرب زدگی نے ہوا دی اس بدبختی نے مختلف کارخانوں کے سربراہوں کو بھی متاثر کیا اور پارٹی کے کارپردازوں میں بھی یہ ذہنیت پھیلنے لگی اور آخر کار پورا نظام ناکام ہوگا اور ذاتی ملکیت اور "آزاد" مارکیٹ (یعنی استحصال پر مبنی کاروبار اور کنزیومرزم کے لیے ہوا و بڑھنے لگا۔

اشتراکی نظام نہ تو دہشت پسندی یا " " " سے قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے آمریت سے قائم رکھا جاسکتا ہے۔ مارکس کا دعویٰ ہے کہ وہ استحصال ہونے والوں کی عظیم اکثریت کی حکومت ہے قلیل مگر نہایت طاقتور استحصالی اقلیت پر۔ اس لیے یہ صرف اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب کسی ملک کی دبی کچلی مخلوق کی اکثریت اس کی متمنی ہو، اس کے لیے کام کرے اور اس کے لیے قربانیاں دے۔ یہ صرف انہی صورتوں میں قائم رہ بھی سکتی ہے کم سے اس وقت یہی صورت رہے گی جب تک پوری دنیا میں اشتراکی نظام قائم نہیں ہوجاتے، بعد کے حالات مختلف ہوسکتے ہیں۔

اس وقت ساری دنیا کے روشن خیال خواتین و حضرات کے سامنے جو بنیادی سوالات ہیں وہ یہ ہیں:۔

کیا اشتراکی نظام کامیاب ہو چکا ہے؟
اس کی ناکامی کا فیصلہ اگر ان باتوں کو سامنے رکھ کر کریں کہ:
(۱) کیا وہ ایشیا کے غریب ترین اور مفلس ترین لوگوں کو روٹی روزی اور بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کر سکا یا نہیں؟
اس کا جواب یہ ہے کہ مفلسی اور بے روزگاری ان سبھی اشتراکی ملکوں سے معدوم ختم ہو گئی لیکن وہ اپنے عام باشندوں کو اعلیٰ قسم مصنوعات اور اعلیٰ طرز زندگی فراہم نہیں کر سکا۔
(۲) کیا وہ اپنے علاقے کے رہنے والوں کو مریضانہ رجحانات سے محفوظ رکھ سکا یعنی ان میں امیگ، ہیروئن اور اس قسم کی دوسری بیماریاں، ٹائٹ کلب، عصمت فروشی، چور بازاری، مافیا وغیرہ کا رواج روک سکا یا نہیں؟
اس کا جواب یہ ہے کہ ان علاقوں میں اشتراکی نظام نے یہ بیماریاں عام نہیں ہونے دیں اور تہذیبی طور پر یہ معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرے سے بہتر ہے۔
(۳) کیا وہ اپنے علاقے کے رہنے والوں کو آزادی، سلامتی اور مساوات دے سکا یا نہیں؟
اس کا جواب یہ ہے کہ گو مکمل طور پر اس نظام کو اس کام میں کامیابی نہیں ہوئی بڑی حد تک اس نے مساوات تو دے دی مگر آزادی کے سلسلے میں انفرادی آزادی اور سلامتی کے سلسلے میں مکمل سلامتی کا احساس دینے میں اسے جزوی کامیابی بھی نہیں ملی اب یہ اپنے طور پر طے کرنے کی بات ہے کہ اس کی جزوی کامیابی یا ناکامی کا سبب خود نظام کے اندر کی کوئی خرابی ہے یا اس پر عملدرآمد کرانے والوں میں کسی قسم کی کج فہمی ہے۔
(۴) کیا نسلی، مذہبی، لسانی اور علاقائی جھگڑوں کو حل کرنے میں کامیاب رہا یا نہیں۔
اس کا جواب ان نسلی، تہذیبی، علاقائی اور لسانی مسائل کے

پڑنے سے ہوتا ہے جن کا کوئی وجود پچھلے ۳۰ برس سے نہیں تھا ان میں بعض جائز اور منصفانہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۳۰ برس تک یہ سب جھگڑے محض حکومت کے ڈر سے تو دبے نہیں رہے ہوں گے ان میں کوئی نہ کوئی پیش رفت بھی ضرور ہوتی ہوگی۔

۲۔ اگر اشتراکی نظام ناکام ہو چکا ہے تو کیا کوئی اور ایسا نظام ہے جو اس کی جگہ لے سکے اور معاشرے کے دبے کچلے ہوؤں کو استحصال سے نجات دلا سکے؟

اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس وقت تک دنیا میں اشتراکی نظام کے علاوہ جو نظام رائج ہے وہ یا تو اعلیٰ درجے کا سرمایہ دارانہ صنعتی نظام ہے جس کی بنیاد مشین بلا پیداوار پر ہے آزاد مارکیٹ کے اندھے تقاضوں پر ہے اور جو ١١١١ ١٨١ ١١١١ کے اصول کے مطابق سماجی بہبود دی کے ذریعے پیدا کرتا ہے۔ اس نظام کی کارفرمائی امریکہ میں اعلیٰ ترین شکل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور باوجود اس کی تمام چکا چوند کرنے والی کامیابیوں کے امریکی استحصال خود اس کے اپنے ملک ہی میں نہیں پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ بے روزگاروں کی فوج بھی ہے مافیا اور اسمگلنگ کی فراوانی بھی اور بیگر و دشمنی کا طوفان بھی۔ امریکی معاشرہ اپنی دولت و ثروت کے باوجود بیمار معاشرہ ہے اور افراط زر اور ری سے شن کے جنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ یہی نہیں جن جن ممالک نے امریکی نظام پر چلنے کی کامیاب یا ناکام کوشش کی ہے ان کے ہاں بھی کم و بیش یہی صورت ہے پسماندہ ملکوں میں تو سرمایہ دارانہ نظام نے زبردست تباہی مچائی ہے اور وہاں کے اقتصادی، سیاسی، اور تہذیبی (لسانی، علاقائی اور فرقہ واری) مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے ' ' • پوری سطح پر خوشحالی ضرور آئی ہے۔

تا ہے کہ پچھلے ۳۰ برس میں مادی آسودگی کے اعتبار سے شاید رہا ہو مگر اشتراکی نظام نے معیشت اور اخلاقیات کا جو معیار رائج کیا وہ کہیں بہتر تھا۔

اس پوری بحث سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام ہو یا مارکسزم دونوں کا سردست کوئی متبادل نہیں ہے اور انسانی فلاح کی تلاش کے جاں کاہ سفر میں جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے، جو کامیابیاں اور حیرت انگیز کامیابیاں مارکسزم کے اطلاق سے اشتراکی نظام نے حاصل کی ہیں ان کی ضمانت کوئی دوسرا نظام آج تک نہیں دے پایا ہے۔ یہ البتہ ماننا چاہیے کہ مارکسزم کوئی نسخۂ کیمیا یا اسم اعظم نہیں کہ سب سوالوں کا حل اس کے پاس ہو۔ بہت سے سوالات کے جوابات وہ نہیں دے پایا اور کئی مسائل حل نہیں ہو پائے مگر انھیں حل کرنے کے لیے مارکسزم کے اطلاق کی ان کمزوریوں کو دور کرنا ہوگا اس سے روگردانی کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ اسے رد کرنے کے معنی محنت کشوں، زیر دستوں اور دبے کچلے کروڑوں اربوں انسانوں کو مدتوں کے لیے ان کے حقوق ہی سے نہیں ان کے آزادانہ وجود کی امید سے بھی محروم کرنے کے ہوں گے اگر مارکسزم میں کوئی کمی ہے تو اسے پورا کیا جا سکتا ہے اگر اس کی کارکردگی میں کسی رد و قبول کی ضرورت ہے تو اس کا بھی امکان ہے مگر یہ سب باتیں مارکسزم کے تخلیقی استعمال اور اشتراکی نظام کے ۷۰ سالہ تجربات کی روشنی ہی میں کی جا سکتی ہیں انھیں رد کر کے ممکن نہیں۔

مختصر یہ کہ مارکسزم آج بھی ایک زندہ نظریہ یا سائنس ہے جس کا اطلاق ہر قوم، علاقے اور ملک کے لوگوں کو خود اپنی عقل و فہم کے مطابق اور اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر کرنا چاہیے۔ اس کی عالمی امامت نہ موجود ہے نہ ضروری، گو مختلف مارکسی تحریکوں، تنظیموں اور ملکوں کے درمیان دوستانہ رابطے اور ہم آہنگی مفید ہوگی مگر یہ لازم نہیں ہے۔ مارکسزم کے خلاقانہ انطباق ہی میں آج بھی انسانیت کی فلاح ہے بقول جگر

خود اپنے ہی سوز باطنی سے نکال اک شمع غیر فانی
چراغ دیر و حرم تو اے دل جلا کریں گے بجھا کریں گے

سید خورشید عالم

مارکسزم — زندہ یا مُردہ

آفاق گیر شہرت یافتہ تصنیف — "جینئس – ایک ادبی نظریہ" میں مصنف
برٹ کو ری نے مارکس کے بارے میں لکھا ہے کہ مارکسی نظریہ تاریخ کے چیستاں
مکمل جواب ہے اور یہی اس کا حل ہے:

اس حکیمانہ بیاں کو اب ڈیڑھ سو سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے۔ اس
یل مدت میں دنیا کا نقشہ عالمگیر انقلابی تبدیلیوں کی زد میں آیا۔ جغرافیائی
سیاسی اور معاشی تبدیلیاں ہوئیں۔ دنیا کے دو تہائی حصے کو غلامی سے
ات ملی۔

دنیا نے اپنی علمی بصیرت اور بصارت کے مطابق سوشلزم کے روپ اور
ہر روپ سب دیکھ لیے مگر حدبندیات اور طبقاتی تقسیم کے تحت استحصال کا شکار مخلوق
ے مفادات کے تحفظ اور بقا کی اس تحریک پر کوئی حرف نہ آیا۔ ریاستی حکمت
ملی میں پرولتاری آمریت ایک مضبوط آلۂ کار کے طور پر اُبھری۔ پیداواری
رائع نے سرمایہ دارانہ نظام کی شکل اختیار کر لی اور تمام ممالک میں کارٹل کنٹرول
ے باوجود سرمایہ کاری ادارے اور کارخانے سمٹ کر چند مخصوص گروہوں کی
ملکیت بن گئے ہیں جس کے نتیجے میں مختلف ملکوں کے عوام اور محنت کرنے
والے لوگ استحصال اور غربت کے شکار ہوتے گئے۔

ہیانک حیرت ناک ہولناکی کے ساتھ پہلے مشرقی یورپ اور پھر خود اسی ہی

سوشلسٹ ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجنے لگی اور تمام ریاستی ادارے تخت و تاراج ہونے لگے۔ یہ اُمڈتا ہوا طوفان اور بپھرتی ہوئی موجیں جمہوریت اور شخصی آزادی کی آڑ میں ریاستی ڈھانچے کو توڑتی اور سماجی تہوں کو اُکھیڑتی گہرائی تک چلی گئیں۔ آخر اس شکست و ریخت کے پیچھے کون سے خارجی عناصر تھے ؟

اس عرصے میں منظرِ عام پر آنے والا تمام تحریریں اور الیکٹرانک میڈیا میں چند خاص نکات کی طرف متوجہ کرتا ہے :

الف :۔ اسٹالینی عہد میں بلند ہونے والی مخالفانہ آوازوں کو دوسری جنگ عظیم کے بعد مبینہ طور پر "بڑی بے دردی سے" دبایا جانا۔

ب ۔ پرولتاری حاکمیت کی حقیقی توجیحات و معنی کو مسخ کرنا اور تمامتر ریاستی قوت کو صنعتی مالکوں اور بیوروکریٹ منیجروں کے کلی اختیارات میں دیا جانا، جس سے عوام میں سرگشتگی اور بیگانگی کا احساس پیدا ہوا۔

ج ۔ حکمراں گروہ کا فرسودہ اور زنگ آلود ہوجانا اور ان کا عوام کے جذبات و احساسات سے دور ہوجانا۔

آیئے، ادب کے حوالے سے اِس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کریں گے:

اسٹالن کی وفات (۵ مارچ ۵۳ ۱۹ء) کے بعد وہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ خروشچیف نے اقتدارِ اعلیٰ سنبھالنے کے بعد ڈرامائی انداز سے گزرے ہوئے اسٹالینی عہد کی غلطیوں، مظالم اور تمام "غلط کاریوں" کی دھجیاں بکھیرنی شروع کردیں۔

اس واقعے کے بعد ادبی/سیاسی محاذ پر بوکھلاہٹ اور تیز روی کے ساتھ کچھ دوسرے اقدامات کیے گئے۔

دسمبر ۱۹۵۳ء میں سوویت روس کے معروف مدبّروں، شاعروں اور دانشوروں کو اس وقت شدید جھٹکا لگا جب ایک شہرت یافتہ ادیب VLADIMIR POMERANTSEV کا مضمون "ادب میں صداقت" روس کے مشہور ادبی جریدے "نوائے میر" میں اپنا

طویل مضمون شائع کرایا، اور اس مضمون کی شہرت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اپنے موضوعی مقالے میں "پومیرن" نے اسٹالینی عہد کے ادب پر تیکھے انداز سے سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

> "سچائی ہی تنہا وہ حقیقت ہے جس سے تصانیف اور اسٹیج ڈرامے قطعی عاری ہیں ۔ ادیب و شاعر اگر چاہیں تو لازمی طور پر اپنی فن کارانہ تحریروں سے عقلی بازی گری اور دوسرے اُن حربوں کو خارج کر دیں جنھیں وہ تضادات اور مشکل مسائل سے دامن بچاکر نکل جانے کے لیے استعمال کررہے ہیں تو حقیقی تصادم کو اپنے ناولوں میں جگہ دینے کے بعد ایک یا دو برسوں میں صداقت پرمبنی فن منظر عام پر آجائے گا"

یہ طور تبدیلی کی مسلّم نشانی خروشچیف کی اس خفیہ تقریر میں کھل کر سامنے آگئی جو انھوں نے بیسویں کانگریس منعقدہ ۱۹۵۶ء کو کی تھی۔ خروشچیف نے جب پارٹی کے خلاف کیے جانے والے جرائم وضاحت سے بیان کیے تو ملک کے سربرآوردہ عالموں پراجن میں "نوائے میر" کے چیف ایڈیٹر الیگزینڈر ٹارڈوسکی سرفہرست ہیں، بہت ہمدردانہ اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے فوراً بعد ہی اسٹالینی افکار اور حاکمیتِ اعلیٰ کے تصور سے دور ہٹنا شروع ہوا الیگزینڈر اس وقت تک خود بھی نظام حکومت سے بے حد قریب تھے لیکن انھوں نے ابھرتے ہوئے نئے سیاسی مقاصد کو ڈھانپ لیا اور اپنے تمام زندگی کے نظریاتی افکار کی خود تنقید کی۔ خروشچیف نے ۱۹۵۶ء میں جو طرح ڈالی تھی وہ تو حقیقتاً ۱۹۴۸ء ہی میں یوگوسلاویا کے ٹیٹو نے مارکسزم اور لینن ازم کے "نئے قومی تصور" سے شروع ہو چکی تھی اور یہیں سے ماسکو کے ساتھ ان کے اختلافات شروع ہوئے تھے۔

طرفہ تماشا ہے کہ ٹیورڈوسکی کی اپنی تخلیقی نظم (کینٹوز) "فاصلہ در فاصلہ"

میں ہمیں براہ راست اسٹالن کے خلاف خیالات ملتے ہیں اور اسے ادب کے توسط سے لعن طعن کا پہلا بھرپور حملہ قرار دینا مناسب ہے :-

(۱)

THAT WAS A FATHER WHOSE MERE WORD,

THE FAINTEST HINT OF MOVEMENT OF HIS EYEBROWS

BECAME LAW

FULL FIL YOUR HARSH DUTY

AND SAY THAT WHAT IS NOT SO

(SOLZHENITSYN, TVARDOVSKY AND NOVY MIR

P 207)

اور اس سے قبل یہ بھی نظم کیا

(۲)

AND THOSE WHO ACCOMPANIED HIM AT FIRST

THE UNDERGROUND AND PRISON LATER KNEW

AND THEY TOOK POWER AND STRUGGLED

AND DISAPPEARED ONE BY ONE INTO SHADOWS

(P 204)

الیگزینڈر ٹیورڈوسکی نے اعلیٰ سطح کی خود آگاہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ماضی پر یوں نگاہ ڈالی :

(۳)

AND WE (THE YOUTHS OF THE 1930'S) KNEW

DURING DIFFICULTIES OF THE CAMPAIGN,

THAT WE WERE TRUE TO THE CAMPAIGN

THAT WE WERE TRUE TO THE [illegible].

NOT WE ALONE.

BUT THE FLOSNER OF THE PEOPLE

BUT THE HONOUR AND INTELLIGENCE OF THE WHOLE COUNTRY

(P.206)

اس کے باوجود ایگزینشٹر خود اپنی ذات اور اپنی ہم نسل کو اُن جرائم سے مبرا نہیں سمجھتا،

(۴)

NOW WE ARE DIFFERENT SORT

YESTERDAY HAS NOT BECOME UNKNOWN AND

UNFAMILIAR TO US

WE KNOW BOTH THESE YEARS AND THE PAST

AND BELONG TO BOTH EQUALLY

(P.216)

(۱)

وہ ایک باپ تھا جس کی زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ

جس کے ابروؤں کا فقط اشارہ

قانون بن گیا

اپنے درشت فرائض پورے کرو

اور وہ کچھ کہو جس کا کوئی وجود نہ ہو

(۳)

ابتدا میں جو ساتھی اس کے ساتھ تھے

وہی زیرِ زمین اور جیلوں کو بھگتنے کے بعد

انھوں نے حکمرانی اور طاقت حاصل کرکے جدوجہد کی

اور سب بے بس و مجبور سر بہ سجدہ ہو کر سایوں میں سمٹ گئے

(۳)

اور ہم کہ جو ۱۹۳۰ء کی نوجوان نسل تھے وہ جانتے ہیں
تحریک کی مشکلات کے باوجود
ہم لوگ اس مہم میں ثابت قدم رہے
اور اس پرچم کی صداقت کا علم بلند کرتے رہے
ہم اکیلے بھی نہ تھے
بلکہ ایک جم غفیر ہمارے ساتھ تھا
یہاں تک ذی عزت و راست باز ذہین مخلوق
ملک کے گوشے گوشے سے ہمارے ساتھ تھی

(۴)

اب ہم مختلف خانوں میں بٹ کر مختلف ہو گئے ہیں
ماضی اور گزرا ہوا کل ہمارے لیے اجنبی نہیں
اور نہ ہی ہمیں اس سے عدم واقفیت ہے
ہم ان دونوں ماضی و حال کو پہچانتے ہیں
اور ہمارا ان دونوں سے ربط و تعلق یکساں ہے۔

یگزینڈر ٹیورڈوسکی کو روسی ادیبوں اور شاعروں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے
ا جاتا ہے، اُن کا انتقال ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔

ان واقعات کی تفصیل دار فہرست سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ روس میں
ن اور افراتفری کی تمام نشانیاں ۸۴-۱۹۸۳ء میں شروع کی جانے والی تحریک
سناسٹ سے بہت پہلے نمایاں ہونے لگی تھیں۔ مغربی ممالک اور خصوصاً امریکی
ت عملی نے انسانی حقوق سلبی کے خلاف محاذ آرائی اور مکمل جہاد کی ابتدا کرتے
ے یہودی نسل پر مظالم کی داستانیں دُہرانا شروع کیں اور ان کے روس سے

اس کے بعد [illegible] تحریک کی وجہ [illegible] طرح یہاں بدنظمی اور انتشار
پھیلنے کے علاوہ مرکز معذور اور بے بسی کا شکار ہونے لگا ان بے چینیوں کے درمیان
ہی پھر قومیتوں کے درمیان لسانی تنازعات اور نسلی تفرقہ پرستی کی لہریں ابھرتی
چلی گئیں جنھوں نے پورے سماجی ڈھانچے کو متزلزل کر دیا۔

گلاسناسٹ اور پیرسٹرائیکا کے سربراہوں نے بھی ریاست کے ڈھانچے کی
تجدید لوکسمبرگ دوانوی شوق میں اُس آئین کو خاطر نہیں دیکھا جو تمام مختلف
قومیتوں کے یکجا کرنے کے باوجود ان کی علیحدگی کے حقوق کا اعلان کرتا آ رہا تھا۔
لینن نے اپنی ترجیحات پر جس بے ڈھنگے انداز سے عملدرآمد کیا تھا ان کا نتیجہ
نکلے گا۔

کارل مارکس نے شخصی شہنشاہیت و آمریت کے دور میں صنعتی انقلاب کے
پیش نظر تاریخ کے معنے کو تخلیقی سائنسی نقطۂ نظر کے مطابق حل کیا تھا جسے دنیا
کے کونے کونے میں رائج کرنے کی تحریکوں نے عالمی سطح پر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔
لیکن مارکس جس فلسفیانہ فکر اور سماجی سائنس کی ترویج کا محاکمانہ اصول لائے
تھے وہ سب ارتقائی عمل کے تابع بھی تھے اور سوشلزم کے فکر و عمل کو سائنسی
ارتقاء کے مطابق ہر آن بدلتی ہوئی کائنات اور بدلتے ہوئے انسانی رشتوں کی
روشنی میں جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

یہی ایسے متبادل راستے تھے جن کے ذریعہ تبدیلیاں لا کر حالات کو نئے
سانچوں میں ڈھالنا ممکن ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ معاشرے کو سرمایہ دارانہ
صارفیت کے متعدی امراض میں مبتلا کرنے کا رجحان ہے مارکیٹ اکانومی کی ترغیب
بے سہاروں کی مزید افلاس، بیماری اور بے روزگاری میں اضافے کا باعث ہوگی۔
روس کے نظام فکر اور طرز ریاست کی تجہیز و تکفین کے فتوے تو ہمیشہ دیئے جاتے
رہے لیکن اس بار سنجیدگی سے مغربی ممالک اور امریکہ کے تمام مفکرین اور ادبی دنیا
میں ناموری و شہرت یافتگی حاصل کرنے والے دانش ور متفقہ طور پر سوشلسٹ

نظام کے خلاف صف آرا ہیں اور اسے دفن کر دینے کی اطلاع دے رہے ہیں
مغرب گذشتہ کم از کم پچاس برسوں میں دو دس میں بیکاریوں، بھوک، مرنے والوں
سڑکوں پر رات بسر کرنے والے عام لوگوں پر زمین تنگ ہونے کی کوئی خبر
نہیں ملی تھی۔ یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ سماجی اور اقتصادی بحران کی کیفیات
۱۹۸۲ء سے جڑ پکڑ رہی ہیں۔ کنزیومرزم اور اعلیٰ قسم کی مصنوعات کی قلت اور اور
ناپیدگی نے اس وقت اجتہادی شکل اختیار کر لی جب وہاں میکڈانلڈ کے امریکی
ساخت کے ہمبرگر اور پیپسی کولا کو رواج دینے کی ابتدا کی گئی اور بین الاقوامی
کارپوریشن کے کئی ادارے اپنا صارفی مال لے کر دکانوں کو سجانے لگے۔

روس کی شکست وریخت اور اس ابتدائی کیفیت کے پیدا ہونے میں
مرکزی منصوبہ بندی اور تقسیم پیداوار کی ناکارہ طریق کار نے سب سے زیادہ حصہ لیا
ہے۔ موجودہ حالات میں جب کہ ملک نئے نئے مسائل سے دوچار ہو رہا ہے تو ہمیں یہ
پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کئی سال سے تمام قوت کے ساتھ سیاسی اصلاحات
کی جا رہی ہیں حالانکہ مارکسزم کا ہلکا سا شعور رکھنے والے جانتے ہیں کہ ابتدا اقتصادی
سطح سے ہونی چاہیے۔

دوں کا جانا تو ٹھہرا ہے لیکن اس کا انجام کیا ہوگا اس کا فیصلہ باقی ہے اس بارے
میں کچھ کہنا شاید قبل از وقت ہوگا۔ ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

• اکادمی کی مطبوعات •

نمبر شمار	۱۹۸۹ کی مطبوعات	قیمت
[illegible]	دلی کی آخری شمع	۲۶
۱	دلی والے (جلد اوّل)	۲۰
۲	دلی کا آخری دیدار	۱۷
۳	قلعۂ معلی کی جھلکیاں	۱۷
۴	رسوم دہلی	۲۸
۵	[illegible]	[illegible]
۶	بزم آخر	21
۷	داغ دہلوی	۲۱
	۱۹۸۸ کی مطبوعات	
	سراج دہلی	۱۷
۱۰	خواجہ حسن نظامی، حیات اور کارنامے	۲۹
۱۱	عالم میں انتخاب دلی	۲۶
۱۲	دلی کی تہذیب	۱۷
۱۳	دیوان حالی	۲۴
۱۴	چراغ دہلی	۲۹
۱۶	اردو صحافت	۱۲
۱۵	دلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل	23
۱۰	[illegible] و داغ [illegible]	۲۳
۱۹	دلی کی آخری بہار	20
۱۸	لال قلعہ کی ایک جھلک	۲۱
۲۰	[illegible]	50
۲۱	اردو [illegible]	31
[illegible]	[illegible]	۱۹
۲۱	[illegible] کے مضامین کا انتخاب	31
	۱۹۹۱ کی مطبوعات	60
۲۲	[illegible] افسانہ تجزیہ اور مباحثہ	80
۲۳	انتخاب کلام داغ	34
۲۴	دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات	21
۲۵	دہلی اور اس کے اطراف	25

نمبر شمار		قیمت
[illegible]	نوائے سروش کلام انتخاب	62
[illegible]	اردو میں بارہ ماسے کی روایت	۹۹
[illegible]	دلی کی درگاہ شاہ مرداں	33
۳۱	دلی والے (جلد دوم)	58
۳۲	دلی کے آثار قدیمہ	48
۳۳	اشاریہ آج کل	77
	۱۹۸۹ کی مطبوعات	
۳۴	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	25
35	مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین	47
36	آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل	61
37	رنگ ہزاروں خوشبو ایک	28
38	کلیات، کاتب اقبال (جلد اوّل)	170
39	نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس	30
40	انشائے ہادی النساء مع فخر النساء	22
	۱۹۹۰ کی مطبوعات	
41	واقعات دار الحکومت دہلی (تین جلدیں)	400
42	آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ	48
43	آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم	48
44	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	48
45	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح	44
46	آثار الصنادید (تین جلدیں)	310
۴۷	قواعد اردو	86
48	آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	6[illegible]
49	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	70
50	آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ	45
51	مہربان جن	25
52	اردو مرثیہ	67
۵۳	پگڈنڈی، جنگل سے کھیت تک	80
54	آدمی نامہ	40
55	[illegible]	16

پروفیسر ہربجن سنگھ

ترانۂ ہندی : زیریں ساخت کا مطالعہ

شاید شروع ہی میں مجھے اپنے مطالعے کے حدود اور سمت کی وضاحت کر دینی چاہیے اقبال کے ہم جہتی مذاکرے کے منتظمین نے مجھے میری دلچسپی کے مطابق مطالعے کا موضوع منتخب کرنے کو کہا۔ سچ یہ ہے کہ میں نظموں کے طالبِ علم کی حیثیت سے مطالعے کے پرانے وسایل کو برتنے کے بجائے نئے خصوصی طریقوں کو برتنے کا قایل ہوں۔ لہٰذا میں نے صرف ایک محدود رقبے تک خود کو محدود کر لیا اور کسی مخصوص ڈسپلن کی اصطلاحوں سے گریز کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ منتخب نظم کے سبھی مسائل کے تمام تر اشاروں پر مجھے دسترس حاصل ہے۔ چونکہ یہ مطالعہ محدود وقت میں مذاکرے میں معزز حضرات کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے لہٰذا میں نے ایک مختصر اور جانی پہچانی نظم کو چنا ہے۔ اس کا موضوع اور سانچے مانوس ہیں اور ان کی طرف عام ردِ عمل خاصہ متعین اور کسی قدر یکساں ہے۔ مرکزی خیال اور جذبہ حقیقت اور تخیل اس میں گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ لہٰذا میں خود کو صرف ایسے مسایل تک محدود رکھوں گا جو نظم کے پیغام کو سمجھنے کے لیے ہی مرکزی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ہماری رسائی ان معانی تک بھی کراتے ہیں جو وہ غیر شعوری طور پر ادا کرتی ہے۔ نظم کے ردِ گرد اور ادر چھور کا تعلق بھی بہرحال نظم کی مرکزی ساخت سے ہے اور معنوی صداقتیں بھی نظم کی مرکزی وحدت پر روشنی ڈالتی ہیں اور اس کے پیغام کی صراحت کرتی ہیں۔ آپ میرے اس خیال کو قبول فرمانے کی زحمت

بس کو تھوڑا بہت علم بھی ہمیشہ خطرناک نہیں ہوتا۔ چونکہ نظم کے کنارے بھی
اس کی مرکزی ساخت پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے میں نے انھیں زیریں
ساخت کا نام دیا ہے۔ میرا طریق کار واقعی بیانات کے ساتھ ساتھ ان کے
محوری تعلقات دونوں کی مدد لیتا ہے۔ مثلاً ایک مصرعے میں سے جو سوال
پیدا ہوا ہے اس کے جواب کے لیے پوری نظم کو پڑھنے کی ضرورت ہو سکتی ہے
دوسرے میں عام طور پر اپنے سارے سوالوں کا جواب نظم کے متن کے اندر ہی
ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا اور ان کے آسان جوابات بیرونی ماخذوں
مثلاً سوانح، معاصر تاریخ، تہذیبی صورت حال وغیرہ سے حاصل کرنے سے
گریز کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں نظم کی چار دیواری کے اندر رہ کر اس کے
لسانی ڈھانچے کا مطالعہ کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

آیئے، اب ہم ترانۂ ہندی کا پہلا مصرعہ پڑھیں

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا

ہم اس اہم سوال سے دوچار ہوتے ہیں کہ کسی قومی ترانے کے لیے اپنے
ملک کی تعریف کرنے کے لیے دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنا کیوں ضروری ہے۔
مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ مصرعہ تناؤ کے ذریعے حب وطن کا اظہار ہے۔ مصرعہ بڑا
گٹھا ہوا ہے مگر اس کا گٹھاؤ اور کساؤ دو متضاد عناصر کے توازن پر قائم ہے یعنی
ہم اور وہ، ہندستان اور دنیا کے بقیہ ممالک۔ دو متضاد عناصر کے درمیان اس
توازن کو میں نے تناؤ کہا ہے۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے سے پہلے یہ غور
کرنا ضروری ہے کہ یہ تناؤ کیا صرف اس مصرعے کی خصوصیت ہے یا یہ طرز پوری
نظم کے کردار میں رچا بسا ہوا ہے۔ میں نظم کے باقی اشعار میں بھی اس قسم کے متضاد
عناصر کے درمیان توازن تلاش کرتا ہوں۔

پہلے مصرعے میں ہندستان اور سارے جہاں کے درمیان تضاد
دوسرے مصرعے میں جسمانی اور ذہنی موجودگی کے درمیان تضاد

تیسرے شعر میں | اپنے وطن | اور | دوسرے پہاڑوں کے درمیان تضاد
| | کے پہاڑ | | یا تناؤ
چوتھے شعر میں | اپنے وطن | اور | باغ جناں کے درمیان تضاد
پانچویں شعر میں | مذہب | اور | وطن کے درمیان تضاد
چھٹے شعر میں | ہم | اور | یونان و مصر و روما کے درمیان تضاد
ساتویں شعر میں | اپنے وجود | اور | مخالف دنیا کے درمیان تضاد
آٹھویں شعر میں | دردنہاں | اور | نامحرم دنیا کے درمیان تضاد

نو اشعار کی نظم میں واضح طور پر اسی تعداد میں تناؤ موجود ہیں۔ دو الفاظ سنتری اور پاسباں سے غیر مذکورہ مخالف طاقتوں کے خطرناک امکانات کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔

وہ دن ہے یاد تجھ کو

کا سوال مثبت اور منفی توقعات کے درمیان معلق ہے۔ اس سوال کے اشاتی پہلو میں بھی ایک الجھن میں ڈالنے والا تلازمہ چھپا ہوا ہے۔ آیئے پورے شعر کو پڑھیں۔ اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو

اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

سوال پہلے مصرعے میں دو متضاد ردعمل کے درمیان منقسم ہے مگر دوسرے مصرعے میں وقت کے ایک مخصوص نقطے سے ملک سے وابستگی کا اور اس وقت سے پہلے اس ملک سے وابستہ نہ ہونے کا اظہار کرتا ہے میں اس تناؤ کو حل کرنے یا اس کی حمایت کرنے یا اس کی کوئی وضاحت کرنے کی کوشش اپنے تصور تاریخ اور یا اپنے تصور مذہب کی مدد سے نہیں کروں گا جس کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص آسمان یا جنت سے بھیجا گیا ہے یا یہ تصور کہ ہر فرد زمان و مکان میں آنے سے قبل وجود نہیں رکھتا تھا۔ یہ شعر سادگی کے ساتھ ابہام کا دلفریب تخلیقی پارہ ہے اس کے مختلف عناصر میں سے میں صرف اس حیثیت سے بحث کروں گا جو اس

تناؤ کی ذمہ دار ہے یا جس سے تناؤ پیدا ہوا ہے۔

اب آیئے اس حسیت کو شناخت کریں جو ان تین منفی بیانات میں جاری وساری ہے کہ یہ بیانات بلاشبہ مخالف سمت کی کسی حقیقت، امکان یا خواہش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(الف) مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

امکان ہم اپنے مذہب کی تعلیمات کے برخلاف اور کبھی کبھی مذہب کی وجہ سے برعکس عمل کرتے ہیں۔

(ب) کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

حقیقت ہمیں مٹانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

(ج) اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

خواہش ہم ہمدرد دنیا میں کسی محرم اور محبت کرنے والے کے خواہاں ہیں

اب زیر مطالعہ نظم میں مندرجہ ذیل باتوں کی پہچان ہوئی ہے:

(الف) متضاد عناصر کے درمیان توازن کی مدد سے قائم کی ہوئی مربوط ہم آہنگی

(ب) دہرے امکانات والے لفظ کا استعمال

(ج) مثبت اور منفی ردعمل کے درمیان جھولتا ہوا استفہامیہ

(د) ایسے منفی بیان جو بلاشبہ کسی مخالف امکان، حقیقت یا خواہش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ نتیجہ نکالنا جلدبازی نہیں ہوگا کہ نظم حسیت کی ایک واضح تشکیل ہے جو ...ل ذہن سے کم پر مطمئن نہیں ہوسکتی اور یہ ایک ایسا ذہن ہوگا جو پیش نظر ...عدردینے کے جوش میں پس منظر کو نظرانداز نہیں کرے گا اور یہ زمانۂ موجود کی ...ت کرتے ہوئے غیر موجود کی آگہی بھی جاری وساری رکھے گا۔ یہ نتیجہ بھی خاصہ ...معقول لگتا ہے مگر جلدبازی اور جذباتیت سے محفوظ رہنے کی خاطر نامناسب ...ہوگا اگر ہم دوبارہ جانچ پڑتال کر لیں۔ لہٰذا میں ایک بار پھر پوری نظم پڑھوں گا

اور جس منظر اور جس منظر پر مصرعہ پر غور کریں گے تو اور صرف ان [illegible]
غیر کیفیتوں کا محویا تو استعارے ہیں یا تقریباً استعارے ہیں جیسے مندرجہ ذیل:

شعر (۱)	سارا جہاں	ہندوستاں ہمارا
	ہم بلبلیں	گلستاں ہمارا
شعر (۲)	غربت	وطن
	جسمانی موجودگی	ذہنی موجودگی (دل ہو جہاں ہمارا)
	پربت	ہمسایہ آسماں
	سنتری	پاسباں
	گودی	ہزاروں ندیاں
	ہمارا گلشن	باغ جناں
	(موجودہ گنگا)	قدیم دور کی گنگا (آبِ رودِ گنگا)
	مذہب	حب وطن
	مٹنے والے یونان و مصر و روما	نہ مٹنے والے ہم
	نہ مٹنے والے ہم	صدیوں کی دشمنی رکھنے والا (دورِ زماں)
	ہم	نامحرم دنیا

دردنہاں دوست کی ناموردگی (معلوم کیا کسی کو
دردنہاں ہمارا)

مذکورہ چودہ جوڑوں میں سے صرف تین ایسے ہیں جو متضاد نہیں ہیں ان میں ایک (سنتری۔ پاسباں) اس فضا میں اجنبی ہے اور صرف دو مترادفات اور ہم معنی الفاظ کو تکرارِ عبارت ہے جو تناؤ کی حسیت کے مطابق نہیں ہے باقی دوسی بلبل اور گلستاں، اور گودی اور ہزاروں ندیاں کے جوڑے بھی متضاد نہیں ہیں بلکہ دو مختلف شعبوں میں توازن قائم رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک چودہ میں سے تین کا استثنا مناسب ہے اس لحاظ سے مذکورہ نتیجے کی توثیق آسانی سے کی جا سکتی ہے۔

اب تک ہم نے نظم کے لسانیاتی طرزِ عمل کے ذریعے نظم کی حسیت کے پہچاننے کی کوشش کی ہے مگر نظم گو الفاظ سے عبارت ہے مگر اصلاً زبان سے ماوراء ہے ہم نے عناصر وقت نظم کے تشکیلی عناصر کے تجزیے پر صرف کیا ہے اب ہمیں اس کے زیادہ اہم عناصر پر بھی توجہ کرنی چاہیے۔ نظم کی شروعات پندار پارینہ سے ہوتی ہے اس کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے بلاشبہ اداسی پر۔ پہلے اور آخری اشعار کے آخری مصرعے یوں ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا

معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

بظاہر نظم کا پورا رویہ تناؤ پر مبنی ہے مگر شگفتہ ابتدا والی نظم یا تو شعوری منصوبے کے مطابق یا محض اتفاق سے اداسی پر ختم ہوتی ہے اس کے بعد باقی کے درمیانی حصے پر نظر ڈالنا نہایت ضروری ہے۔

نظم میں ہے:

گلشن ہے جس کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

۱۸ . صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور ہم بلبلیں گو وطن سے دور غربت میں ہیں مگر دل وطن ہی میں ہے نظم اندرونی بیر اور لڑائی کا بھی ذکر کرتا ہے (آپس میں بیر رکھنا) اور بیرونی دشمنی کا بھی تذکرہ کرتا ہے (دشمن دورِ زماں)۔ یہ قابلِ توجہ ہے کہ تضادات پر اس قدر ہنرمندی سے ڈھالی ہوئی نظم بیر اور دشمن کے تلازمے استعمال نہیں کرتی یا استعمال نہیں کر سکتی۔ دراصل وہ واضح طور پر محبت اور دوستی کا کسی بھی شکل میں ذکر نہیں کرتی۔ مختصر یہ کہ جذباتی ہم آہنگی پہلے اور آخری شعر دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک نشاطیہ احساس جو گہری اداسی سے آمیز کیا گیا ہے۔ نشاط کسی کارنامے پر فخر سے نہیں بلکہ نہ مٹنے سے یا مٹنے سے بچ جانے سے پیدا ہوا ہے اور اداسی بلا سبب دکھ پانے اور بے پروائی کا شکار ہونے سے پیدا ہوا ہے۔ یہاں بھی تناؤ دو تضادات کے درمیان ہے جن کی مدد سے توازن قایم کیا گیا ہے اور نہ تو تضادات میں ٹکراؤ ہے نہ ان تضادات کو حل کرنے کی کوشش۔ توازن کا ذکر کرتے ہوئے بھی وہ محتاط لہجہ اور آہنگ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جو آخری دو شعروں میں ملتا ہے۔ فخر و پندار کے لمحے (کچھ بات ہے) اور درد (دردِ نہاں) مبہم چھوڑ دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نظم کا جذباتی طرز تضادات سے ابھرتا ہے اور توازن تک پہنچتا ہے۔

ایسا لگتا ہے جیسے ترانۂ ہندی کے مختلف عناصر کے پہچاننے کی کوشش میں میں نے نظم کو فرد کی سی حیثیت دے دی ہے اس کا جواب تو سوال سے ابھرنے والے جبریہ اور لازمی عناصر ہی میں تلاش کرنا ہوگا اسی کے ساتھ مجھے نظم کا تعین۔ شعر ۱۷ اور ۲۱ [illegible] صورت کے درمیان توازن میں

ہوسکتا ہوگا۔ مجھے ابتدا میں کیا ہوا اپنا وعدہ یاد ہے کہ میں خصوصی اصطلاحات استعمال نہیں کروں گا۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ دراصل اس وعدے سے مجھے فائدہ پہنچا ہے "متعین" اور "زیرِ تشکیل" یعنی بنی ہوئی اور بنتی ہوئی کی اصطلاحیں یہاں میں نے کسی قسم کے فلسفیانہ معنویت کے بغیر سیدھے سادے عام معنوں میں استعمال کی ہیں مجھے اس فرد جیسی نظم کے صرف ایک رُخ سے غرض ہے کیا اس کا ذہن متعین ہے یا ابھی زیرِ تشکیل ہے؟ جامد ہے یا نامیاتی؟ سیدھے سادے لفظوں میں کیا وہ وقت کے کسی نقطے پر قائم ہے یا اپنا دائرہ بڑھاتی جاتی ہے۔ میں اس سوال کا جواب پہلے افعال میں تلاش کروں گا۔ نظم میں مختلف مصرعوں میں جو افعال استعمال ہوئے وہ یہ ہیں:

پہلا مصرع (ہے)	چوتھا ہے	آٹھواں ہے
دوسرا ہیں	پانچواں (ہے)	نواں ہیں
تیسرا بجھو	چھٹا ہے	دسواں آئرا
ہو	ساتواں کھیلتی ہیں	گیارہواں ہیں۔ ہے
بارھواں ہیں۔ ہے	پندرھواں ہے	سولہواں رہا ہے
تیرھواں مٹ گئے	ملتی نہیں	سترھواں (ہے)
چودھواں ہے		اٹھارہواں (ہے)

(نوٹ:۔ بریکٹ میں وہ افعال ہیں جو حقیقتاً استعمال نہیں کیے گئے مگر استعمال کیے جاسکتے ہیں یا موزوں ہیں)

ظاہر ہے کہ نظم میں ایک ہی غالب فعل ہے اور ایک صیغہ ہے وہ ہے صیغۂ حال۔ ۲۲ ٹکڑوں میں سے صرف دو ماضی کے ہیں اور ایک بھی زمانۂ حال کا نہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ نظم میں ذہنی طور پر کچھ ماضی سے وابستگی ہے مگر ہندوستان کے مستقبل، اس کے لوگوں اور ان کے مقدرات سے کچھ دلچسپی نہیں

ہے۔ (یہ) خود ایک نہایت غیر واضح سا عمل ہے [illegible]
آتا ہے ایسی حسیت جو کسی دوسرے عمل کے بغیر یا اس کے تحت کسی [illegible]
کرتی ہے اور کسی کام کے کرنے یا کسی صورت حال کے زیر تشکیل ہونے کے عمل کو [illegible]
کرتی ایسی نظم یا حسیت کو 'ہونے' ہونے کی نظم یا حسیت کہا جا سکتا ہے [illegible]
تعین صورت حال۔ مترجم یہاں بھی ہمیں جاری سے ایک بار پھر مطلب نکال کر
پرکھ لینا چاہیے۔ نظم میں ظاہر ہونے والی جامد صورت حال سے بھی ماضی اور حال
کے صیغوں کی مدد سے رفتار کا فریب ہو سکتا ہے۔

ترانہ میں ایک بھی PARTICIPLE نہیں ہے رفتار کا دھوکا صرف استعاروں
کے استعمال سے ممکن ہے۔ ایسی نظم ہیں جو متحرک استعارے ہیں جو جامد صورت حال کو
ظاہر کرتے ہیں۔ ترانہ میں اس قسم کے استعاروں کا کوئی استعمال نہیں ہوا ہے۔ سچ تو
یہ ہے کہ نظم پر ایسی باتوں کا الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے جو نہ اس میں کی گئی ہیں اور
نہ انھیں اپنایا گیا ہے۔ محض فرضی جزوی یا ناکافی معلومات کی بنا پر نتیجے نکالنے کی
ضرورت نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ بنیادی طور پر نظم کے غیر فعالی افعال کے ڈھانچے اور پھر
پارٹی سپل (فعل، اسم، فعل صفت بھی) اور نامیاتی استعاروں کے پیش نظر یہ نتیجہ
نکالا جا سکتا ہے کہ نظم میں جو حسیت سموئی گئی ہے وہ غیر متحرک مناظر سے متاثر
حسیت ہے۔

یہ نتیجہ نظم میں افعال کے استعمال کی نوعیت سے نکالا گیا ہے مگر جیسے پہلے کہا
جا چکا ہے اصل نظم نظم کی مادی ساخت سے ماورا ہوتی ہے۔ انجام کار نظم آواز کے
بعد آنے والی خاموشیوں کی طرف جاتی ہے۔ لسانیاتی سانچوں کا تنوع اور رنگارنگی
خاموشیوں کے دو بنیادی اصولوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ مشابہت کا اصول اور تلازمے
اور موسیقی کا اصول۔ نظم کا مشابہت کے اصول سے بڑے کام سا تعلق رہا ہے۔ نظم کے
بعض عناصر کو استعارے کی شکل میں ڈھالنے کی انتہائی کوششیں ہیں مگر واضح طور
[illegible]

لیکن فون سے بار بار [illegible] اندر ایک مدغم گونج سی ابھرتی ہے الفاظ کا احساس ہوتا [illegible] ہے جو معمول نظم کے اندر موجود نظر آتا ہے اس میں ربط اور ارتباط کی [illegible] دیگر ان عناصر کو پہچاننے کے لیے مجھے بڑے صبر اور کاوش سے کام لینا پڑا [illegible] تو تواتر (ہندی) غزل کی طرح لگتا ہے جس میں تسلسل ہے مگر تسلسل نہیں ہے گویا ہم ترانے کے اشعار کی ترتیب اس کے معنی اور مقصد کو مجروح کیے بغیر بدل سکتے ہیں؛ میں نے اس کی کوشش کی اور مجھے ایسا احساس ہوا کہ یہ غزل سے مختلف ترتیب ہے میں نے بار بار کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم مشابہ اور یکساں کے امتزاج سے بنتے ہوئے یک رنگی اور ربط کے واضح نمونے سے دوچار ہیں (یعنی یہاں یکساں عناصر کی تکرار نہیں ہے بلکہ مختلف عناصر کے درمیان ربط سے حاصل کردہ وحدت ہے ــــ مترجم) اس سے قبل ہم تضادات کے درمیان توازن پیدا کرنے کی مختلف نحوی تراکیب کا ذکر کر چکے ہیں۔ اب میں مختلف عناصر میں ربط و ترتیب پیدا کرکے ان سب کو ایک ساختیاتی وحدت میں ڈھالنے کے تصور کے سلسلے میں آپ سے تبادلۂ خیال کروں گا۔ حسب معمول میں پھر شروع سے بات کی ابتدا کرتا ہوں۔

پہلا شعر استعاراتی اظہار ہے۔ ہندوستان گلستاں ہے اور ہندوستانی بلبلیں ہیں۔ (۱) بلبل سے مختلف چیزوں کی یاد آتی ہے ان میں ایک ہجرت کا تصور بھی ہے دوسرے شعر میں غربت یعنی پردیس کا ذکر ہے بلبل (ہندوستانی) غربت میں اپنے والی اپنے بچھڑے ہوئے وطن کو یاد کرتی ہے۔

(۲) ایک خاموش سوال یہاں ابھرتا ہے۔ کیا بلبل (ہندوستانی) اپنے عزیز وطن کو تنہا اور بے سہارا وطن میں خیالی یا حقیقی دشمنوں کے رحم و کرم میں چھوڑ آئی ہے۔ پھر ہمالیہ ہے جو مستقل سنتری اور محافظ ہے۔

(۳) ہمالیہ کے سلسلے میں نظم اس کی گودی میں کھیلتی ہوئی ہزاروں ندیوں کا ذکر کرتی ہے۔ یہ گودی میں کھیلتی ہوئی ندیاں چھوٹے بچوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں

کہ بلبل اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سا[redacted] [illegible]
اثبات میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔
پہلی یہ کہ گودی اور تکمیلیت کے الفا[illegible] واضح طور پر نشان کرتے
ہیں۔ پھر شعر کے دوسرے مصرعے میں گلشن [illegible] پہلے شعر میں بلبل کے
سلسلے میں آ چکا ہے۔

(۴) اب تک نظم ہو مرکز [illegible] مونث بلبل ایک
اجنبی دیس میں اپنے وطن یا گلشن کو اور [illegible] کو یاد کرتی ہے جنھیں وہ
وہاں چھوڑ آئی ہے۔ اس کے اندر اپنے بچوں [illegible] کی طرف سے موہوم سا تشویش
ہے تب وہ کسی پدرانہ قسم کے محافظ کے بارے میں [illegible] ہے ایسا محافظ جس کی
نگرانی آنکھوں کے سامنے ہزاروں بچے کھیلتے [illegible] وطن اب ایک خوب صورت
گلشن اور جنت کی طرح پرسکون لگنے لگتا ہے۔

(۵) یہاں غربت والی بلبل کا استعارہ ختم ہوتا ہے بلبل کا ذکر ختم ہوتا
ہے مگر غربت (اور اجنبیت) قائم رہتی ہے۔ ہندوستان کے ذکر سے نظم اب واحد
دریا، دریائے گنگا کی طرف رجوع ہوتی ہے۔

(۶) گنگا کا تلازمہ مذہب سے ہے اور مذہب کا اندرونی خلفشار اور
ٹکراؤ سے۔

(۷) اندرونی ٹکراؤ سے یونان و مصر و روما کی تہذیبیں مٹ جاتی ہیں۔

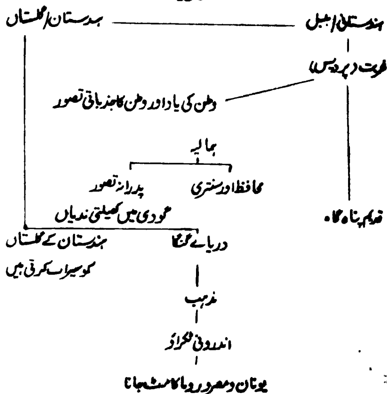
(۸) اس ٹکراؤ سے ذہن اپنے پہاڑ کی طرف جاتا ہے جو ذہنی اور حیاتی
عمل میں قدرتی عمل ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ مذہبوں کے پیدا کردہ اندرونی
ٹکراؤ اور بیرونی خطروں کے باوجود ہم مٹے نہیں اور ابھی تک ہمارا نام و نشان
باقی ہے؟

(۹) غربت میں رہنے والا شہری اجنبیت محسوس کرتا ہے وہ سرزمین وطن
کی طرح پرسکون ہے اندرونی طور پر ٹکراؤ اور اضطراب کا شکار ہے اور اسے

یہ مستقل محافظ کا یہ تصور بہت ہی اعلیٰ اقدار سے وابستہ ہندوستانی آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو سکتے ہیں۔ خود ہندوستانی کو اس سے لگاؤ ہو سکتا ہے اسے اپنے حلقے پر اور اپنے ہم وطنوں کی کمزوریوں کے باوجود اس کے پہاڑ پر فخر ہے مگر وہ اندرونی ٹکراؤ اور بیرونی خطروں سے گھری ہے وہ ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جو صورت حال اور آئندہ آنے والے خطرات سے بے پرواہ اور آگاہی سے غافل ہے

شاید میں جذباتی ہوتا جا رہا ہوں جس میلان کو مجھے روکنا چاہیے کیا میں یہاں ربط و پیوستگی کے زیریں سانچوں کا نقشہ پیش کر سکتا ہوں جس سے ہم ایک نظر میں واضح طور پر سب کچھ پہچان لیں گے۔

ماضی کی یاد



ہندوستان کا نام و نشاں باقی رہا

درد نہاں

اب وقت ہے کہ ہم اپنی دلیل کو یہ کہہ کر سمیٹ لیں کہ نظم بنیادی طور پر تناؤ کی حسیت کی پیداوار ہے اور موجود اور غیر موجود کے درمیان اور نشاط اور دکھ کے درمیان توازن قائم کرتی ہے اور مختلف ذہنی صورتوں کو پیش منظر کے طور پر قائم کرتی ہے ایک ایسی محب وطن کی حسیت ہے جو پردیس میں شدید اجنبیت کا شکار ہے۔ نظم تہذیبی صورت حال کو عہد جدید میں ایک جامد اور متعین صورت حال کی طرح دیکھتی ہے اور اس کے ماضی سے تو کچھ آگہی کا اظہار کرتی ہے مگر اس کے مستقبل سے سروکار نہیں رکھتی۔ یہ ایک ایسی حسیت ہے جو بنیادی طور پر تلازموں کے ذریعے اور محض ثانوی طور پر مشابہتوں کے ذریعے کار فرما ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب میرا کام پورا ہوا البتہ مجھے دو چار لفظ بطور وضاحت کہنے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ میں نے خود کو نظم کی چار دیواری ہی میں محدود رکھا ہے اس عمل میں حسیت کے جن عناصر کی پہچان کی گئی ہے صرف ایک نظم کے ہیں اور اقبال کی تمام شعری تصانیف پر محیط نہیں ان کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کے دور پر بھی محیط نہیں۔

اب دو سوال اور ابھرتے ہیں۔ کیا یہ عناصر اسی نظم کے لیے مخصوص ہیں؟ اور دوسرے کیا یہ اس غیر شاعرانہ غیر لسانی ماحول کا نقش ہیں جس میں یہ نظم تخلیق ہوئی؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے جوابات بالکل مختلف رویے، طریق کار اور وسائل مانگتے ہیں۔ میں ایک مقالے میں دو مطالعے پیش کرنے سے گریز کروں گا مگر نہایت انکساری سے اس موضوع پر مختصر تبصرہ پیش کرنا چاہوں گا اور اس سلسلے میں بھی مطالعے کے اندرونی حد بندی کو ملحوظ رکھوں گا۔ ہر نظم لسانی ترتیب کا ایک ٹکڑا

ہے اور ہر انسانی دنیا سے ہم آہنگ ہوتا ہے ہر نظم اپنے طور پر ایک ذیلی اپنی انفرادیت اور اپنی وابستگیوں کا انتخاب دیسی کرے کہ ان کی طرف اشارہ کیے جانے کے قابل ہوتی ہے۔ دراصل یہ انفرادیت دوسروں سے اسے الگ کرتی ہے اور وابستگیاں اسے دوسروں سے اور ان کے درمیان رابطہ دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اس نظم میں ہمارا کی تکرار غیر انفرادی، لہٰذا انوکھے پن کے خلاف ہے سننے والے ہی نظم کے متکلم بھی ہیں اور وہی نظم کے عنصر بھی۔ نظم اور نظم پڑھنے والے کے درمیان کا امتیاز اگر ختم نہیں ہوتا تو بہت مبہم ہو جاتا ہے۔ میں اس تکرار کو (ردیف ہونے کی وجہ سے) تکنیکی مجبوری کہہ سکتا تھا مگر 'ہم' کی تکرار 'ہمارا' 'ہماری' 'اپنا' 'آپس میں' پوری نظم میں موجود ہے اور نظم کے داخلی غیر امتیازی کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔ نحوی شکلوں کی تکرار پر غور کیا جائے تو نظم کا مرکزی موضوع ہندستان کی بجائے ہم ہندستانی ہے۔ نظم کا عنوان بجا طور پر ترانۂ ہند کے بجائے ترانۂ ہندی ہے ہندی (یعنی ہندستانی) اسے محض ایک باہری کردار کی طرح نہیں لاتا بلکہ اس کا اہم عنصر بن جاتا ہے۔

معنیاتی سطح پر نظم میں اصطلاحات یا رویے کی ندرت کی طرف ہلکا سا جھکاؤ نہیں ہے یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں نہ کوئی اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ نہ جدید ترین ایماں نگار نہ تربیت یافتہ نقاد۔ یہ تو سلامتی اور اتحاد کی مشترکہ کوشش کا ایک ملا جلا اظہار ہے۔ گو ایک شاعر نے اسے لکھا ہے مگر یہ نظم بول چال کے ایسے قدیم دور سے تعلق رکھتی ہے جب الفاظ مخاطب کی موجودگی کے بغیر ادا نہیں کیے جاتے تھے۔ یہ نظم آج کی ضروریات کے مطابق قومی ترانہ کہی جا سکتی ہے مگر اس سے بھی زیادہ ہے یہ نسلی لاشعور کی جادوئی باقیات (کچھ بات ہے) مذہب (مذہب نہیں سکھاتا) آبا و اجداد (کارواں) قبائلی خواہش کی تکمیل (حناں) کے ساتھ اتحاد کے احساس کو ظاہر کرتی ہے یہ سب مل کر وجدانی جمالیات کی جہت کی تشکیل کرتے ہیں جو میں تم کی دوئی کی گنجائش نہیں رہنے دیتی۔

اس ادبی سفر میں ساتھ دینے کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں یہ [illegible]
دعویٰ کرنا ڈینگ مارنے کے برابر ہوگا کہ میں اس حیثیت کی نشاندہی کرنے میں
کامیاب ہوگیا جو میری اپنی حیثیت سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ نسلی گہرائیاں
پوری طرح سطح پر نہیں لائی جا سکتیں۔ ادب میں کوئی نہ کوئی چیز ایسی ہوتی ہے
جو خوشگوار طور پر ہماری گرفت سے باہر رہ جاتی ہے کوئی کھرا ادب پارہ کبھی پوری
طرح سمجھا نہیں جاسکتا۔ مانوس فن پارے کبھی کبھی زندگی کے بالکل ہی نامانوس
اور پُراسرار تھرتھراہٹوں سے ہمیں قریبی ربط میں لاکر ہمیں خوش کردیتے ہیں اور
شاید ناکافی ترسیل یا تفہیم کے احساس سے ہمیں اداس بھی کرتے ہیں۔

اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(ترجمہ : م۔ح)

(۱؎ یہ مقالہ اقبال پر ہمہ جہتی مذاکرے کے موقعے پر پڑھا گیا)

"عصری ادب" کے اگلے شمارے کی ایک جھلک

۱. خوشامدی ادب : کیوں ؟ اور کیسے ؟
۲. محاسبہ
۳. دس سال کی اردو نظموں پر تبصرہ
۴. تذکرہ شعرائے ہند (قسط اول)

سید احتشام احمد ندوی

تقابلی مطالعہ کا ارتقا

تقابلی مطالعہ عالمی شاہ کاروں کے درمیان ربط قایم کرتا ہے۔ تنقید میں تخلیقی روح پیدا ہوتی ہے اس تنقید کے اصل اجزاء تقابل، قیاس، مشابہ افکار و آرا یا مغائر انداز، اور توارد جیسے عناصر ہیں۔ تاریخی بھی وجدانی بھی۔ تقابلی مطالعے میں "تاریخی تنقید" کا عنصر لیبسن [illegible] نے شامل کیا ہے۔ چونکہ تقابلی مطالعہ بھی عام ادب کی ایک شاخ ہے اسی بنا پر اس میں بھی تاریخ کا عنصر اُسی حد تک کارفرما ہے جس طرح عام تنقید میں ہم کو تاریخ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

تاریخی انداز سے ادب کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک ادب دوسرے ادب سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ اس اندازِ فکر کے علمبرداروں نے اس پر بحث کی ہے کہ کس طرح یونانی ادب، لاطینی ادب سے مربوط ہے اور کس طرح چینی او ر ہندستانی ادب نے ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے ادب پر اثر ڈالا ہے۔ قدیم مآخذ سے ان ثقافتی اور تمدنی باہمی لین دین کا پتا چلایا ہے جو مختلف قوموں میں جاری تھا۔ انھوں نے مختلف تحریکوں اور فکری دھاروں کے پیچھے ان عوامل پر روشنی ڈالی ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں آئے ہیں اور انھوں نے فکر و ادب کو متاثر کیا ہے۔ یہ لوگ ادبی موضوعات، ادبی شہ کاروں، ادبی تخلیقات اور ادبی عوامل کی تفسیر میں تاریخ کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے ارتقا میں تمام قوموں

[illegible]

کے ارتقائی منازل سے اور ان کے اثرات سے بحث کرکے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اس
کے برعکس ایک دوسرا طریقہ بھی تقابلی مطالعہ کا سامنے آتا ہے اس کو وجدانی طریقہ
کہا جاتا ہے۔

وجدانی نظریے کے حامل نقاد کہتے ہیں کہ تاریخ ایک ملمع سازی ہے ہر مورخ اپنے انداز سے تاریخ لکھتا ہے بلکہ تاریخ سازی کرتا ہے تقابلی مطالعہ کا اصل طریقہ اس گروہ کی رائے میں وہ انسانی نفس سے متعلق جذبات ہیں جو وجدانی طور پر شعر و ادب میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ کیفیت سارے انسانوں میں عام ہے۔ یہ مقاصد و موضوعات اصلاً ادبی نہیں ہوتے جو انسانی نفس کی گہرائیوں میں جنم لیتے ہیں مگر ادیب اپنی ادبی صلاحیت سے ان کو ادبی شکل عطا کرتا ہے اس کا ذوق انسانی، قلب اور نفس کی ترجمانی کرتا ہے۔ تاریخ اس کی تائید کرے یا نہ کرے اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ادیب کو جو کچھ وراثت میں عطا ہوا ہے، جو فکر و نظر کی دولت اس نے ذاتی مطالعہ و مشاہدے سے حاصل کی ہے اور جو اندرونی خلش وہ اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے وہ اپنے ذوق و ذہن کے مطابق پیش کرتا ہے اس اندرونی کیفیت کی تاریخی طریقہ سے تشریح و تحلیل ممکن نہیں یہ عالم وجدان کا عطیہ ہے جو فکر و فن کو متاثر کرتا ہے۔

نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ حقیقت واضح ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں جو ادبی و فکری سرمایہ تیار ہوا ہے اس کے اثرات عالمگیر ہیں یونان کے افکار نے ساری دنیا کو متاثر کیا۔ ہندستان کا علم و ادب سارے عالم میں پھیلا۔ عربوں کی ترقی کے اثرات سارے میں ظاہر ہوئے جس کی وجہ سے اب یورپ کی تمدنی ترقی کے جلوؤں سے سارے شہر جگمگا رہے ہیں بلکہ اب تو یہ عالم ہے کہ آج کوئی اہم ادبی کارنامہ وجود میں آیا اور کل اس کے ترجمے ساری دنیا کی اہم زبانوں میں پھیل گئے۔ اس بنا پر آج کا ادب خود میں عالمی ادب کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے اور اب یہ ممکن نہیں کہ اصل انسانی [illegible]

[illegible] محفوظ رہ جائیں.

تاریخ کے ہر دور نگاری کو دیکھیے کہ کس طرح انسانی افکار نے قوموں اور ملکوں پر اثر ڈالا ہے کس طرح ایک ادب نے دوسرے ادب کی کایا پلٹ کر دی ہے. اس تناظر میں دنیا کی عظیم اقوام کے ادب کا مطالعہ ایک نیا باب کھولتا ہے اور ہمارے ذہنی افق کو وسیع کرتا ہے. کس طرح یونانی ادب نے رومانی ادب پر غلبہ پالیا. رومن جو یونان کے حاکم تھے. مگر فکر و نظر اور ادب و شاعری میں وہ یونان کے محکوم بن گئے. ان کے صاحب نظر ناقدوں اور ادیبوں نے اعلان کر دیا کہ یونان کے اتباع کو ڈرامے اور شاعری میں اصل اہمیت حاصل ہے.

خود عربوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے کہ کس طرح انھوں نے غیر ملکوں کے علمی سرمائے سے استفادہ کیا ہے. کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے ایک رات ایک خواب دیکھا کہ ایک شخص نہایت صاف و سفید لباس پہنے اور سنہری گھنی سفید داڑھی والا سامنے کھڑا ہے. اس سے خلیفہ نے دریافت کیا کہ "تم کون ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "میں ارسطو ہوں"

صبح کو خلیفہ نے یہ خواب بیان کیا اپنے درباریوں سے، اور ایک وفد بھیجا کہ کیا قسطنطنیہ کو تاکہ وہ ان کتابوں کو لے آئے جن کو دہریت اور بے دینی کے ڈر سے پادریوں نے ایک مکان میں مقفل کر دیا تھا. یہ سب یونانی فلسفہ اور اہل نظر کی کتابیں تھیں جن کو حفاظت سے تالوں کے اندر رکھا تھا تاکہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر مذہب سے بدظن نہ ہو جائے.

جب یہ وفد قیصر روم کے پاس گیا تو قیصر نے پادریوں سے مشورہ کیا انھوں نے کہا "اے بادشاہ! یہ تو بڑا مبارک قدم ہے اس سے اسلام میں اختلافات پیدا ہوں گے اور اس مذہب میں فلسفہ اور دہریت پھیلے گی اس لیے یونانی کتابوں کے ذخیرے کو مسلمانوں کے حوالے کر دیجیے"

چنانچہ وہ ساری کتابیں بغداد آگئیں اور ان کے ترجمے کے لیے بیت الحکمۃ
دارالحکمت قائم کیا اور عیسائیوں کو ترجمے کی خدمت پر مامور کیا گیا جو یونانی
زبان سے واقف تھے۔ کہتے ہیں کہ اس نے ترجموں کی کتاب کے وزن کے برابر
سونے سے نوازا۔ ان کتابوں کے ذریعہ عربوں کی عقلی زندگی بالکل بدل گئی۔
معتزلہ کا نیا فرقہ پیدا ہوا جو عقل پر زور دیتا تھا۔ مرجیہ، قدریہ، جبریہ اور کئی
ہی فرقے یونانی فلسفے نے پیدا کیے۔ ان کے اثرات ادب پر بھی بالواسطہ پڑے۔
مثلاً تفسیر پر معتزلہ نے خاص توجہ کی اور بہت سی تفاسیر لکھیں جن میں کشاف
بھی ہے زمخشری کی تفسیر بھی ہے جو آج بھی ہمارے مدارسِ عربیہ میں رائج ہے
اور تفسیر کی مقبول کتاب تصور کی جاتی ہے۔ خود الجاحظ معتزلی ادیب تھا اور
خود اس کا اپنا ایک فرقہ اعتزال میں تھا جو فرقۂ جاحظہ کہلاتا تھا۔

اس موقع پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ عربوں نے یونانی ادب کی کسی کتاب کا
ترجمہ نہیں کیا ورنہ عربی ادب میں زبردست انقلاب آجاتا اور ڈرامہ نگاری کا
باب کھل جاتا۔ اتفاق سے چند کتابوں کو فلسفہ اور منطق کی کتابیں تصور کر کے
عربوں نے ان کو عربی میں منتقل کیا ان میں کتاب الجدل ہے جو منطق سے متعلق
ہے مگر دوسری بوطیقا (POFTICA) ہے اور ریطوریق (RETORICA) ہے۔
پہلی کتاب کا صحیح ترجمہ کتاب الشعر ہے اور دوسری کتاب کا ترجمہ کتاب الخطابۃ
ہے۔ ان دونوں کے اثرات عربی تنقید پر گہرے انداز سے مرتب ہوتے ہیں اور
خود ابن سینا نے بھی ان کی شرحیں کتاب الشفا میں لکھی ہیں۔ مگر لطف کی بات
یہ ہے کہ عربوں کے یہاں چونکہ ڈرامے کا فن موجود نہ تھا اسی بنا پر ان کو ٹریجڈی
اور کامیڈی کے تصور کو سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ مثلاً ان کتابوں میں ٹریجڈی
کا ترجمہ مدح نگاری اور کامیڈی کا ترجمہ مرثیہ نگاری کیا گیا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے
کہ عرب شعر و ادب میں اپنے آپ کو بہت برتر تصور کرتے تھے۔ اس بنا پر
انھوں نے ادب کی کسی کتاب کا ترجمہ سرکاری طور پر نہیں کروایا۔ جاحظ نے یہ تو

تسلیم کیا ہے کہ یونانی فن خطابت سے واقف تھے اس لیے کہ اس نے بعض یونانی کتابیں پڑھی تھیں مگر اس کا خیال تھا کہ یونانیوں میں کوئی خطیب پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں کہ اس سے یونانی ادب سے جاحظ کی سطحی واقفیت مترشح ہوتی ہے۔

یہی جاحظ لکھتا ہے کہ عربوں نے علم بلاغت ہندستان سے اخذ کیا ہے۔ بلاغت درحقیقت فصاحت کا عنصر بھی اپنے اندر رکھتا ہے یعنی ہر لفظ فصیح ہو تو یہ فصاحت ہے مگر یہ فصیح الفاظ اور جملے اگر مناسب موقع سے استعمال ہوں تب وہ کلام بلیغ ہوگا اگر فصیح کلام کو نامناسب موقع سے استعمال کر دیا جائے تو وہ باوجود فصیح ہونے کے بلیغ کلام تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ عربی بلاغت کی کتابیں ان بحثوں سے پُر ہیں مگر ان کا مرجع ہندستان کو بتایا گیا ہے۔ اب تقابلی مطالعہ کا کتنا اہم پہلو ہمارے سامنے آ رہا ہے کہ اس بلاغت نے جو نیا رنگ عربی میں اختیار کیا اور جو بعد میں بلاغی تنقید بن گئی اس نے شعر و ادب پر تو خیر غیر معمولی اثرات مرتب ہی کیے مگر اس نے فارسی ادب، شعر، بلاغت، علم بدیع، معانی، بیان اور ادب کے تمام پہلوؤں پر بھرپور اثرات ڈالے اور اس کے بعد یہ مباحث اردو ادب تک پہنچے اور صنائع و بدائع سے پُر عبارتیں اردو میں بھی لکھی جانے لگیں بقول حالی: ”اس ابتدا کی دیکھیے نکلے خبر کہاں“

اگر اس ابتدا کی خبر کا جائزہ لیا جائے تو عرب، ایران، ترکستان اور ہندستان سب پر اس کے اثرات نہایت دیرپا ثابت ہوں گے اور یہی میدان ہے تقابلی مطالعہ کا۔ مثال کے طور پر ایک دوسری بحث کو لیجیے۔ یہ معروف حقیقت ہے کہ عربی میں ”کلیلہ و دمنہ“ کا ترجمہ پہلوی سے ابن مقفع نے کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک ایرانی بادشاہ نے ایک شخص کو ہندستان بھیجا کہ وہ سنسکرت سیکھے پھر اس کتاب کا ترجمہ کرائے۔ وہ شخص ہندستان آیا، یہاں ٹھہرا، سنسکرت زبان سیکھی اور بڑی مشکل سے، مگر اس کو کتاب کوئی نہیں دیتا تھا لہٰذا چُرا

ے گیا۔ یہ کتاب ایران پہنچی اور وہاں اس کا ترجمہ نوار سہیلی کے نام سے پہلوی
میں ہوا یعنی قدیم فارسی میں، اور اس کو ابن مقفع نے عربی میں منتقل کیا اور
س شان سے کہ آج وہ عربی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے زبان و
بیان اور اسلوب سکھانے کے لیے پڑھائی جاتی ہے اور درسی کتابوں میں
س کا نام سر فہرست ہے۔ مولانا عبد السلام قدوائی اکثر فرماتے کہ عربی اسلوب
کے نکات سیکھنے کے لیے کلیلہ و دمنہ سے بہتر کوئی کتاب نہیں اور یہ قول وہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے نقل فرماتے تھے کہ وہ عربی کے معروف
ادیب ہیں۔ ان مثالوں سے عربی ادب پر عالمی اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا
ہے کہ یہ اثرات ہندستان، ایران اور یونان سے مستعار ہیں اور تقابلی مطالعہ
کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کرتے ہیں۔

عربوں کی تہذیب و تمدن سے ایک مثال اور دی جا سکتی ہے کہ انھوں نے
یورپ میں تمدن پھیلایا اندلس کی راہ سے۔ موسیو لیبان تمدن عرب میں
لکھا ہے کہ یورپ کی شاعری میں قافیہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ یورپ نے
خصوصاً فرانس نے قافیہ کا استعمال شاعری میں اندلس کے عربوں سے سیکھا۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ تقابلی مطالعہ اور ایک قوم کے ادب کی
دوسرے قوم پر اثر انداز ہونے کی دانتے کی ڈیوائن کامیڈی (طربیہ خداوندی) ہے
جس پر ابوالعلائیوں کی کامیڈی رسالۃ الغفران کے اثرات واضح ہیں۔ دراصل
اٹلی نے سب سے پہلے عربوں کے اثرات قبول کیے وہاں عربوں کے طرز پر
یونیورسٹیاں اور درسگاہیں قایم کی گئیں اور عربی کتابوں کے ترجمے وہاں پہنچے۔
س خیال کو تقویت اس امر سے ملتی ہے کہ عیسائیت میں جنت و دوزخ کا تصور
تو ہے مگر "اعراف" کا عقیدہ صرف مسلمانوں میں پایا ہے اسلام میں اور خود
قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اعراف میں ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے ساتھیوں کو
بیچ میں گے۔ دانتے نے اپنی کتاب میں اعراف دکھایا ہے جو رسالۃ الغفران کا اثر ہے۔

ابن المعتز عباسی نے کتاب البدیع تصنیف کی، جس میں اس نے ارسطو کی کتاب الخطابت سے مواد اخذ کیا۔ اسی طرح خواجہ بن جعفر نے اپنی کتاب نقدالشعر میں کافی اخذ و استفادہ ارسطو کی کتاب الشعر سے کیا ہے۔ کتاب البیان کے اسحاق بن ابراہیم کاتب نے نقدالنثر میں، ... ... کی عہد وسطیٰ کی تصانیف یونانی، ہندستانی اور فارسی اثرات سے ... ہیں۔ بیشتر ایرانی بادشاہوں کے عربوں میں رائج ہوگئے۔ تقابلی مطالعہ کے لیے عصر عباسی کی تصانیف میں بہت کچھ مواد ہم کو نظر آتا ہے۔

ایمون کحان اپنی کتاب الادب المقارن (تقابلی ادب) کے (صفحہ ۱۸) پر لکھتے ہیں کہ عربوں کے توجہ دلانے سے یورپ والوں نے یونانیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کے ترجمے لاطینی زبان میں گئے جس سے یورپ میں موجودہ ترقی ہوئی اور انقلاب آیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ یورپ کی ساری ترقی اور یونانی اور لاطینی کی دین ہے۔ عربوں نے صرف ان کو اسی طرف توجہ دلائی یہ ایک بڑا تہذیبی اور تاریخی فریب ہے کہ عربوں کے اس عظیم تہذیبی اور تعلیمی انقلاب کو یونان کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ حق تو یہ ہے کہ خود فرانسیسی اور انگریز مصنفین کے بیان کے مطابق یورپ میں تہذیب و تمدن عربوں نے پھیلایا ہے۔ ۵۰۰ برس تک عربی کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں ہوئے ہیں عربوں کی کتابیں ۴۰۰ یا ۵۰۰ برس تک یورپ کے نصاب میں داخل رہی ہیں سب سے پہلے اٹلی نے عربوں کے انداز پر یونیورسٹیاں اور درسگاہیں قائم کیں۔ عرب مصنفین کو اسی طرح سند تصور کیا جاتا تھا جیسے آج ہم یورپ کے علما کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ یورپ سے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے اندلس آتے اور قرطبہ اور اشبیلیہ کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لطف تو یہ ہے کہ بعض ایسی یونانی کتابیں ہیں جن کی اصل دنیا سے فنا ہو گئی اور ان کا علم دنیا کو صرف عربی ترجمے سے ہوا۔ عربوں نے یونانی علم پر اضافہ کیا

نھوں نے ان کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ یہی نہیں اہل یونان نظریات [illegible]

تھے مگر انھوں نے ان نظریات کو تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر [illegible]

عربوں نے تجربہ گاہیں قائم کیں اور نئے نئے تجربے کرکے سائنس کی بنیاد [illegible]

یہی حال دوسرے علوم و فنون کا ہے خصوصاً طب، حساب اور علم النجوم میں

انھوں نے دنیا کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ یہ سب محض علمی لین دین اور

اخذ و استفادے کے ذریعہ ممکن ہو سکا۔ اس بنا پر یہ نظریہ قائم کرنا کہ یونانی علوم

سے یورپ میں نشاۃ ثانیہ پیدا ہوئی، حقائق پر پردہ ڈالنا ہے۔ عربوں کے علوم

نے جدید سائنسی ترقی کی بنیاد رکھی جس کی طرف مولانا الطاف حسین حالی نے

مسدس میں اشارہ کیا ہے کہ:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

عربوں کے علوم صلیبی جنگوں سے نہیں بلکہ اندلس کے ذریعہ یورپ میں پہلے عربوں کی سب سے بڑی دین تجرباتی طریقہ ہے (EXPERIMENTAL METHOD)

سترہویں صدی عیسوی میں ادبی اقدار کا چرچا بڑھا۔ ادبی تنقید کے حدود متعین کیے گئے مگر ان اصول و قواعد میں محاکات (IMITATION) کا خیال رکھا گیا جو دراصل ارسطو کا نظریہ تھا۔ کلاسکیت کی روشنی سب سے پہلے فرانس میں پھیلی۔ چودہویں لوئی کے دربار سے اور پھر اس کی چنگاریاں سارے یورپ میں پھیل گئیں۔ کلاسکیت کے بعد ہی ایک لہر ادبی حلقوں میں بین الاقوامیت (COSMOPOLITISM) کی اٹھی۔ فرانس میں یہ شوق عام ہونے لگا کہ وہ دوسری قوموں کے ادب سے واقفیت حاصل کریں۔ چنانچہ لوگوں نے انگریزی اور جرمن ادب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ فرانس میں جامع علما پیدا ہوئے اور علم ادب کا چرچا عام ہوا۔ ایسے علما جو جامع العلوم (ENCYCLOPAEDIC) کہلاتے تھے اور وہی درحقیقت سبب بنے انقلاب فرانس کا جس نے سارے یورپ میں انقلاب کی لہر دوڑا

دی گئی اور ان کا حسن پرکھا گیا

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تقابلی ادب کب سے شروع ہوا؟ مگر پھر اس کے آثار پہلے سے تھے مگر اس علم کا نام صحیح وقت سے ۱۸۳۰ء سے سامنے آنے لگا۔ اس سے پہلے انگریزوں نے فرانسیسیوں اور جرمنوں اور اہلِ اطالیہ نے ایک دوسرے کے ادب کا مطالعہ شروع کر دیا اور ان کے مفکرین کے خیالات عام ہونے لگے نیوٹن اور لاک کے خیالات کے اثرات پہنچنے لگے انگریزی شاعری نے فرانس پر جادو کا اثر کیا۔ وات، قبر اور غم پر پر تاثیر نظموں نے دلوں کو متاثر کیا اسی دوران والٹیر نے شیکسپیئر کے ادب کا مطالعہ کیا اور اس کی عظمت تسلیم کی۔ دیدرو (DIDEROT) نے تو صاف اعلان کیا کہ "شیکسپیئر کی شخصیت بلند و بالا ہے اور ہم سب بونے ہیں جو اس کی پنڈلیوں تک ہی پہنچ سکتے ہیں"۔

فرانس میں انیسویں صدی میں بنیادی تغیرات واقع ہوئے۔ پروفیسر پال ہزرڈ (PAUL HAZARD) نے اپنی کتاب تقابلی ادب میں لکھا ہے کہ فرانس نے انگریزی اور جرمن ادب کا مطالعہ کر کے اس سے اپنا فکری و ادبی اُفق روشن کر لیا ہے اور اس میں وسعت و عظمت پیدا کر لی ہے۔

سترہویں صدی کے ادبا اور نقاد، ادب کے قواعد اور خصوصاً جمالِ مطلق یا حسنِ محض پر راضی ہو گئے مگر انیسویں صدی کے ادیبوں نے اس سے تجاوز کیا بلکہ ان پیمانوں سے بغاوت کی جو جمالیات اور ادب کے بارے میں گزشتہ دو صدیوں میں قایم کیے گئے تھے۔ انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ حسن مطلق نہیں ہوتا اس کی شکلیں بدلتی ہیں وہ عرفان و مکان، جنس و نسل، عادات و اطوار سے متاثر ہوتا ہے اور رسم و رواج کے اثرات بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ جمال کی سمت و کیفیت اور خصائص و ذوق کے بارے میں مسائل سامنے آنے۔ اس سلسلے میں ہر قوم اور ملک کے جمالیاتی پیمانے بدل جاتے ہیں۔ خود یورپ کے شمالی اور جنوبی ممالک میں بڑا فرق ہے۔ جنوبی یورپ کلاسکی ادب کا گہوارہ بن گیا مگر

شمالی یورپ نے اس سے آزادی حاصل کرلی تھی اور رومانی تحریک چلائی۔ رومانی تحریک نے تقابلی ادب کو ترقی دی۔ اس نے ان روایات کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا جو دو ہزار برس سے قائم تھے۔ اس نے ادب کو انفرادی جوش و جذبہ، انفرادی زندگی، مذاق و مزاج کا ترجمان قرار دیا۔ انسان کے شخصی رنج و غم، خوشی اور نارسائیوں کی ترجمانی کو اصل قرار دیا گیا۔ رومانی ناقدوں نے بھی ادبی تنقید و تحلیل کی توسیع کی۔ انھوں نے زبان و مکان، جنس و نسل اور معاشرے کو تنقید میں اہمیت عطا کی۔ ان تمام عناصر نے ادب کو مقامیت سے نکال کر آفاقیت کی راہ دکھائی۔ اس آفاقی اور بین الاقوامی مطالعہ کے داعی اور اساطین ادبا میں گیولام (GUILLAUME)، شلیگل (SCHLEGEL)، مادام ڈی اسٹیل (DE - STAEL) اور ان کے احباب ہیں جو قصر کاپٹ (COPPET) میں جمع ہوتے تھے اور ادبی بحثیں کرتے تھے جینیوا شہر میں۔

خاص طور سے مادام ڈی اسٹیل وسیع معلومات، غیر ملکی زبانوں پر قدرت اور جرمن ادب کے بارے میں وہ اختصاصی مطالعہ کا امتیاز رکھتی تھیں۔ انھوں نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی جو غیر ملکی زبانوں اور ان کے ادب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی جانب سے بے پروائی برتتے ہیں۔ انھوں نے غیر ملکی ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا تاکہ وہ دوسرے ادب کو اصل زبانوں میں پڑھیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ ڈی اسٹیل نے تقابلی مطالعہ کر کے دو زبانوں کے ادب کے امتیازات واضح کیے، عام اصول بھی بیان کیے جو دوسرے ادب پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔ انھوں نے فرانسیسی ادب کا اس کے پڑوسی ملکوں کے ادب سے موازنہ کیا، اغراض و محرکات سے بحث کی۔ ڈی اسٹیل نے جرمن زبان کے متعلق ایک کتاب DE L'ALLEMAGNE ۱۸۱۰ء میں شائع کی مگر حکومت نے اس پر پابندی لگا دی اور وہ ۱۸۱۳ء میں لوگوں تک پہنچ سکی۔ اس کتاب نے تقابلی مطالعہ کو پروان چڑھانے میں بنیادی کام کیا۔ انھوں نے اس کتاب میں نقطہ نظر

پھر یکھیے انھوں نے جرمن ادب سے اخذ کیے تھے۔ انھوں نے جرمن طرزِ فکر اور نظریات کا اور فرانسیسی انداز نظر اور ادبی تحریروں سے کیا تھا دونوں قوموں کی زندگی، معاشرت، زبان و ادب کا انھوں نے عمدہ تقابلی مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان امور کا تعلق درحقیقت سیاسی حوادث، نظام حکومت، زبان و سماج کے عوامل سے ہوتا ہے۔ ادب ان سب سے متاثر ہوتا ہے۔ آفاقی انداز انسان کی زندگی میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ دوسروں کے ذہنی سرمایے سے ہم مستفید ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ادب او ذہنی سرمایہ درحقیقت ساری انسانیت کی مشترک میراث ہے۔

تقابلی ادب اپنے اصطلاحی معنی میں انیسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں ظاہر ہوا۔ جس طرح سائنس میں حیوانات اور نباتات کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کے تقابلی مطالعے سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اسی طرح دوسرے ادب کے اقدار کو پیش نظر رکھ کر کے نتائج اخذ کیے جائیں تو زیادہ وسیع النظری اور عظمت پیدا ہو سکے گی۔ ادب اسی طرح بنتا ہے، بڑھتا ہے۔ اگر دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن کا احساس عام حالات میں کسی کو نہیں ہو سکتا۔

جین جاک امپیر (JEANJACQUES EMPERE) نے "تمام قوموں کے درمیان فنون و آداب کا تقابلی مطالعہ" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے بعد ایک دوسرے ناقد ویلیمن (VILLEMAIN) نے ادبی تقابلی مطالعہ کے میدان میں علمی طریقہ اختیار کیا اور ۱۸۲۸ء میں تقابلی مطالعہ کے موضوع پر خطبات دیے۔ کتاب میں دراصل علمی عظمت ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ان افکار کا جائزہ لیا ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچے اور وہاں انھوں نے ادب کو متاثر کیا۔ تاثر کی مختلف شکلوں کا اس نے باقاعدہ جائزہ پیش کیا ہے۔

اس دور میں عام طریقہ یہ تھا کہ فرانس سے باہر جو الفاظ رائج تھے ان کا تقابلہ

فرانس کے متعدد افکار و الفاظ سے کیا جاتا تھا فرض کیجیے کہ ایک لفظ [illegible]
رائج ہے مگر وہ غیر ملکی زبان سے مستعار ہے اس کا مطالعہ بڑی دلچسپی کے ساتھ
سے کیا جاتا تھا یہی حال افکار کا بھی تھا لیکن تقابلی مطالعہ فوراً ایک الگ شاخ
کے الگ ہو گیا۔ اس نئے مضمون نے کس طرح ترقی کے مراحل طے کیے اور کس طرح
خود ایک علم بن گیا اس کی داستان مندرجہ تصانیف کے ذکر سے اختصار کے
ساتھ ذیل میں بیان کی جا رہی ہے۔

پوسنٹ (POSNETT) نے ۱۸۸۶ء میں اپنی کتاب تقابلی مطالعہ MPARATIVE
LITERATURE شائع کی۔ ایڈورڈ راڈ EDOURD ROD نے تقابلی ادب کے بارے میں
لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ابھی سال نہیں گزرا تھا کہ (MAX KOCH) میکس کوچ
نے ایک رسالہ تقابلی مطالعہ کے نام سے شائع کرنا شروع کر دیا۔ جوزف ٹیکسٹ
(JOSEPH TEXTE) نے ۱۸۹۵ء میں اپنا مقالہ روسو اور ادب کے عالمی مصادر
کے بارے میں پیش کیا اور روسو کی شخصیت کو تقابلی مطالعہ کے تناظر میں
بیسر و بالڈنسبرگر (BETZET ET BALDENS PERGER) نے تقابلی ادب
بیلوگرافی تیار کی ۱۹۰۴ء تک کی۔ اس میں چھ ہزار تصانیف کا ذکر ہے جو تقابلی
ادب کے موضوع پر تصنیف کی گئی ہیں۔ بل دنسبرگر اور پال ہزرڈ کو تقابلی
مطالعے کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں نے
مل کر فرانسیسی میں ایک رسالہ "تقابلی مطالعہ" شائع کیا۔ اول الذکر کی
کا دائرہ نصف صدی پر محیط ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے وقفے میں
تقابلی مطالعہ کے میدان میں سب سے زیادہ اہم کام فرانس میں ہوا اور اس
نے اپنی امامت و اہمیت قائم رکھی لیکن بعد میں یہ علم رفتہ رفتہ برطانیہ، جرمنی
اور امریکہ میں بھی پھیلنے لگا خصوصاً جرمنی میں اس نے غیر معمولی اہمیت حاصل
کر لی اور وہاں اس میدان میں کورٹ ویس (KURTWOIS) کی شخصیت ابھر کے
سامنے آئی۔ اگرچہ پہلے سوویت یونین بھی اس طرز کے مطالعہ کو بورژوائی

یورپ اور امریکہ میں بھی اسی جانب توجہ کی جا رہی ہے جاپان میں اس میدان میں کافی پیش رفت ہو رہی ہے۔ حق یہ ہے کہ اب دنیا کے اہم ملکوں اور یونیورسٹیوں میں تقابلی مطالعہ کے شعبے قائم ہو چکے ہیں انفرادی طور پر بھی زبانوں کے شعبے اس موضوع پر کام کرتے رہتے ہیں۔

مصادر و مآخذ۔

۱۔ الادب المقارن از ایمون طمان دار الکتب اللبنانی، بیروت ۱۹۶۲ء (بنیادی مآخذ)

۲۔ حدیث الاربعاء (۳ حصے) از طٰہٰ حسین قاہرہ

۳۔ تمدن عرب از موسیو لیبان

۴۔ الموازنۃ بن ابی تمام والبحتری از بشر بن حسن

۵۔ الموازنۃ از زکی مبارک



اس سہ ماہی کی منتخب تصویر

[illegible]

زندگی

ڈاکٹر مصطفیٰ کریم

ہماری زمین جس پر ہم چلتے پھرتے ہیں اربوں سال کے ارتقا کے بعد وجود میں آئی ہے۔ اور اس ارتقا کا آغاز احتمالی گرم فونان کے ظہار سے ہوا۔ فونان کی طبعی خصوصیتوں نیز اردگرد کائنات میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کی وجہ سے اور خود زمین کے طبعی اعمال سے آخر کار زمین کی وہ شکل نمایاں ہو گئی جسے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی قارئین واقف ہو چکے ہوں گے کہ زمین میں تبدیلیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

زندگی کیا ہے اور اس کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس نکتے کی وضاحت سے پہلے یہ جاننا مناسب ہوگا کہ زندگی کی ابتدا سے پہلے کرۂ ارض کی شکل کیا تھی؟ مختصراً یہاں مجمر ٹیلے (جن پر پہاڑ بھی تھے) جہاں مسلسل بجلیاں گر رہی تھیں اور ساتھ ہی میٹیورائٹ بھی اور سمندر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اہم نکتہ یہ ہے کہ سمندر کے پانی اور زمین اور اس کے اوپر جو فضا تھی اس میں وہ تمام عناصر موجود تھے جنہوں نے آخر کار زندگی تخلیق کی۔ ان عناصر میں اہم حسب ذیل کو قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ زندگی کا آغاز ان ہی سے ہوا۔ کاربن، آکسیجن، نائیٹروجن، ہائیڈروجن، فاسفورس۔

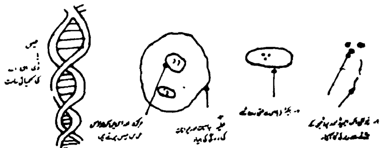
ارتقاء کے اصول کے تحت جوں جوں زندگی پیچیدہ ہوتی چلی گئی، دیگر عناصر بھی ذی روح اشیاء میں شامل ہو گئے یا شامل کر لیے گئے۔

زندگی کیا ہے؟

اس کا جواب ہر شخص کے لیے کسی حد تک آسان ہے۔ ہر وہ شے جو متحرک ہے، کھاتی پیتی ہے، افزائش نسل کرتی ہے اسے زندہ شے تسلیم کر لینا چاہئے۔ لیکن حرکت کا ان میں ہی ہے۔ دلیل

کے اندر میں کوئلہ یا تیل ڈال دیا جاتا ہے تو وہ چل پڑتے ہیں۔ پھر بھی ہم انہیں زندہ شئے نہیں کہیں گے۔ ایسے کئی بیج موجود ہیں جو سینکڑوں سال تک مناسب ماحول کے نہ ہونے کی وجہ سے پھلتے پھولتے نہیں ہیں اور جب انہیں مناسب ماحول مل جاتا ہے تو وہ پھلنے پھولنے لگ جاتے ہیں۔ اس لیئے ان بیجوں کو بے جان نہیں کہا جاسکتا۔ تمام حیوانات فضاء سے آکسیجن لیتے ہیں اور اسے اپنی نشوونما میں استعمال کرنے کے بعد اس آکسیجن کو کاربن ڈائی آکسائیڈ کی شکل میں اپنے جسم سے مثلاً سوڈیم، پوٹاشیم، کلورین، کیلشیم وغیرہ خارج کردیتے ہیں۔ اسی طرح جب آگ جلتی ہے تو اس کے جلنے کا انحصار فضاء کی آکسیجن گیس پر ہے۔ جسے آگ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی شکل میں تبدیل کرنے کے بعد دھواں بنا کر خارج کردیتی ہے۔ لیکن آگ کو زندہ شئے نہیں تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ روبوٹ گذشتہ تین دہائیوں کی مشہور و معروف ایجاد ہے اور اب تو جاپان کے بعض تجارتی اداروں میں روبوٹس کو انسانی شکل میں ڈھال کر بہت سارے کام لیئے جاتے ہیں۔ ان روبوٹس میں کمپیوٹر کی طرح ہدایتیں جمع کردی جاتی ہیں اور یہ روبوٹس انسانوں کی طرح مختلف کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی انہیں حیوانوں یا نباتات کی صفوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ یہ روبوٹس نہ تو افزائش نسل کرسکتے ہیں اور نہ ہی یہ آکسیجن یا کاربن ڈائی آکسائیڈ گیسوں کا استعمال اپنی نشوونما کے لیئے کرسکتے ہیں۔

ہر زندہ شئے کی بنیادی ساخت خلیہ ہے۔ اس کی ساخت اور دیگر خصوصیتوں کی تشریح بعد میں کی جائے گی۔ یہاں پر اتنا لکھنا مناسب ہوگا کہ اس خلیے کے مرکزے میں جو کروموسومس اور ان کے اندر جو جینس ہیں وہی دراصل زندگی کی حقیقتیں ہیں یا زندگی انہی سے معنون ہے۔



اربوں سال میں زندگی کا ارتقاء

خلیے کی ساری کارگزاریوں کا راز اور اس خلیے کے ارتقاء کی نشاندہی ان ہی جینس میں موجود

ہے۔ ان جینز میں وہ ساری اطلاعات موجود ہیں جن کے تحت خلیے کو زندگی گزارنی ہے۔ جینز کی عظیم ترین خوبی یہ ہے کہ جب ایک خلیے سے دوسرا خلیہ بنتا ہے تو یہ جینز بالکل ویسی نقل اختیار کر لیتی ہیں جو پہلے خلیے میں تھی اور ان جینز میں وہ ساری اطلاعات بھی ہوتی ہیں جو خلیے کی ساخت اور کارگزاریوں کو پیچیدہ اور ترقی پذیر رکھتی ہیں۔ مختصراً جینز سے زندگی عبارت ہے۔

زندگی کا آغاز

سائنٹیفک تحقیق کے مطابق کرۂ ارض پر زندگی کی اولین نمود تین یا چار ارب سالوں کے درمیان ہوئی' اور اس زندگی کے نقوش قدیم چٹانوں پر مرتسم ہیں۔ ان نقوش کو فوسلس کہا جاتا ہے۔ ان فوسلس (FOSSILS) کا حجم' بیکٹریا یا وہ مخلوقات جن کی ساخت صرف ایک خلیے سے ہوتی ہے' کے برابر تھا۔ زندگی کے یہ آثار ان چٹانوں پر پائے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور تھیں اور اربوں سال پہلے زیر آب تھیں۔ قارئین کا یہ سوچنا درست ہوگا کہ ان نقوش کو فوسلس کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ عین ممکن ہے یہ نشانات طوفانی ہوا یا پانی یا خود چٹانوں کے اندر جو طبعی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کی وجہ سے بن گئے ہوں۔

فوسلس کا مطالعہ ایک وسیع و عریض مضمون ہے۔ اور اس مضمون کے ماہر یہ بتا سکتے ہیں کہ چٹانوں پر یہ نشانات باحیات شئے کی خورد و نوش سے عمل میں آئے ہیں۔ ان فوسلس کو اسٹرومیٹو لائٹ (STROMATOLITE) کہا جاتا ہے۔ کچھ کی شکلیں نیچے دی ہوئی ہیں۔

[illegible]

[illegible]

اگر زندگی آج سے اربوں سال پہلے وجود میں آئی تو اس ابتداء کی بابت مفروضے ہی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان مفروضوں میں کسے صحیح کہا جا سکتا ہے یہ بھی سو فیصد ممکن نہیں۔ سائنٹیفک تحقیق کا ایک کام امکانات کا اظہار بھی ہے اور زندگی کے آغاز کے معاملے میں سائنس بس اسی قدر کر سکتی ہے۔ زندگی کی ابتداء کی بابت جو مفروضے مقبول رہے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

ا۔ زندگی کی ابتداء کسی مابعد الطبیعاتی طاقت کے حکم سے وجود میں آئی۔

کی ہے کہ تقریباً دو ہزار سال پہلے انسان اپنے ارتقائی عمل میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک اس کے افکار پر یہی سوچ طاری رہی ہے۔ زندگی کو کسی ماورائی طاقت یا خالق نے اس پر نازل یا تیار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی سمجھ یورپ میں انیسویں صدی کی پہلی دہائی تک تعلیم یافتہ طبقے کی فکری کائنات پر بھی طاری تھی۔ انسان کے فکری ارتقاء کا سب سے بڑا راز یہ ہے وہ موجود تصورات اور نظریات کی صداقت پر برابر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔

جو مفروضہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی حقیقت پر آج سے دو ہزار سال پہلے ارسطو نے غور کرنا شروع کیا تھا۔ یہ مسئلہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا کہ ایک انڈے سے ایک چوزہ کس طرح بن جاتا ہے۔ اس طرح کی سوچ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انڈے کے اندر ایک طاقت یا ایڈوس (EIDOS) موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے انڈے سے چوزہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ دراصل ارسطو کا ایڈوس (EIDOS) کا تصور آج کی جینز کی حقیقت سے مختلف نہیں تھا۔ ارسطو کے اس نظریہ کو ارتقاء کے اصولوں کا آغاز کہنا غلط نہیں ہوگا۔ اس بحث پر مزید روشنی بعد میں ڈالی جائے گی۔ سردست اتنا کہنا کافی ہے کہ انیسویں صدی میں لیمارک اور ڈارون نے اپنے اعلیٰ مشاہدوں کے بعد جو مضامین شائع کیے ان کی وجہ سے نباتات اور حیوانات کے ارتقاء کا نظریہ مقبول ہوا اور بہت بڑی حد تک قبول کر لیا گیا۔ اس وجہ سے ما بعد الطبیعیاتی طاقتوں کو زندگی کا خالق کہنا اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اس تصور کو مزید صدمہ انواع و اقسام کی فوسلس کی یافت اور شناخت سے ہوا جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس زمین پر کئی بار ایسی بلائیں آئیں کہ بیشتر زندہ اشیاء فنا ہو گئیں۔

اس لیے اگر کوئی ماورائی طاقت زندگی تخلیق کر رہی تھی تو اپنی مخلوق کو اس طرح اچانک فنا کر دینا بے معنی تھا۔

۲۔ زندگی کی تخلیق بے جان شئے سے برابر ہوتی رہتی ہے۔

یہ مفروضہ بھی کافی مقبول تھا اور اس کے ثبوت میں سڑے گوشت پر رینگتے ہوئے کیڑوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ یا اس قسم کی کسی اور واردات کو اس مفروضے کی صداقت میں پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط میں ایک فرانسیسی سائنس داں لوئی پاسچر نے یہ ثابت کر دیا کہ گوشت میں چونکہ مکھیاں انڈے دیتی ہیں اس لیے ان انڈوں سے نکلے کیڑے گوشت پر رینگتے نظر آتے ہیں اور اگر گوشت کو جالی سے اس طرح ڈھک دیا جائے کہ اس پر مکھیاں نہ بیٹھیں تو گوشت میں کیڑے نظر نہیں آئیں گے۔ لوئی پاسچر نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ فضا میں برابر جراثیم اڑتے رہتے ہیں اور کسی بھی سیال شئے کو ان سے محفوظ کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اس سیال شئے کو کس طرح سے ابالا

جائے۔ اس طرح زندگی کی تخلیق کا یہ نظریہ بھی باطل ہو گیا۔

۲۔ زندگی کے اجزاء خلا سے زمین پر آ کر گرتے رہے ہیں۔ جن سے یہاں زندگی تخلیق ہوئی۔

اس نظریہ کو سویڈش سائنسدان آر ہینس (ARRHENIUS) نے اس صدی کی پہلی دہائی میں پیش کیا تھا۔ اس کا تصور یہ تھا کہ خورد ترین اجزاء جن میں کاربن اور نائٹروجن شامل ہیں وہ خلاء سے زمین پر آ کر گرے اور ان سے زندگی وجود میں آئی۔ لیکن اس مفروضے کو سائنس دانوں نے جلد ہی رد کر دیا۔ خلا میں اشعاعی اور الٹرا وائیلٹ شعاعیں اس قدر تیز ہیں کہ زندگی کے ان اجزاء کا زندہ رہ جانا ممکن نہیں تھا۔ اس تسلیم شدہ حقیقت نے آر ہینس کے نظریہ۔ آغاز زندگی کو رد کر دیا۔

۳۔ زندگی کی نمود اس زمین پر کیمیائی تبدیلیوں کی وجہ سے ہوئی۔ اور تبدیلیاں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں۔

اس نظریہ کو ایک برٹش سائنس داں ہالڈین (HALDANE) اور ایک روسی سائنس داں اوپارن (OPARIN) نے ۱۹۲۰ء میں پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کے تحت یہ بتایا گیا کہ آج سے اربوں سال پہلے زمین اور اس کے اوپر فضاء بہت ہی مختلف تھی۔ فضاء میں اس وقت بجائے آکسیجن کے ہائیڈروجن گیس کی کثرت تھی۔ اور زمین، سمندر اور فضا میں ہائیڈروجن گیس نے دیگر عناصر کے ساتھ کچھ مرکبات بنا رکھے تھے (مثلاً میتھین، امونیا، پانی، فور ملڈ ہائڈ۔ ان پر بجلی اور الٹراوائیلٹ کرنوں کے اثر سے امینو اسڈ (AMINO ACID) بننا شروع ہو گیا۔

اسی امینو اسڈ (AMINO ACID) سے پروٹین بنا۔ جس نے نیوکلی اک اسڈ (NUCLEIC ACID) کے ساتھ مل کر نیوکلیو پروٹین بنایا۔ اس طرح جینس وجود میں آگئے۔ یعنی نیوکلیو پروٹین، جینس تھے۔ جنہوں نے نہ صرف یہ کہ خود تعمیری (REPLICATION) شروع کی بلکہ ماحول کے زیر اثر نئی نئی اطلاعات بھی جمع کرنی شروع کر دیں اور اس طرح زمین پر زندگی کا آغاز ہوا۔

اس نظریہ کو بہت بڑی تقویت ۱۹۵۳ء میں ہوئی، جب کہ مولر (MULLER) اور اورے (URED) نام کے دو امریکی سائنس دانوں نے اپنے کلوں میں امینو اسڈز بنا اور جلد ہی امینو اسڈ پروٹین بننے کے امکانات بھی واضح ہو گئے۔ اس کے علاوہ لیبوریٹری میں فور مل ڈیہائیڈ (FORMALDEHYDE) سے وہ اجزاء بھی بنا دیئے گئے جن سے نیوکلی اک اسڈ یا ڈی۔ این۔ اے (DEOXYRIBO NUCLEIC ACID) بنتا ہے۔ لیکن ابھی تک ڈی۔

این۔ اے کو پروٹین کے ساتھ جوڑ کر نیوکلیو پروٹین یا جینیں بنانا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن یہ تصور اب قبول ہو چکا ہے کہ اربوں سال پہلے ایسے کیمیائی حالات تھے جن کی وجہ سے جینیں بن گئے اور ان کی خود تعمیری (REPLICATION) اور خود تبدیلی (MUTATION) نے انہیں زندگی کے راز سے آگاہ کردیا۔

جینیں کی سب سے اہم کارروائی انزائمس (ENZYMES) کا بنانا تھا۔ ان ہی کے ذریعے جینیں زندگی کے کارخانے کو قائم رکھتے ہیں۔ انزائمس دراصل پروٹین کے خورد ترین ذرے ہیں۔ جن کی حفاظت کیمیائی طریقوں پر ممکن ہے۔ انزائمس کی تخلیق کے بعد انہیں ضائع ہونے سے بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا وہ یہ کہ کسی طرح جینیں اپنے گرد ایک حصار قائم کرلیں۔ اور اس طرح اولین خلیے کی بنیاد پڑی یا اس کی تخلیق ہوئی۔ اس خلیے میں مرکزہ نہیں تھا البتہ جینیں ضرور ہوتے تھے۔ آج کے بیکٹیریا اسی قدیم خلیے کی نسل ہیں۔ بیکٹیریا میں مرکزہ نہیں ہوتا۔ جینیں ضرور موجود ہوتے ہیں۔ قارئین پر یہ نکتہ واضح رہنا چاہیے کہ خلیے میں جینیں کی کیمیائی ساخت جس نیوکلیو پروٹین سے ہوتی ہے اس میں نیوکلک ایسڈ یا ڈی۔ این۔ اے میں خود تعمیری (REPLICATION) اور خود تبدیلی (MUTATION) کے اوصاف ہوتے ہیں پروٹین میں یہ وصف نہیں ہوتا۔

زمین پر کیمیائی اور طبعی تبدیلیوں کی وجہ سے جب زمین کے اوپر فضاء میں بجائے ہائیڈروجن کے آکسیجن گیس کی کثرت ہوگئی تو خلیے میں چند انقلابی تبدیلیاں ناگزیر ہوگئیں۔ ان کی وجہ سے جینیں نے ایسے انزائمس بنائے جنہوں نے جینیں کے گرد ایک حصار تعمیر کردیا اور اس طرح خلیے میں مرکزہ یا نیوکلیس (NUCLEUS) آگیا۔ اس حصار کی وجہ سے جینیں نے خود کو آکسیجن کی کثرت سے محفوظ کرلیا۔ چونکہ آکسیجن کی کثرت بعض اہم کیمیائی کارروائیوں کے لیے مضر ہوتی ہے۔ اس لیے مرکزہ کا خلیے میں نمودار ہونا زندگی کے ارتقاء میں ایک اہم منزل تھی۔

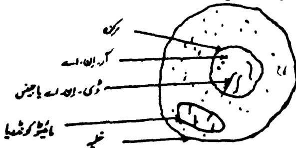
نیز خلیے میں انزائمس کی کیمیائی کارروائیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ آکسیجن کی اور وہ بھی ایک خاص مقدار میں ضرورت برابر رہتی تھی، اس لیے جینیں کی ہدایت کے تحت خلیے میں مائی ٹوکونڈریا (MITOCHONDRIA) نام کی شئے داخل کرلی گئی۔ یا جینیں کی ہدایت کے تحت خلیے میں وہ کیمیائی اور طبعی حالات پیدا کرلئے گئے جن کی وجہ سے خلیے میں مائی ٹوکونڈریا (MITOCHONDRIA) کا داخل ہوجانا لازمی ہوگیا۔ اور اس طرح مائی ٹوکونڈریا (MITOCHONDRIA) کی بقاء خلیے کی بقاء کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہوگئی۔

مائی ٹوکونڈریا بھی زندگی کی قدیم ترین اشیاء کی قسم میں سے ایک ہے۔ ان میں شق
پایا گیا ہے۔ نیز ان کی سب سے عجیب خوبی یہ ہے کہ ان میں خانے ہوتے ہیں جن میں آکسیجن کے
ذرے یا ایٹمس یا مولی کیولس (MOLECULES) جمع ہوتے ہیں اور خلیے کو جب بھی آکسیجن کی
ضرورت ہوتی ہے تو مائی ٹوکونڈریا انہیں ضرورت کے مطابق اپنی قید سے آزاد کر دیتے ہیں۔

خلیے کی ارتقاء میں ایک اور کارنامہ جینس نے انجام دیا۔ وہ یہ کہ انہوں نے ایک اور اہم نیوکلی
اک ایسڈ بنا ڈالا جسے آر۔ این۔ اے کہتے ہیں۔ آر۔ این۔ اے یا ربی یو نیوکلی اک ایسڈ
(RIBO NUCLEIC ACID) مرکزے میں موجود ہوتا ہے۔

اگر ڈی۔ این۔ اے خلیے میں وہ کتابت ہیں جس پر لاکھوں ہدایت نامے یا اطلاعات ثبت
ہیں جو تقریباً اسی حال میں اس مخصوص خلیے کی بیٹیوں کو پہنچ جاتی ہیں۔ تو آر۔ این۔ اے وہ خادم
ہیں جن کا کام ڈی۔ این۔ اے کی ہدایتوں کو مرکزے کے باہر خلیے میں پہنچانا ہوتا ہے تاکہ خلیے کے
اجزا اپنی کیمیائی منزلوں کو برابر طے کرتی رہیں۔ ان کی کارروائیوں میں کبھی خلل نہ ہو اور یہ
کارروائیاں یا تو کسی خاص منزل پر روک دی جائیں یا اس منزل سے آگے چلی جائیں۔ ارتقاء کی
بتدریج پیچیدگی کا راز یہی ہے۔

یوں تو خلیے میں اور بھی اہم اجزاء ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ان کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ یہاں
پر اتنا لکھنا مناسب ہو گا کہ خلیہ خواہ وہ نباتات کا ہو یا حیوانات کا اس میں وہی عناصر ہیں جو اس کرۂ
ارض پر یا اس کائنات میں ہیں۔



اربوں سال پہلے جب زندگی کی نمود ہو رہی تھی تو اس وقت فضا میں الٹرا وائیلٹ
(ULTRA VIOLET LIGHT) بہت تیز تھی۔ اس لیے خشک زمین پر اگر زندگی کی نمود
ہوئی بھی تو فوراً فنا ہو گئی ہو گی۔ لیکن وہ نمود جو پانی میں ہوئی اسے پانی نے الٹراوائیلٹ کے اثر سے
بچا لیا۔ یہ روشنی پانی میں جذب کر لی جاتی ہے اور دس بارہ گز سے نیچے نہیں جا سکتی۔ پانی میں جب

زندگی کی نشوونما کی توجیہ یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی شکل میں پانی میں ہوئی۔ ابتدائی کائنات میں فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کو اپنی نشوونما کے لیے لینا شروع کر دیا اور فضا میں آکسیجن گیس کا اخراج کرنے لگے۔ جلد ہی آکسیجن گیس کی اتنی کثرت ہو گئی کہ حیوانی زندگی کا آغاز ممکن ہو گیا۔ کیونکہ اس زندگی کا انحصار آکسیجن گیس کے استعمال پر ہے۔ آکسیجن سے فضا میں اوزون (OZONE) گیس بنی جو الٹرا وائیلٹ شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے۔ اس طرح ان شعاعوں کا مضر اثر حیوانوں پر ختم ہو گیا۔

یہ ظاہراً عجیب سا تصور ہے کہ آج کا انسان کروڑوں خلیوں کا بنا ہوا ہے۔ لیکن ہم اگر یہ سوچیں کہ یہ انسان ان ہی اجزاء سے تعمیر ہوا ہے جو اس کائنات میں ہیں اور ساتھ ہی وہ اس کائنات کو کسی حد تک سمجھنے اور تسخیر کرنے کا اعجاز بھی رکھتا ہے تو ہمیں انسان کو اس سرزمین پر عظیم ترین مان لینے میں جھجک نہیں ہوتی۔ وہ اس کائنات کی اہم ترین کڑی ہے اور ساتھ ہی اس جہاں کا سب سے ترقی یافتہ جزو۔

اب انسان اگر بے شمار خلیوں کا مرکب ہے تو اس کے جسم کا کوئی بھی خلیہ کیا ان خلیوں سے مختلف ہے جو نباتات یا دیگر حیوانات کے جسم میں ہیں؟ اس کا جواب ہے نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نباتات کے خلیوں میں بجائے مائی ٹوکونڈریا کے کلوروپلاسٹ (CHLOROPLAST) ہوتے ہیں جن کا کام کاربن ڈائی آکسائیڈ کو استعمال کرنے کے بعد آکسیجن کا اخراج ہوتا ہے۔

جس طرح دو جڑواں بھائیوں کو ہم شکل پانے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے کہ یہ دونوں بھائی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اس طرح تمام خلیوں کی بنیادی ساخت ایک سی ہونے کی وجہ سے یہی قوی امکان ہے کہ زندگی کی ابتداء ایک خلیے ہی سے ہوئی ہے۔ اور اب یہ سوچنا درست ہوگا کہ دور ارتقاء میں ایک خلیے سے مرکب خلیوں کے اجسام کیسے بنے۔ اس کا ثبوت آج بھی ایک خاص قسم کی کائی میں ملتا ہے جسے سلائیم مولڈ (SLIMEMOULD) کہتے ہیں۔ اس کی زندگی کا آغاز ایک خلیے سے ہوتا ہے۔ یہ کئی خلیوں سے مل کر ایک جسم بنا لیتی ہے۔ اس کا ایک ننھا سا تنا بھی ہوتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد اس کے سرے پر پودوں جیسے بیج بھی نکل آتے ہیں اور جب یہ بیج ٹوٹ کر الگ ہوتے ہیں تو دوبارہ سلائیم مولڈ کی زندگی ایک خلیے سے شروع ہوتی ہے۔

جینز کے تذکرے کے دوران خود تبدیلی (MUTATION) کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ خود تبدیلیاں (MUTATION) بدلتے ہوئے ماحول میں لازمی تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو زندگی کے آثار مٹ کر دوبارہ نمودار نہ ہوتے۔ جب بھی دنیا پر ماضی میں ہلاکت آئی تو بعض زندہ اشیاء کے

[illegible] (MUTATION) [illegible]

کل ہو گیا۔ اسی طرح زندگی جاری و ساری رہی۔ کئی دفعہ قدرتی نظام کو زندگی کا تحفہ ملا ہے
اس میں خود تبدیلی (MUTATION) کو بھی دخل رہا ہے۔ تحقیق یہ دلچسپ معلومات کم کہاں
ہے اور یہ تصور درست ہے۔ کہ زندگی کی نو بغیر جنسی رشتے کے بھی ممکن ہے اور یہ وائرس میں
اور بیکٹیریا میں پائی جاتی ہے لیکن زندگی کی یہ رفتار گہری جنسی رشتوں سے ممکن ہو سکی ہے کیونکہ
اس طرح دو جاندار اشیاء کے جینز اپنی ساری اطلاعات کے ساتھ اس ایک زندہ شے میں جمع
ہو جاتی ہیں جو اس جنسی رشتے کے بعد وجود میں آتا ہے۔

اربوں سال کے ارتقاء کے بعد نباتات اور حیوانات میں حیرت ناک تغیر آ چکا ہے۔ اور آج کے
ماحول میں زندگی کی ان صلاحیتوں نے جس طور پر بقاء کا راز پالیا ہے وہ بھی کچھ کم حیرت ناک نہیں۔
اس سرزمین پر ایسے بیکٹیریا موجود ہیں جو کھولتے ہوئے پانی کے درجہ حرارت پر زندہ رہتے ہیں۔
اور کچھ ایسے بیکٹیریا بھی ہیں جو برف سے بھی خنک ماحول میں اپنی نشوونما جاری رکھتے ہیں۔ بعض
ایسے کیڑے اس جہاں میں موجود ہیں جنہیں اگر پانی نہ مہیا کیا جائے تو وہ خشک ضرور ہو جاتے ہیں
اور یہی شبہ ہوتا ہے کہ ان میں جان نہیں رہی لیکن اس حالت میں اگر انہیں کھولتے ہوئے پانی یا
برف جیسے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا جائے تو اس کے بعد بھی وہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ کائی کے بارے
میں قارئین کو علم ہوگا کہ یہ نم جگہوں پر اگتی ہے۔ لیکن اسپینش موس
(SPANISH MOSS) نام کی کائی بجلی کے تاروں پر پائی گئی ہے۔ جہاں وہ پانی ہوا سے
حاصل کرتی ہے۔

بعض چڑیاں ۲۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اڑتی ہوئی پائی گئی ہیں اور بعض مچھلیاں اپنی زندگی سمندر
کی تہ میں کاٹ دیتی ہیں حالانکہ وہاں روشنی نہیں پہنچ سکتی اور فضا کا دباؤ اتنا ہوتا ہے کہ زندہ رہنے
کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح زندہ اشیاء کے قد و قامت میں بھی بے انتہا عجیب پن ہے۔
سیدو نوموناس نام کا بیکٹیریا ایک مائیکرو میٹر کا صرف ایک دہائی ہوتا ہے۔ جسے صرف الیکٹرونک
مائیکرواسکوپ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ایسے بھی درخت دنیا میں موجود ہیں جو تین سو فٹ لمبے
ہوتے ہیں۔

"ارتقاء" کراچی کے شکریے کے ساتھ

مطبوعات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

شاعری

نسخہ ہائے وفا (کلیات) — فیض احمد فیض [illegible]
عہدِ دو نیم — افتخار عارف ۴۰/-
شوخیٔ تحریر (مزاحیہ کلام) — سید محمد جعفری ۷۵/-
غبارِ ناتواں — مظفر شکوہ ۳۰/-
شاخِ سحر — حمیدہ شہود ۷۵/-
مشعلِ جاں — مجموعہ سلطانہ مہر ۸۰/-
سخن راز (منتخب فارسی اشعار مع اردو ترجمہ)
(ضیاء احمد بدایونی) ۱۰۰/-
صلاح الدین پرویز کے خطوط صلاح الدین پرویز کے
کمیشن • • ۶۰/-
سبھی رنگ کے ساون (۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک
کی تخلیقات کا مجموعہ) صلاح الدین پرویز (زیرِ طبع)
تازہ ہوا — باقر نقوی (انگلینڈ) ۷۵/-
غالب کی رہگذر
(غالب کی زمینوں میں غزلیں) واجد سحری ۳۵/-
سنہری آنچ • ۳۰/-
جادۂ شوق — رادھا کرشن گوپال ۴۰/-
دلِ خاک بسر — شفق سوپوری ۵۰/-
مرا [illegible] — سیدہ عاشور کاظمی ۴۰/-
آبِ پیاس — فرید پربتی ۱۰۰/-
نقشِ حیات — ڈاکٹر مہندر ناتھ بسنت سرست (زیرِ طبع)
جدید اردو شاعری کا منتخب مجموعہ (انگریزی، اردو)
ترجمہ: بیدار بخت ۷۵/-
برج کومل کی منتخب نظموں کا مجموعہ (انگریزی، اردو)
ترجمہ: بیدار بخت ۴۰/-

سفرنامہ

سفر آشنا — گوپی چند نارنگ ۱۵/-
سرسید احمد خاں پنجاب میں — اقبال علی ۱۲۵/-

ناول اور افسانے

آگ کا دریا — قرۃ العین حیدر ۱۵۰/-
گردشِ رنگِ چمن • ۱۵۰/-
چاندنی بیگم • ۱۲۵/-
البم (یادیں) — ہرچرن چاولہ ۷۵/-
آتے جاتے موسموں کا سچ • ۹۰/-
ناروے کے بہترین افسانے • ۶۰/-
مارگوئی — سُریندر پرکاش ۷۵/-
پہلی نسل کا گناہ — سعید صدیقی ۷۵/-
آئیڈینٹٹی کارڈ — صلاح الدین پرویز ۸۰/-
وہی قتل بھی کرے ہے — سید مہدی رضوی ۷۵/-
میرا شہر ادھورا سا — کشمیری لال ذاکر ۱۲۵/-
آدھے چاند کی رات • ۷۵/-
ٹھکانہ — حیات اللہ انصاری ۶۰/-
خوب رو — جوگندر پال ۴۰/-
بے نام قاتل — یوگیش کمار ۴۰/-
ٹوٹتے بکھرتے لوگ • ۶۰/-
صبح ہوا پیچاں — ساجد زیدی ۶/-
آخری آدمی — انتظار حسین ۹/-

Educational Publishing House
3108, Vakil Street, Dr. Mirza Ahmed Ali Marg, Lal Kuan, DELHI-110006

اقبال متین [illegible]

"کہانی بگیا سے آڑی کو کیلا کی"

اتنی کہتی تھیں کہ سروجنی دیوی کا رنگ کم تھا لیکن چہرے پر ایسی موہنی نمک اور ملاحت تھی کہ نواب خاندان کی گوری چٹی بیگمات انھیں اپنی نظروں میں چوری چوری بھر لیتیں ـــ اسی عمر میں سروجنی دیوی سے بہت چھوٹی تھیں لیکن ان کی جوانی کی قسم کھاتی تھیں.

میرے تایا بیرسٹر اکبر علی خاں کے گھرانے سے سروجنی دیوی کے اس درجہ مشفقانہ تعلقات تھے کہ سروجنی نائیڈو کے اس التفات کو مادرانہ تعلقِ خاطر کہا گیا۔ تایا ابا کے گھر آتیں تو اپنائیت کا یہ حال کہ بیگم اکبر علی خاں سے کبھی کبھی پوچھ لیتیں کہ "بیٹا تو نے کیا کیا پکایا ہے ـــ لے آ ـــ بھوک لگی ہے ـــ" اور وہ باورچی خانے کی طرف لپکتیں.

بیرسٹر صاحب جو پہلے یو پی کے پھر آندھرا پردیش کے گورنر رہے ان کا کہنا ہے کہ اخلاص و محبت کے جذبات کی تشکیل و تجسیم کا نام سروجنی نائیڈو ہے. وہ انھیں ماں کہتے تھے ـــ ایسی ماں جس نے اپنے بچوں کو شعور و آگہی کے راستے سجھائے ضرور، لیکن جبراً متعین نہیں کیے ـــ آزادیٔ فکر و نظر پامال نہیں ہوئی. وہ بلاشبہ جمہوریت کی علم بردار تھیں. ان کی بیٹی پدماجا نائیڈو کے ساتھی، رفیق کار، ہم نوالہ و ہم پیالہ بیرسٹر اکبر علی خاں، سروجنی نائیڈو کے بیٹے تو [illegible] سیاست میں ایک ایسی بدلاؤ ہوئے تھا جو تینوں میں مشترک تھی ـــ سروجنی نائیڈو

میں بھی پدماجا نائیڈو بھی اور [illegible] صاحب بھی [illegible]
محبت و شیر [illegible] رنگینی کے معاملے لیکن [illegible] سیاسی [illegible]
اور اس اطلاق سے آیا تھا کوشا ای کانپ گئی تھی جمہوری اقدار [illegible]
کرتے مسلمانوں کی اقلیت کے باوجود انھیں کے اقتدار کی بات [illegible]
جب سروجنی نائیڈو کے سامنے میں پہنچا تو سروجنی دیوی نے بڑے کی [illegible]
بیٹھیں کیں، سمجھایا، لیکن وہ جری نہ بازی بھی نہ مانا ——— سروجنی دیوی کی
ماتا میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا — محبت کے رشتے ٹوٹتے ہیں، سیاسی
راستے بالکل جدا۔ یہ جواں سال بہادر یار جنگ تھے، صدر اتحاد المسلمین
تقریر کرتے تھے تو زبان سے موتیاں جھڑتی تھیں۔ اپنی منہ بولی ماں سروجنی
نائیڈو کی فصاحت و بلاغت کے مداح تھے۔ بیرسٹر اکبر علی خاں کے عزیز ترین
دوست تھے — پدماجا نائیڈو سے چھنتی تھی گویا قبیلہ و خاندان ایک ہی
تھا لیکن راستے اتنے مختلف تھے کہ ان دوستوں نے پشت کو پشت دکھا کر
زندگی کا سفر طے کیا۔

دارالسلام میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار بہادر یار جنگ نے کہا تھا کہ
"آج میرے منہ میں میری ماں جائی سروجنی نائیڈو کی زبان ہے"
یہ باعث افتخار انداز اظہار، بہادر یار جنگ کا سروجنی نائیڈو کو خراج
عقیدت ہے۔ اب کتنے رہ گئے ہیں جو میدان سیاست میں اس عزت
نفس کی تکریم کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں —

سروجنی نائیڈو کی رنگا رنگ شخصیت کا میں نے ایک سرسری تجزیہ کیا لیکن
اس اکھرے پیکر تو میں دیکھیے کہ کتنی تہہ داریاں ہیں۔ کبھی کتنے خیال [illegible]

قومی سیاست بھی تنگ نہیں ہو سکیں۔ کسی آزاد عورت کو زنجیر نہیں کیے
جس نے تعلیم کا بوجھ اٹھا سکتی تھیں، اٹھایا — پیار سے سمجھایا، پچکار کر،
ڈانٹ کر سمجھایا۔ دماغ نے تو کوشش کی لیکن اپنے گھر کا دروازہ کبھی کسی پر بند نہیں
کیا۔ اس کے بعد وہ مجبور محض تھیں — دل کا دروازہ کھلا رکھ کر گھر کے دروازے
بند نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ پدماجا بھی ان کی، اکبر علی خاں بھی ان کے، جیسوریہ
نائیڈو بھی ان کے، بہادر یار جنگ بھی انھیں کے۔

اسی رنگا رنگ شخصیت کا یہ پہلو بھی دیکھیے۔ اندازہ کیجیے کہ عمر کی کس منزل
سے سروجنی نے ذات پات کے بندھن توڑ رکھے تھے۔

درونِ خانہ ہنگامے تھے کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر تھی

موقع محل سے شعر میں تھوڑا سا تصرف، زبان کا تقاضہ ہے کہ بات
ماضی کی ہو رہی ہے۔

سروجنی دیوی اونچی ذات کی برہمن تھیں۔ یہ بات بیرسٹر صاحب نے
بہت وثوق سے بتلائی اور نائیڈو کمتر درجے کی ایک کاسٹ ہے چنانچہ
سروجنی کے خاندان والے ناراض تھے کہ تم کمتر آدمی سے شادی کر رہی ہو۔
انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں ذات پات اور اونچ نیچ جاننا نہیں
چاہتی۔ ڈاکٹر جی آر نائیڈو مجھے پسند ہیں اور انھوں نے میری یہ شرط بھی بہت
محبت سے مان لی ہے کہ وہ میری سیاسی و ثقافتی زندگی میں حائل نہیں
ہوں گے — مجھے اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیے" اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں
انھوں نے شادی کر لی جب کہ وہ ۱۹ سال کی تھیں۔

مجلس جاگیرداران کی انتظامی کمیٹی میں بہادر یار جنگ اور اکبر علی خاں
شروع کر بیٹھے تھے — یہ یگانگت، یہ تعلق خاطر، یہ سیاسی اقدار سے انسانی
قدروں کو عزیز رکھنے کا شعور دین تھی سروجنی نائیڈو کی، جن کے گھر کانگریس

مسلم لیگ، جن سنگھ، سبھی مکتبہ خیال کے سیاست داں جمع تھے اپنے اذہان کو صیقل کرنے کی سبیل نکال لیتے۔ سروجنی نائیڈو بڑی بڑے پیارے سے پیش آتیں، صاف صاف دو ٹوک باتیں کرتیں لیکن بحث کا شکار نہ خود ہوتیں نہ کسی کو ہونے دیتیں ۔۔۔ ضیافتیں اس پر مستزاد۔ انھوں نے کہا کہ میرا سیاسی شعور پیدا ہی کی رفاقت میں سروجنی نائیڈو کی ودیعت ہے۔ میں نے کبھی انھیں غصے میں بحث و تکرار کرکے مسائل کو سمجھنے، سمجھانے کی کوشش کرتے نہیں دیکھا۔ سیاسی روش پر یہ حلم یہ تحمل سروجنی نائیڈو کا ہی عطا کردہ ہے ۔۔۔ چنانچہ جب گاندھی جی کا تعزیتی جلسہ میں نے نظام کالج گراونڈ پر منعقد کیا تھا تو میری گزارش پر اکبر یار جنگ نے اس کی صدارت کی تھی۔ عثمان علی خاں کا یہ دور دراصل قاسم رضوی کا دور تھا۔ لہٰذا قاسم رضوی آئے، تقریر کرنی چاہی، مائک سنبھالا اور وہی اپنی گھسی پٹی یک طرفہ سیاست کا پرچار شروع کر دیا ۔۔۔ میں نے بہت انکسار سے ان کو سمجھانا چاہا کہ یہ جلسہ تعزیتی جلسہ ہے، آپ کی تقریر آپ کا حق ہے لیکن یہ محل نہیں ہے۔ جلسہ ختم ہوا تو رضا کاروں نے میرا گھیراؤ کر لیا اور مجھے پیٹا۔ کچھ دوسرے ہم خیال نوجوانوں نے بیچ بچاؤ کرکے مجھے اٹھایا اور کار میں بٹھایا، نہیں سمجھے کر کھوس کر رکھ دیا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک میرے گھر کے سامنے نعرے لگائے جاتے رہے ۔۔۔ غدارِ وطن ٹھہرایا جاتا، عقوبت سے ڈرایا اور قتل کی دھمکیاں دی جاتیں۔ میں تو صبر کرکے بیٹھا رہتا لیکن بیوی اور بچوں کی حالت پر ترس آتا مجھے ۔۔۔ یہ داستان کچھ اور طویل ہے اسے یہیں چھوڑتا ہوں ۔۔۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا اسے حیدرآباد میں قاسم رضوی کے دور نے مسلمانوں سے ان کی شرافت نفس بھی چھین لی اتحاد و ایقان بھی۔

سروجنی نائیڈو نے حیدرآباد کی سیاست کے تیور سمجھ لیے تھے چونکہ

ملی ہے ... بھری سیاسی زندگی کی دو عظیم ... کے
ایک وقت ... ایسے وقت تھی جبکہ سیاسی تھا جو اُنھوں نے عروج
میں اپنے حوالی ... امیر ... کردی اور قومی یکانگت کے لیے ایک ایسا اجتماعی
ذہن تیار کردیا جس کی شعاعوں نے کئی اذہان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔
پدماجا نائیڈو، بی۔ رام کشن راؤ، اکبر علی خاں، نرسنگ راؤ، جے سوریہ نائیڈو، ہاشمی ساتھ
ویمپل راما چاری اور احمد علی خاں ــــ اس مہم نے پدماجا نائیڈو کی رفاقت
میں سروجنی نائیڈو کے بیچ کی ہمیشہ یاری کی جس کا نام حیدرآباد ہے۔

وہ ایسا فضا ہو تھے جب مسلمان نوجوانوں سے لے کر ضعیفوں کے لبوں پر بھی
حیدرآباد کے شاہ عثمان علی خاں کا یہ شعر ورد کی صورت اختیار کرگیا تھا کہ

سلاطین سلف سب ہوگئے نذرِ اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

گو بہادر یار جنگ نے ضلع ورنگل میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مسلمانو!
عثمان علی خاں سے تم نہیں، ہو تم سے عثمان علی خاں ہیں۔" حضور والا کو یہ بات بہت
ناگوار ہوئی تھی۔ انھوں نے غیظ میں آکر کہا تھا کہ "سروجنی کو ہم نے اعلیٰ تعلیم کے
لیے انگلستان بھیجا تھا اور ڈاکٹر نائیڈو ہماری ہی سرکار سے وابستہ رہے ــــ
اس "ہم" میں گویا اپنے والد محبوب علی خاں کی عنایات کا ذکر ہے۔ بہادر یار جنگ
خود کو سروجنی نائیڈو کا منہ بولا بیٹا بولتا ہے اور ہمارے ہی خلاف زہر اُگلتا ہے
اور وہ بھی تو ایک بیٹا بنا پھرتا ہے "اکبر علی خاں، جمہوریت کا علم بردار ــــ اسے
حاضر کیا جائے ــــ" طلبی ہوئی ــــ اکبر علی خاں پہنچے۔
ارشاد ہوا کہ "ہم نے سنا تھا کہ تم میں اور بہادر یار جنگ میں ٹھن گئی ہے اور
تم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے ہو ــــ ہم نے سوچا سروجنی کے
ان بیٹوں سے ذرا بات تو کریں۔"
اکبر علی خاں نے دست بستہ عرض کیا کہ "حضور! جس شخصیت کو آپ نے میری

عرض کیا [illegible] میں [illegible] مذہب اسلامی کی [illegible]
باہر [illegible] نفرت ہی کا جذبہ تھا جس عزیز کے پاس مذہب و ملت
تعصب سیاسی و نظریاتی اختلافات کا جذبہ ـــ انس و انسانیت کے [illegible]
جذبے کے آگے کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو، تُف ہے اس کی اولاد معنوی پر اگر وہ
آپس میں نفرت کرے ـــ بے سود سیاسی لیڈر ہوں کہ بہادر یار جنگ کہ اکبر علی
خاں، ہم آج بھی بھائی بھائی ہیں ـــ سیاست میں بہادر یار جنگ سے میرے
نظریاتی اختلافات ہیں اور رہیں گے لیکن ہم دوست ہیں اور رہیں گے۔"

شاہ نے ورنگل کی تقریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہارا بھائی تو ہماری ہی جڑیں کاٹنے کے درپے ہے، اس کو سمجھا دو۔"

اکبر علی خاں نے دست بستہ پھر عرض کی کہ "حضور! یہ تو مسلمانوں کو شاہ سے قریب لانے ہی کا ایک طریقہ ہے کہ ان کے دل میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ شاہ عثمان ایک روح دو قالب ہیں ـــ یوں سمجھیے کہ تو من شدم من تو شدی والی بات ہے ـــ ورنہ وہ تو آپ کا بہی خواہ ہے، آپ کا وفادار۔ مجھ میں اور اس میں اختلاف یہی ہے کہ وہ آپ کو صرف مسلمانوں کا بادشاہ سمجھتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ آپ نے ہر جگہ علی الاطلاق بارہا یہی فرمایا ہے کہ ہندو مسلم میری دو آنکھیں ہیں ـــ ایسے میں حضور والا جب میری ماں کی طرف سے سیاست درمیان میں آتی ہے اور نہ ہی میرے شاہ کی طرف سے تو میں بہادر یار جنگ سے کس طرح نفرت کر سکتا ہوں۔"

شاہ کے دل میں کیا تھا یہ تو وہ ہی جانیں یا پھر ان کی شاہی ـــ وقتیہ خوشنودی کا اظہار کیا اور اکبر علی خاں لوٹ آئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔

لیکن کچھ ہی عرصے بعد گھروں کی چار دیواریوں سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی سائی آوازیں ڈھولک پر زمانے تک حیدرآباد کے لوگوں نے سنیں۔

دیے حقے پہ دم بہادر جنگ   گئے ملک عدم بہادر جنگ

یعنی شاہ عثمان ہیں جن کے بارے میں جب دونوں بعد کمیونسٹ پارٹی
کا وجود جیسے زمانے میں ایک اور سرپھرے نے اپنا سر تھیلی پر رکھ کر زیادہ
صاف اور واضح الفاظ میں نعرۂ مستانہ لگایا تھا — اور — پست قد
کے مخدوم محی الدین۔

بنا رہا ہے نئی اک سحر تلنگانہ
بڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری
حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

مجھ سے بات کرتے ہوئے ایک بار تایا آبا بیرسٹر اکبر علی خاں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ سروجنی دیوی نے اپنے نزدیک یہ طے کر لیا تھا کہ وہ کبھی بھی حیدرآباد کی سیاست میں خود کو ملوث نہیں کریں گی — وہ کہتی تھیں کہ "جمہوریت میرا ایقان بھی ہے میرا ایمان بھی اور ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد کی تہذیب سے، حیدرآباد کی فضاؤں سے اور حیدرآباد کے در و دیوار سے مجھے پیار ہے۔ یہاں کی اچھی بڑی سیاست میں شخصی طور پر دخیل ہونا نہیں چاہتی کہ مجھے اپنے ہی گھر میں کسی ایک کا ہو کر رہ جانا اور کسی ایک سے منہ پھیر لینا اتنا آسان نہیں لگتا — میں نے راستے سجھا دیئے ہیں، اب یہ کام تم لوگوں پر چھوڑتی ہوں کہ دھیرج سے، نرمی سے، بغیر کسی اُلجھاؤ، ٹکراؤ اور جھگڑے کے جمہوریت کا بول بالا کریں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آصفِ سابع شاہ عثمان کے پاس سے سروجنی نائیڈو کے پاس بھی کبھی کبھی خاصہ بھجوایا جاتا تھا۔ یہ خاصہ بھی اپنی اُن شاہی خصوصیات کی بنا پر جو آصفِ سابع کے نام سے مختص تھیں مضحکات کے کئی ڈھکے چھپے پہلو رکھتا ہے۔

بڑے سے خوان پر زرین خوان پوش   اندر ایک پلیٹ میں کسی موسمی میوے کا ایک دانہ مثال کے طور پر، یوں سمجھیے کہ ایک عدد آم یا ایک عدد

فورنگ بھی بولتا۔ بیر سٹرصاحب بیلا منی سے ایک دن پہلے دھوپ لگا
یشترملاں بمبئی یان آشنا لڑتوں سے اضافہ کرتیں۔ یہ کاشت بہ رتا
س یہ ملاقاتیں اس خاندان کا مزاج بن گئی تھی۔
پدماجا نائیڈو نے شادی نہیں کی بیگم ماں کی بڑی بیٹی۔ لوگ جب قوم کا
ہن جلتے ہیں تو ان کی نجی زندگی بھی اتنی نجی نہیں رہ جاتی۔ لوگ غلوتیں
ادر آتے ہیں ــــ اور اتنے غلوص سے غلوتی بن جاتی ہیں کہ ان کے جذبہ
سا پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی ــــ پدماجا نائیڈو اور سالار جنگ میں لگاوٹ
اور اس لگاوٹ نے شاید محبت کی منزلیں اس درجہ طے کرلی تھیں کہ جب
میاں ہاتھ نگیں تو نہ پدماجا نے کسی سے شادی کی اور نہ سالار یار جنگ نے
یہ بات کہ ان دونوں کو ان کے اپنے سہروں کے پھول پرونے والے
نہیں ملے کہ حیدرآباد تو بس محبتوں کا شہر تھا ــــ سو بات اتنی گمبھیر
، صاف ہے۔
پدماجا نائیڈو کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کی طرح
ایک ہی ذات کو جانتی تھیں، ایک ہی ذات کی پوجا کرتی تھیں، عبادت
تی تھیں اور وہ ذات تھی انسانیت، اور اس کے اوتار تھے انسان ــــ
رجنگ کو ان کی جاگیرداری، شاہ کی پاس داری اور حکومت کے لوازمات
انعامات نے اس دشت میں آبلہ پائی کی توفیق نہیں دی ہوگی ــــ وہ
تھے جنھوں نے سلطنتیں چھوڑ دیں۔
حیدرآباد سے دور دور رہ کر بھی حیدرآباد کی روح بنی رہنے والی سروجنی
یڈو نے جب وہ یو پی کی گورنر تھیں، ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر پولیس
ن کے بعد تاسف سے یہ کہا کہ "مجھے افسوس ہے کہ آج میرا حیدرآباد مرگیا"
سردار پٹیل نے سروجنی نائیڈو کے سیکولر ذہن پر وار کیا اور اس افسوس
واز بانگا۔

جو کوئی بھی آگے بڑھنے کا ارادہ رکھے سکو کرد کی طرح جو یہاں سے وہاں
میری زندگی ہے تو کوئی اعلیٰ تا قتل کی جرأت نہیں کر سکتا ——— دنیا
جانتی ہے کہ میں نہ صرف سبکدوش ہو گئی ہوں بلکہ گاندھی جی کی شکتی کی
ہوں کہ ان گاندھی جی شخصوں کے انگریز جیسی قوت کو اہنسا کے بل بوتے پر
ہندوستان سے کوڑے کرکٹ کی طرح نکال پھینکا ——— حیدرآباد تو بہت
ہی چھوٹی سی چیز ہے ——— وہ میرا باغ بھی نہیں ضمیمہ ہے۔ لیکن میں کہہ سکتی
ہے کہ کوئی کارروائی نے میرے حیدرآباد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ——
پولیس کارروائی کی جو باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں انھوں نے مجھے یہ سوچنے
پر مجبور کر دیا ہے کہ میں کس منہ سے حیدرآباد جا کر اپنے بچوں کا سامنا کروں گی
اگر میرے یہ جذبات میری سرکار کو گراں گزرتے ہوں تو گورنری سے میرا
استعفیٰ حاضر ہے"۔

تاریخ شاہد ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے پولیس کارروائی کی جب
تک ممکن بڑا مخالفت کی تھی۔ لیکن ایک مجذوب کی بڑ نے جس کا نام قاسم
رضوی تھا اور جو ہذیان بکنے پر آجاتا تو کہتا تھا کہ:

"مسلمانو! میں دیکھ رہا ہوں کہ پرچم آصفی لال قلعہ پر لہرا رہا ہے"۔
اس دیوانے کی بڑ نے سردار پٹیل کے غصے کو مہمیز لگائی اور اس طرح ایک
ہذیان اور ایک غیظ نے حیدرآباد کی اس داستانِ پارینہ کو خونچکاں کر کے
رکھ دیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کس دفتر کی کن اختلا میں یہ باتیں محفوظ ہیں کہ نہیں
ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ چند سینوں میں آج بھی وہ دل دھڑکتے
ہیں جن میں یہ رازہائے سربستہ دفن ہیں اور انھیں سینوں میں میرے تایا
حضور کبیر سفیر اکبر علی خان کا بھی سینہ ہے ——— یہ وہی اکبر علی خاں ہیں جنھیں
اڑیسہ کی گورنری دی گئی تو انھوں نے آنجہانی اندرا گاندھی کے اصرار پر اے

امرود یا پھر ادرک کی لذیذ چٹنی کا ایک چمچہ جس پر چاندی کا ورق ہوتا
چاندنی کی تصویر کی طرح — گویا یہ شاہی تکلفات تھا — ان کی بیٹی
تناول کے وقت آپ بلا لیے گئے — اب اس بلاوے کی رعیت آپ
جو بھی کا تابر سر و چشم آپ اس کو قبول فرمائیے اور ایک اکڑی خالی پلیٹ میں
رکھ دیجئے — وہ تھا آپ کا بلاوا نا — اور یہ تھا آپ کا اتنا ... ...
نعمت سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ تھوڑا سا شوربہ، اس میں دو بوٹیاں —
ایک روغنی روٹی یا میٹھی سوندھی کھیر کی صحنک، ان کھیر کی صحنک پر تو چاندی
کا ورق لازم ہوتا — وہی تصویر کی طرح۔

پدماجا نائیڈو، ہوں کر لیلامنی نائیڈو، دونوں ہی اپنی ماں کی طرح اسی
خمیر سے اٹھی تھیں جسے اخلاص و انسانیت کی عظمتوں نے گوندھا تھا —
سروجنی نائیڈو کی اس تقریر کے اقتباسات ان پر لکھے گئے مضامین میں اکثر
مل جاتے ہیں۔ اس اقتباس سے جو ان کا اعتراف ہے انھیں آئینے میں ان
کی روح میں دیکھا جا سکتا ہے۔
کبھی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا —

"میں نے بہت سفر کیا ہے بہت دنیا دیکھی ہے سوچا
اور سمجھا ہے، امید و بیم کی منزلوں سے گزری ہوں، محبت کی دنیا
کو وسیع بنا لیا ہے اور ہمدردیوں کے سمندر کو اتھاہ — مختلف
فرقوں، مذہبوں، نسلوں اور تہذیبوں کے لوگوں سے ملی ہوں
اس لیے میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میرے ذہن میں نسل، فرقہ
ذات یا رنگ کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے"

لیلامنی نائیڈو حیدرآباد کے ایک کالج میں لیکچرار تھیں، یہاں سے یہ ... ...
سرِیں منسٹری میں ڈپٹی سکریٹری ہو کر چلی گئیں — وہ ویسٹرن کورٹ میں ...
ناتھیں۔ بیرسٹر اکبر علی خاں بھی ویسٹرن کورٹ ہی میں مقیم تھے جب بھی ...

لکھا ـــــ اور صبط کرو تاکہ بات سمجھ سکو کہ میں اس اسٹیٹ کا گورنر بنایا گیا ہوں جہاں میری ماں گورنر تھیں ـــــ اس طرح میری ذمہ داریاں انسانی اور جذباتی دونوں لحاظ سے بہت بڑھ جاتی ہیں ـــــ میرا اللہ میری مدد کرے کہ میں اپنی ماں کے نقش قدم پر چل سکوں۔

سروجنی نائیڈو نے یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو اس ڈرامائی انداز سے اس بھری دنیا سے آنکھیں پھیر لیں جیسے کوئی زندگی کا مذاق اڑاتا ہے۔

تیرہ سال کی عمر میں انگلستان جانے سے قبل ۱۳ سو لائنس کی LADY OF THE LAKE جیسی طویل نظم لکھنے والی یہ ذہین اور باشعور لڑکی سولہ سال کی عمر میں مسز اینی بیسنٹ کے ہمراہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلی گئی۔ اس طرح ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک تین سال انگلستان میں گزارنے کے بعد وہ اپنے وطن حیدرآباد لوٹ آئی اور اسی سال دسمبر میں خاندانی رکاوٹوں کو پس پشت ڈال کر اپنی شادی رچالی۔

زندگی کے ساتھ اس طرح آن بان کا سلوک کم ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے کہ وہ قوم اور وطن کا ورثہ بن کر امر ہو جائے۔

بستر مرگ پر نرس سے گیت سنتے سنتے اس کو گواہ رکھ کر یہ کہنا کہ اب میں کسی سے نہ بولوں گی اور پھر کسی سے نہ بولنا، ہندستان کی اس بلبل کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس نے ۴۴ سال کے بعد بھی اپنی آواز کی ہوک کو ان سبھوں کے سینوں میں بسا رکھا ہے جنھوں نے کبھی اس کی چہکار سنی تھی۔

گولڈن تھرشولڈ جیسی نفیس عمارت، جو قلب شہر میں واقع ہے اور جہاں سروجنی نائیڈو مالکن بن کر رہتی تھیں ـــــ جہاں پدماجا نائیڈو، لیلامنی نائیڈو، راجن اور جے سوریہ نائیڈو نے ڈاکٹر جی۔ آر۔ نائیڈو کے سایۂ عاطفت میں بچپن گزارا تھا۔ اسی عمارت کو، اس میں بسی بسی یادوں سمیت پدماجا نائیڈو نے حیدرآباد یونی ورسٹی کے لیے گورنمنٹ کو تحفتہً نذر کر دیا ـــــ اس طرح اس

خاندان کا کوئی نشان حیدرآباد میں نہیں ہے۔
جب بیرسٹر اکبر علی خاں نے ڈاکٹر چنا ریڈی سے ان کی [illegible]
زمانے میں خواہش کی کہ سروجنی نائیڈو کی یاد میں کوئی [illegible] کے نام سے سنٹر
کھولا جانا چاہیے تو چنا ریڈی نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس غرض کے لیے ایک بلڈنگ
خریدنے کے فوری احکام جاری کر دیئے۔ چنانچہ دفتر [illegible]
ایک عمارت ۹ یا ۱۰ لاکھ روپے میں خریدی گئی اور ایک لاکھ روپے [illegible]
کا کرنٹ اکاؤنٹ میں ڈاکٹر چنا ریڈی نے جاری کر دیا۔ بیرسٹر اکبر علی خاں کو
اس سنٹر کا چیرمین بنایا گیا۔ آنجہانی اعزازی سکریٹری ہوئے اور راج کرن آئی۔
اے۔ ایس اس کے تنخواہ دار سکریٹری۔ اس حسنِ اتفاق کا کیا کہنا کہ مابعد یہ بات ثبوت
کو پہنچی کہ سروجنی نائیڈو اسی گھر میں پیدا ہوئی تھیں جس کو ان کے والد اگھور ناتھ
چٹو پادھیائے نے کرائے پر رکھا تھا اور جہاں آج سروجنی نائیڈو کلچرل سنٹر
قائم ہے۔ سکندر علی وجد نے کہا تھا: ؎

ہم نے نقشِ ہوس خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

(ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ کے زیر اہتمام سروجنی نائیڈو
کل ہند سے می نار میں ۳۰ جون ۱۹۹۰ء کو چنڈی گڑھ میں
پڑھا گیا)

پانچویں قسط

بلراج ساہنی

امریکہ کا دوسرا سفر

کنول نین پرواز (چیکر)

بلراج ساہنی اور سنتوش ساہنی

۱۹۵۰ء — اپریل کے پہلے ہفتے میں میں بمبئی میں تھا۔ راستے میں دہلی کچھ روز کے لیے رکا۔ ترقی پسند ماہنامہ "شاہراہ" میں میرا پہلا رپورتاژ چھپنے کے بعد اس کے مدیر پرکاش پنڈت نے جو میری حوصلہ افزائی کی تھی اس کے پیش نظر اُن سے ملنا ضروری تھا۔

بلراج ساہنی کے بھانجے اشوک کشیپ بھی اس وقت دہلی ہی میں تھے بلراج جی کے بارے میں انھوں نے جو خبریں دیں وہ سن کر میرا دل پھر پریشان ہو رہا تھا۔

سرینگر سے روانہ ہونے سے پہلے یہ خبر تو مل ہی چکی تھی کہ ان کی گرفتاری کے بعد کمیونسٹ پارٹی سے انھیں خارج کر دیا گیا تھا لیکن بمبئی میں ایک اور افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی۔ عوامی تھیٹر کے کئی کارکن جو اپنے ترقی پسند سیاسی خیالات کی وجہ سے گرفتار ہوئے تھے، اُن میں سے اکثر جیل ہی میں تھے لیکن بلراج جی کو تھوڑے عرصے میں ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ ادبی حلقوں اور عوامی تھیٹر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چتر نجن چوپڑہ نے بتایا کہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ

جو خود بڑے اچھے افسانہ نگار تھے انھوں نے اسی سلسلے میں ایک افسانہ بھی لکھا تھا "فراڈ" جو کسی رسالے میں چھپا تھا۔ اس کا مرکزی خیال پرانے عقائد کی ضد پر مبنی تھا، پھول کی رسائی پر مبنی تھا۔ افواہ یہ بھی تھی کہ اپنی ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے خاص طور پر نئی بچی کی پیدائش کے بعد انھوں نے طے کیا کہ اس بات کی ضمانت دی جائے کہ وہ کر سکے بر ترقی پسند تحریکوں میں خاص طور پر سیاسی تحریکوں میں حصہ نہیں لیں گے۔

میرا دل یہ سب کچھ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ افواہیں اس شخص کے بارے میں تھیں جس نے اب تک زندگی کے ہر دور میں اور ہر قدم پر نہ صرف انسان دوستی کا ثبوت دیا تھا بلکہ انسانیت کا یہ متوالا ہر اس لڑائی کے لیے آمادہ تھا، جس سے عوام کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ وہ نہ صرف سیاسی نظام بلکہ سماجی امتیاز کے خلاف بھی بغاوت کر چکے تھے۔

سنا تھا وہ آج کل اکثر گھر پر ہی ہوتے ہیں۔

ایک روز صبح ہی صبح میں جوہو پہنچ گیا۔

گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ گھر کے برآمدے میں پہنچ کر جب میں نے "ہیلو، ہیلو، کوئی ہے" کا نعرہ لگایا تو ایک خاتون نے کمرے سے باہر آ کر میرا خیر مقدم کیا۔ طویل قامت، لمبے لمبے سیاہ بال، گندمی رنگ، آپ ساڑی میں ملبوس تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سنتوش جی ہیں۔ انھوں نے میرے ذہن کو زیادہ الجھن میں نہیں رکھا "فورًا بولیں" آپ کنول جی ہیں؟ آپ کی تصویر میں نے دیکھی ہے، میں سنتوش ساہنی ہوں۔"

"ساہنی" کے لفظ پر انھوں نے قدرے زور دیا۔

مجھے قریب کے کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بولیں "بلراج جی کی طبیعت ناساز ہے، وہ کمرے میں آرام کر رہے ہیں، تھوڑی دیر میں باہر آئیں گے۔

[illegible] ضعف و شدید سن ہی تھی۔ باہر آنے کی دھمکی ان میں ہمت نہیں تھی، وہیں سے اونچی آواز میں بولے "توشی! انھیں اندر آنے دو، میں ٹھیک ہوں، چائے کا انتظام بھی ہو جائے، پلیز۔"

توشی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی: "لگتا ہے آپ کی آواز سن کر ان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے، آپ امریکہ سے حال ہی میں آئے ہیں، یہ اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔"

کمرے میں قدرے اندھیرا تھا۔ وہ بستر سے اٹھے نہیں، لیٹے لیٹے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بڑی ہی دھیمی آواز میں بولے "سرینگر سے کب آئے تم، دوستوں کا کیا حال ہے، کشمیر کا کیا حال ہے، وہاں کے سیاسی حالات بھی کافی بدل رہے ہیں؟"

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی بلراج ساہنی ہیں جنھیں میں نے پہلی بار سرینگر اور پھر عوامی تھیٹر اور پھر اکثر جوہو بیچ اور کتنی بار ان کے گھر پر دیکھ چکا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کے کس سوال کا جواب پہلے دوں۔ وہ اچانک خاموش ہو گئے تھے۔ نظریں جیسے چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سامنے ایک جنگ کا منظر ہے اور لڑائی ختم ہو گئی ہے اور انسانیت کی شکست ہو چکی ہے، انقلاب ناکام ہو گیا ہے اور بغاوت کا پرچم زمین پر بکھرا پڑا ہے۔

اتنے میں سنتوش چائے لے کر اندر آگئیں، وہ بولیں "آپ اس اندھیرے میں یہاں کنول جی کو لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، باہر برآمدے میں آئیے۔"

"تو آپ کا تعارف ہو چکا ہے۔" ان کے چہرے پر جیسے مسکراہٹ دبے دبے قدم رکھ رہی تھی۔ "چلو کنول، توشی کہتی ہیں تو برآمدے میں ہی چلتے ہیں۔"

برآمدے میں چائے پر بیٹھے ہوئے میں نے انھیں بتایا کہ کشمیر کی ترقی پسند تحریک اب عروج پر ہے، ریڈیو اسٹیشن کے قائم ہونے سے ادیبوں اور فنکاروں کے لیے ادبی کام کے وسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میں دوبارہ

امریکہ جا رہا ہوں اور میرا جہاز" ڈیڑھ ہفتے میں لندن کے لیے روانہ ہو رہا ہے تو
انھوں نے بڑے اشتیاق سے میری طرف دیکھ کر کہا" لندن —— بڑے خوش
قسمت ہو یار!"

اب ان کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جس کا میں کب سے منتظر تھا۔
ان کی آواز میں جیسے ایک نئی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ جب توشی اندر سے باہر
باہر آئیں تو بڑے جوش سے بولے" آپ سن رہی ہیں یہ امریکہ لندن ہو کر جا رہے
ہیں۔ لندن میں میرے دو بڑے اچھے دوست ہیں۔ بی بی سی کے پریم کشنی اور
سرین صاحب، توشی بھی جب لندن تھیں تو بی بی سی میں جایا کرتی تھیں وہ
بھی ان سے واقف ہیں۔

توشی نے چائے کا کپ منہ سے لگا کر محض سر ہلانے تک ہی اکتفا کی۔
بلراج جی بولے" توسی! پلیز اندر سے ذرا کاغذ قلم لا دو، میں سرین صاحب کے
لیے کنول کو ایک خط لکھ دیتا ہوں، تم ان سے ضرور ملنا، یہ دونوں تمھیں بی بی سی کے
بش ہاؤس میں مل جائیں گے۔ پریم کشنی کا تو اکثر وقت بش ہاؤس کی کینٹین
ہی میں گزرتا ہے یا بی بی سی کے کلب کے بار میں، پٹھا پورا پشاوری ہے پٹھان
کا پٹھان، بہت پیارا آدمی ہے!"

بلراج جی کی اس نئی توانائی کو دیکھ کر میرا دل اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔
توشی اندر کاغذ قلم لینے گئیں تو وہ بولے" اس بیکاری کے زمانے میں اگر
توشی میرے ساتھ نہ ہوتیں تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا، بڑی محبت والی خاتون ہیں وہ"

مئی ۱۹۵۰ء میں میرا جہاز اٹلی کے لیے روانہ ہوا۔ میں جہاز سے اٹلی میں نیپلز
کی بندرگاہ پر ہی اتر گیا۔ ایک رات نیپلز کی سیر کی۔ راستے میں ایک رات کے لیے
روم رکا، پھر جنیوا میں دو تین روز گزارنے کے بعد پیرس کے راستے لندن پہنچا۔
لندن میں اس وقت کسی سے جان پہچان نہیں تھی۔ سنا تھا کشمیر میں کالج

ہمارے ایک دوست انڈین ہائی کمیشن میں کام کرتے ہیں۔ یہاں سے ایک ہفتے میں میرا جہاز نیو یارک کے لیے روانہ ہو رہا تھا اس لیے میرے پاس یہاں گھومنے کے لیے زیادہ وقت تھا۔ انڈین ہائی کمیشن میں پتہ چلا کہ وہ اب کسی اور دفتر میں کام کرتے ہیں۔ انڈین ہائی کمیشن اور بش ہاؤس (بی بی سی) کی عمارتیں ایک دوسرے کے ساتھ لگتی ہیں۔ میں نے سوچا چلو سرین صاحب اور پریم بخشی کو ڈھونڈا جائے۔

خوش قسمتی سے سرین صاحب اپنے دفتر میں ہی تھے۔ بھاری بھرکم جسم، دھیمے لہجے میں بولتے ہیں، میرا استقبال کیا۔ میں نے بلراج جی کا خط انہیں دیا۔ ان کے چہرے پر ایکدم سے رونق پیدا ہو گئی۔ خط کھولتے ہوئے بولے "کیا حال ہے ان کا، ان کے بارے میں کئی پریشان کن خبریں ہم تک پہنچی ہیں!"

اور پھر وہ خط پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ خط میں پریم بخشی کا ذکر کیا کہنے لگے "وہ اس وقت بی بی سی کی کینٹین میں ہوں گے ورنہ قریب ہی بی بی سی کے بار میں —— چلو پہلے کینٹین چلتے ہیں، چائے کا ایک آدھ کپ ہو جائے۔"

ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ کمرے میں ایک صاحب داخل ہوئے "ارے سرین دوست رات بھر نیند نہیں آئی، معلوم نہیں آج کا پروگرام کیسے ہوگا۔"

یہ پریم بخشی تھے۔ لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال، طویل قد، گٹھا ہوا جسم، کلارک گیبل کی سی مونچھیں —— واقعی ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

سرین صاحب نے میرا تعارف کرایا اور میرا خط بھی انہیں دیا۔ وہ خط لیتے ہوئے انہوں نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے "کیا حال ہے میرے یار کا؟" ان کے بولنے میں پشاوری زبان جیسے ان کی اردو میں گھل مل گئی ہو۔ ان کے وجود سے شمال مغربی سرحدی صوبے کے جغرافیے کا احساس تو ہوتا ہی تھا لیکن ان کی زبان سے ایک دیسی محبت اور خلوص ٹپک رہا تھا جو پشاوریوں کا خاص حصہ ہے۔

جب سرین صاحب نے کینٹین میں چائے کی دعوت دی تو قہقہہ لگا کر بولے ہائے چائے کی بات ہی ہے، یہ تو بار میں جانے کا وقت ہے، کیوں بر واز صاحب ایک

کا اس پیر کا ہو جائے؟"

سرین صاحب ہنس کر بولے "رات بھر سوئے نہیں لیکن شراب ان کے سامنے
سے اترنے کی نہیں۔"

بار میں وہ کہہ رہے تھے "بلراج ساہنی یاروں کے یار ہیں، خواہ سیدھے ہوں
یا اتنی خوب صورت اور پیاری آواز تو دی ہی، لیکن ان کے لطیفے اور قہقہے پروگرام
کی کینٹین اور بار کی زندگی کا ایک اہم جز تھے۔"

سرین صاحب بولے "دمینتی ساہنی بھی اس سلسلے میں ان سے کم نہیں تھیں۔"

بخشی صاحب نے پھر سنتوش ساہنی کا ذکر کیا "وہ بھی تو ایک بڑی اچھی ادیبہ
اور براڈکاسٹر ہیں۔ جناب نے دوسری شادی کر لی اور ہمیں دعوت نامہ بھی نہیں بھیجا۔"
میں نے انھیں بتایا کہ ان کی شادی کے حالات بڑے غیر معمولی سے تھے ہر طرف
پریشانی تھی۔

جہاں تک میرے لیے بی بی سی کے لیے کوئی پروگرام لکھنے کا سوال تھا
انھوں نے معذرت چاہی "ہمارے پروگرام پہلے سے ہی ریکارڈ ہو جاتے ہیں، لگتا
ہے آپ کے پاس وقت کم ہے؟"

میں نے انھیں بتایا کہ چند مہینوں میں واپسی پر لندن ایک مہینہ ٹھہرنے
کا ارادہ ہے۔

انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے پہنچنے سے
پہلے تم ایک خط ڈال دینا۔ آپ اپنے بیرونی ملکوں کے تاثرات کے بارے میں ایک
مضمون لکھ ڈالنا، ہم ضرور اسے براڈکاسٹ کریں گے۔ اس میں آپ ضرور بلراج
ساہنی سے اپنے رابطے کا ذکر بھی کریں۔"

۱۹۵۱ء، فروری کے آخر میں ہندوستان لوٹتے ہوئے اگرچہ میرے پاس ایک
مہینے کا وقفہ تھا لیکن زیادہ وقت کاروبار کے سلسلے میں ہالینڈ، بیلجیم اور فرانس میں

میں صرف ہوا۔ لندن میں صرف دس دن کا پروگرام تھا۔ سربن صاحب اور پریم عشقی سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔

امریکہ کی اس سیاحت کے دوران بلراج جی میرے خط کا جواب دیا تھا۔ اب انہیں فلموں میں کام مل رہا تھا۔ لہٰذا سرحدی کی بنائی ہوئی فلم "ہم لوگ" ریلیز ہونے والی تھی اور اس کی کامیابی سے ان کی کئی امیدیں اور خواب وابستہ تھے۔

خط میں اس بات کا بھی تذکرہ تھا کہ حال ہی میں ان کی منجھلی بھانجی پریما کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے بیٹا ں رگھو ناتھ کا نام میں نے سن رکھا تھا۔ وہ سرکاری ماہنامہ "آج کل" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔

خط میں انھوں نے پہلی بار کھل کر اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ مجھے اپنے رشتہ داروں کے دائرے میں لانے کے متمنی تھے لیکن ـــــ قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

میں نے انھیں اپنے خط میں اس بات کا یقین دلایا کہ انھیں اس سلسلے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی وہ میرے عزیز دوستوں کی فہرست میں اول درجے پر ہیں۔ آنے والے دنوں میں میں صرف ان سے قریبی رابطہ بلکہ رہبری کا محتاج بھی رہوں گا۔

واپسی میں لندن سے ہالینڈ جاتے ہوئے ایک ڈچ نوجوان سے ملاقات ہوئی جس نے پچھلی بڑی لڑائی میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی قربانی کے ساتھ ساتھ اپنی ایک ٹانگ کی بھی قربانی دی تھی۔ ہٹلر کے فاشزم کے خلاف ان لوگوں نے ان گنت قربانیاں دیں۔ ہٹلر کی شکست تو ہوئی لیکن اس کی پہنچائی ہوئی تباہی کے آثار ہالینڈ کے ہر شہر میں ابھی تک نمایاں تھے۔

ہندستان لوٹنے پر بلراج جی پہلی ملاقات میں، ان کے سوال میں کہ کوریا کی کی لڑائی کی وجہ سے دنیا میں جنگ ہوئی یا نہیں؟ میں نے اس نوجوان سے ملاقات کا قصہ سنایا تو وہ کہنے لگے "جنگ کرنے یا نہ کرنے کا اصل اختیار عوام کے ہاتھ

میں ہوتا ہے، حکمران کتنے ہی جنگ کرنے کے لیے پریشان کیوں نہ ہوں لیکن ہوئی ترقی پسند تحریکیں ـــــ ان کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں اکثر کامیاب ہوئی ہیں کی خاطر کے نام سے تم جو اس نوجوان کے بارے میں رپورتاژ لکھ رہے ہو، ہمارے ادب اور فن کو ایسی تخلیقوں کی بے حد ضرورت ہے۔"

امریکہ روانہ ہونے سے پہلے میں نے جس افسردہ حال اور شکستہ دل طارق کو دیکھا تھا وہ تصویر امریکہ میں اکثر میری آنکھوں کے سامنے گردش کرتی رہی۔ امریکہ میں ان کا خط پڑھ کر دل کو تسلی ہوئی تھی۔ اب وہ پھر زندگی کی ایک نئی اور کامیاب راہ پر گامزن ہیں۔ انہیں دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی۔ ان کے چہرے پر پہلے کی سی رونق تھی، جسم پھر سے جیسے بھر گیا تھا اور آنکھوں میں حسب معمول ایک نئے عظیم مستقبل کی چمک تھی۔

بغاوت کا پرچم جیسے پھر بلند ہو گیا تھا۔

ان کے گھر میں اب ایک نئی رونق تھی۔ فلموں میں بے حد مصروفیت کے باوجود وہ اتوار کو سنتوش جی اور بیٹی صنوبر کے قریب رہنا پسند کرتے تھے۔

کشمیر میں میرے والدین بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن بمبئی میں کچھ ذاتی اور کاروباری کاموں کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ کشمیر کے مصوروں کی تصویریں اب دہلی اور بمبئی کی آرٹ گیلریوں کی زینت بن رہی تھیں۔ بنسی کاشمی کے بعد اب تریلوک کول کی نمائش جہانگیر آرٹ گیلری میں ہو رہی تھی۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ملک راج آنند کر رہے تھے۔ تریلوک سے ملاقات ہوئی تو اس نے زور دیا کہ بلراج جی کو بھی اس روز ساتھ لاؤں۔

میں نے ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے "مجھے یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ان مصوروں کو ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کا موقع ملے گا لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ اس تقریب میں شامل نہیں

انھوں نے سنتوش جی کو سامنے جانے سے منع کیا لیکن انھیں بھی اس روز کچھ ضروری کام تھا۔ نمائش کچھ دنوں کے لیے تھی اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ ایک روز میں سنتوش جی کو کم سے کم یہ نمائش دکھلا لاؤں۔

بمبئی کے چرچ گیٹ کے علاقے میں میرے ایک قریبی دوست بیری صاحب کا بہت بڑھیا ریستوران تھا جہاں خالص پنجابی، کشمیری اور پشاوری کھانا ملتا تھا ـــــ بمبئی میں پہلی بار بیری صاحب نے ہی چنے اور بھٹورے کے لنچ کا رواج قایم کیا تھا۔ میں نے سنتوش جی کو صلاح دی کہ بیری صاحب کے ریستوران میں ہی لنچ کیا جائے۔ وہ مان گئیں۔ ہمیں ڈیڑھ بجے وہاں ملنا تھا۔

بیری صاحب کو میں نے پہلے ہی فون کر دیا تھا کہ مسز بلراج ساہنی میرے ساتھ ہوں گی۔ لنچ کے اس موقع پر ریستوران کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔ کہنے لگے "فکر مت کرو، تمہارے لیے الگ سے میز کا انتظام ہوگا، بلکہ تم جلدی چلے آؤ گپ بازی ہوگی۔"

بیری صاحب مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ان کی بیوی کے چھوٹے بھائی میرے ساتھ اسکول اور پھر کالج میں تھے۔ ان کے واسطے سے کافی دوستی ہوگئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے فلموں میں ایکٹر بننا چاہیے۔ ان کے ریستوراں میں اکثر ایکٹروں کے علاوہ فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوسر بھی موجود ہوتے تھے۔

میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا اس لیے کہ میں نے سوچا بیری صاحب سے کچھ باتیں ہو جائیں گی۔ بیری صاحب اس وقت اپنی خاص ٹیبل پر کچھ لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور فوراً اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے ان لوگوں میں سے ایک صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے "چوپڑہ صاحب یہ میرے کشمیر کے ایک جوان دوست ہیں دیکھنے میں ایکٹر لگتے ہیں نا؟"

چوپڑہ صاحب نے ایک دو لمحے کے لیے میری طرف دیکھا، مسکرائے [illegible] بغیر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

بیری صاحب کہہ رہے تھے "کنول! یہ بی آر چوپڑہ ہیں، بہت بڑے فلمساز۔ میں ان سے تمہاری سفارش کر رہا ہوں کہ تمہیں فلموں میں کچھ کام دیں" اور پھر انھوں نے چوپڑہ صاحب کو جیسے مرغ مسلم کی ٹانگ توڑنے میں مداخلت کرتے ہوئے کہا "یہ ویسے کافی فارغ البال ہیں، ان کا امریکہ میں دفتر ہے ان کے چچا صاحب کا، آپ دو بار امریکہ ہو آئے ہیں؟"

اب سنتوش جی ریستوران میں داخل ہو چکی تھیں۔ میں نے کہا "سنتوش جی آگئیں، بیری صاحب ہماری میز کہاں ہے؟"

بیری صاحب ایکدم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا نہ تو سنتوش جی کا اور نہ ہی بلراج جی سے تعارف تھا۔ چوپڑہ صاحب سے معذرت کرتے ہوئے بولے "کنول نے مسز ساہنی، مسز بلراج ساہنی کو بیچ پر بلایا ہے۔ بلراج ساہنی ان کے بہت بڑے دوست ہیں۔"

یہ سن کر ـــــ جیسے چوپڑہ صاحب کی ایکدم سے آنکھیں جاگ گئی ہوں۔ مرغ مسلم کو وہ ابھی تک ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ اٹھتے ہوئے بولے "ان سے کہوں یہاں آجائیں۔ اور ہاں بیری صاحب اپنے دوست سے کہہ دو کہ کسی اچھے اسٹوڈیو سے اپنی ایک تصویر کھنچوا کر آپ تک پہنچا دیں۔ میں اسکرین ٹیسٹ کا انتظام کر لوں گا۔"

اس دوران میں سنتوش جی ہماری ریزرو کی ہوئی میز پر پہنچ گئی تھیں۔ بیری صاحب نے ویٹر کو اشارہ کیا اور پھر ہمارے ساتھ میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میں نے تعارف کرایا۔

"کھانے کی بالکل فکر نہ کرنا کنول۔ جو جی میں آئے آرڈر دو" سنتوش جی یہ کھانا آج میری طرف سے ہے۔ میری بیوی کا نام بھی سنتوش ہے میں اسے توشی

کہہ کر گاتا ہوں" اور پھر انھوں نے خاص پنجابی قسم کا قہقہہ لگایا اور اٹھ کر چوپڑہ صاحب کی میز پر چلے گئے۔

کھانا کھانے کے دوران وہ میرے امریکی دورے کے بارے میں پوچھتی رہیں اور خود اپنے لندن کے دورے کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اب بلراج جی نہ صرف ذہنی طور پر بحال ہو چکے تھے بلکہ مالی طور پر بھی قدرے خوشحال تھے۔ انھیں اب ایک نئے مکان اور ایک موٹر کار کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، خاص طور پر بچوں کے لیے اور پھر کار کے ذریعے اسٹوڈیو تک سفر کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے لیے ابھی انھیں کچھ اور برس انتظار کرنا پڑے گا۔

اگرچہ "دھرتی کے لال" فلم کا ادبی اور فلمی تاثر بہت تیز تھا لیکن "ہم لوگ" کا سماجی عنصر عام لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تھا۔ ہر راہ گیر، ہر تانگے والا، ہر مزدور یہ سمجھتا تھا کہ یہ فلم صرف اسی کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔

خواجہ احمد عباس اور راما نند ساگر نے انھیں کام دیا تھا لیکن ضیا سرحدی کے ساتھ "ہم لوگ" بناتے وقت ان کا ان کے ساتھ ایک اور ہی رابطہ تھا۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اس فلم میں ہر طرح سے بلراج ساہنی کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ فلم کی کامیابی کے بعد باکس آفس پر کامیابی اور موسیقی کی جو جھنکار ہندستان کے ہر شہر میں گونج رہی تھی ــــ اس کا مالی فائدہ زیادہ تر ضیا سرحدی کو ہی ہوا۔ خواجہ احمد عباس اور کچھ اور دوسرے پروڈیوسر بھی تھے جنھوں نے ابھی پہلی فلموں کے بھی بلراج جی کو پورے پیسے نہیں دیے تھے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "ہم لوگ" کی کامیابی کی بدولت اب کئی فلم پروڈیوسر ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اس وقت وہ چیتن آنند کی فلم "بازی" کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔

کھانے کی میز پر وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ اگرچہ یہ دعوت میں نے انھیں مسز ساہنی ہونے کی وجہ سے دی تھی لیکن جب گفتگو ادب، آرٹ اور سیاست پر

چلی تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم دونوں میں ایک رابطہ قائم ہو گیا ہے۔
ان کی بھی صنوبر کی پرورش کی وجہ سے ان کے لکھنے پڑھنے میں حرج
ضروری تھا لیکن اب وہ پوری طرح سے لکھنا شروع کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں لکھنے
میں بے حد دلچسپی تھی۔ وہ پیانو خوب بجاتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک فلمی
مضمون بھی لکھا ہے جسے وہ شائع کرانا چاہتی تھیں۔

پہلی ملاقات میں میں نے "شاہراہ" کے ایڈیٹر پرکاش پنڈت کو مشورہ دیا
تھا کہ اس میں ایک فلم سیکشن بھی ہونا چاہیے جس میں ملکی اور غیر ملکی فلموں پر
ادبی اور تکنیکی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے۔ وہ مان گئے تھے لیکن اس کے لیے
میرا بمبئی میں رہنا ضروری تھا۔

اس وقت خواجہ احمد عباس بمبئی سے ہندی میں ایک بڑا فلمی اور ادبی
معیاری رسالہ "سرگم" نکال رہے تھے۔ وہ اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ پنڈت سدرشن
کے نوجوان صاحب زادے کل بھوشن اس کے ایڈیٹر تھے۔ میرے دوست ڈاکومنٹری
پروڈیوسر پی۔ ڈی۔ گارا اور فلم جرنلسٹ وی۔ پی ساٹھے اس کے فلم سیکشن کے
ذمہ دار تھے۔ یہ لوگ مجھ سے بار بار کہہ رہے تھے کہ میں "سرگم" کے لیے کچھ لکھوں۔ "سرگم"
کے دفتر میں ایک روز خواجہ احمد عباس سے بھی ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "دوست
ایک آدھ افسانہ ہی ہمارے لیے لکھ ڈالو۔ ہم لوگ لکھنے والوں کو پیسے بھی دیتے ہیں۔"
ادیبوں کو رسالوں میں لکھنے کے لیے معاوضہ دینے والی بات مجھے بہت
پسند آئی۔

میں نے سنتوش جی سے کہا کہ میں ان کا مضمون ہندی سے اردو میں ترجمہ
کر کے "شاہراہ" کو بھیجوں گا اور میرا ایک افسانہ جو کچھ برس پہلے "سبزی فروش" کے
نام سے لاہور کے "شاہکار" میں چھپا تھا اور کافی پسند کیا گیا تھا وہ اسے ہندی
میں میرے لیے ترجمہ کریں۔ وہ مان گئیں۔

جب ہم دونوں جہانگیر آرٹ گیلری پہنچے تو معلوم ہوا کہ بدقسمتی سے ترلوک کول

کی رنجش ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے قریب ہی مدراسی ریستوران "چیتنا" جانے کا فیصلہ کیا۔ بلراج جی کو بھی یہ جگہ کافی دلچسپ لگتی تھی۔

"چیتنا" میں کافی پیتے ہوئے ہماری گفتگو اب ذاتی سطح پر اتر آئی تھی۔ انھیں بلراج جی اپنی مکمل ساجی ہو جانے کے رشتے کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا جب میں نے خود ان کی اپنی اس "انوکھی" شادی کا تذکرہ کیا تو وہ بولیں :۔

"بلراج جی کے لیے میرے دل میں محبت کی چنگاری جو کالج کے دنوں سے ہی سُلگ رہی تھی وہ ان کی شادی ہو جانے پر ختم نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی میری شادی ہو جانے پر ۔ ــــــ لیکن جب میں ولایت سے واپس آئی تو انھیں اکیلا دیکھ کر یہ آگ پھر سے بھڑک اٹھی:"

وہ کہہ رہی تھیں:

"اس زمانے میں راولپنڈی یا سارے پنجاب کے متوسط ہندو گھرانوں میں بھی لڑکیوں کی آزادی کے آداب و اطوار دہی تھے جو مسلمان گھرانوں میں صدیوں سے چلے آرہے تھے۔ ہمارے یہاں پردے کا ظاہرے رواج نہیں تھا لیکن بالغ لڑکیوں کو دوپٹہ سر پر ٹھیک طرح سے اوڑھنے کی ہدایت دی جاتی تھی اور یہ بھی کہ جب تک شادی نہیں ہوتی، محلے کے ہر نوجوان کو اپنا بھائی سمجھنا ضروری ہے۔

لیکن کون لڑکی تھی جو بلراج جی کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھتی ــــ طویل قامت، گورا چٹا رنگ، کشادہ کندھے، گھنگریالے بال، چہرے کے حسین نقش و نگار کسی یونانی مجسمے کی طرح۔ وہ جب محلے کی گلیوں سے گزرتے تو دروازے کے دریچوں سے جھانکتی ہوئی لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن جب تیز ہوتی تو صرف ان کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا بلکہ ان کے پاؤں تلے کی زمین بھی!!"

بلراج جی، سنتوش جی کی علمی اور ادبی قابلیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے دل میں بھی ایک ایسا دروازہ تھا جہاں سے وہ جھانک کر سنتوش جی کو کسی اور رنگ میں بھی دیکھتے تھے لیکن اس زمانے میں پھوپی کی لڑکی سے شادی کے بارے

میں سوچا بھی ایک گناہ سے کم نہیں تھا ابھی وہ زندگی کی اس منزل تک نہیں پہنچے تھے جہاں وہ بغاوت کے لیے آمادہ ہو جاتے۔

ان کی دوستی سے شادی ہوئی۔

اب وہ ہندوستان میں نہیں تھے بلکہ لندن میں بی بی سی کی ملازمت میں تھے سنتوش جی کی ہندی کے مشہور ادیب و شاعر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ناول "ندیا کے دیپ" کی اس وقت چاروں طرف دھوم تھی۔ تھوڑے عرصے میں ہی اس ملاقات کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ لیکن ۔۔۔۔ حالات کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔۔ چند مہینوں کی شادی کے بعد طلاق ۔۔۔ اور وہ بھی ہندوستان چھوڑ کر ولایت چلی گئیں۔

ولایت سے لوٹنے پر وہ بلراج جی کے یہاں ٹھہریں۔

جو ہو کی فضاؤں نے جیسے اس سوئے ہوئے رومانس کو پھر سے بیدار کر دیا جو جوان کئی برس سے سوئے پڑے تھے وہ پھر سے اب جاگ گئے۔

چرچ گیٹ اسٹیشن سے گھر کے لیے روانہ ہونے کے لیے ہم لوگ جب گاڑی میں بیٹھے تو مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی گرفتاری اور پھر رہائی کی بات چھیڑ ہی دی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر بڑی زور دار آواز میں بولیں "یہ صرف ہماری ذاتی اور مالی مجبوریوں کا سوال نہیں تھا بلکہ اس وقت ساری ترقی پسند تحریک اور خاص طور پر عوامی تھیٹر میں ایک تلاطم برپا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں فلموں میں زیادہ کام نہیں مل رہا تھا اور جب کام ختم ہو چکا تھا اس کے پیسے پڑے ہوئے نہیں دیے جاتے تھے ۔۔ کمیونسٹ پارٹی میں بمبئی سرکار کے دباؤ سے ہلچل مچی ہوئی تھی ۔۔ ہمارے یہاں ایک نئی زندگی کی آمد آمد تھی میرا مطلب منو بر کی پیدائش سے ہے۔ جب ہم ان سے جیل میں ملنے گئی تو وہ بے حد پریشان تھے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ میں نے ان پر اس سلسلے میں کوئی دباؤ ڈالا تھا اور نہ ہی انھوں نے

پولیس یا سرکار کو کوئی لکھتی گارنٹی دی تھی کہ وہ آئندہ کسی بھی ترقی پسند تحریک میں شریک نہیں ہوں گے:
یہ کہتے کہتے جیسے ان کی آواز جذبات سے بھر گئی تھی۔
وہ صحیح معنوں میں نہ صرف ایک ترقی پسند فنکار تھے بلکہ انسانیت کی جدوجہد کرنے والے ایک سیاسی کارکن بھی۔ جس شخص نے "جادو کی کرسی" جیسا ڈرامہ حکومت کے خلاف لکھا وہ اس حکومت سے کیسے سمجھوتہ کر سکتا تھا؟
مجھے یاد آیا کہ ان کا ڈرامہ "جادو کی کرسی" الہ آباد کی سالانہ کانفرنس (عوامی تھیٹر) میں اسٹیج ہونے کے بعد سارے ہندوستان میں دھوم مچی تھی۔ اس ڈرامے سے نہ صرف انہوں نے ایک اسٹیج کے ایک عظیم اداکار بلکہ ایک بہت پائے کے ڈرامہ نگار ہونے کا ثبوت بھی دیا تھا۔ طنز و مزاح کے ادبی ہتھیاروں کی مدد سے اس ڈرامے کے ذریعے انہوں نے ESTABLISHMENT کی دھجیاں اڑائیں۔

۱۹۵۱ء کی سردیاں اور گرمیاں میں نے سرینگر میں بسر کیں۔ اب کشمیر میں ریڈیو کے قیام سے، ہم لکھنے والوں کو نئے مواقع میسر ہو رہے تھے۔ نئے ڈرامہ نگاروں میں علی محمد لون سب سے آگے آگے تھے۔ میں نے خود پہلی بار ریڈیائی ڈرامے لکھے مغربی ڈراموں سے ماخوذ دو کھیل "گریز" اور "تلافی" بہت کامیاب ہوئے۔ اب میں ماہنامہ شاہراہ کے لیے باقاعدگی سے لکھ رہا تھا۔ امریکہ کے بارے میں بڑا طویل رپورتاژ "جہاں آزادی کا بت ہے" شاہراہ کے خاص نمبر میں شائع کرتے ہوئے پرکاش پنڈت نے میرا تعارف کراتے ہوئے لکھا:
"کنول نین پرواز نے اردو ادب کو ایک نیا طرز بیان اور ایک نیا اسلوب دیا ہے:"
یہی دن تھے جب ایک روز ریڈیو اسٹیشن پر ایک صاحب سے تعارف کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ سلام مچھلی شہری اب ریڈیو کشمیر (سرینگر) میں تعینات ہوئے ہیں۔

عرصے سے ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھ رہا تھا اور ان کی شاعری سے بے حد متاثر تھا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو ادب میں آزاد نظم میں میرا جی، ن۔م۔ راشد کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی لینا بہت ضروری ہے۔ جب ایک روز کافی ہاؤس میں اس بات کا تذکرہ ہوا تو وہ ہنس کر بولے "ن۔م۔ راشد نے آزاد نظم کے ذریعے یورپ سے اپنے ملک کی بدحالی کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ میرا جی نے لوہے کے تین گولے کندھے سے لٹکتے ہوئے جھولے میں ڈال کر شاید اپنی ذاتی اور دنیا کے جھمیلوں کو اس میں سمیٹ لیا تھا لیکن میرے پاس سوائے ادب کے کچھ نہیں۔"

مجھے خوب یاد آیا کہ عوامی تھیٹر میں بلراج جی نے ایک بار میرا جی سے تعارف کراتے ہوئے ان کے اس کندھے سے لٹکتے ہوئے جھولے میں تین لوہے کے گولوں کا بھی تذکرہ کیا۔

سلام بولے "تو آپ بلراج جی کو جانتے ہیں! بہت بڑے فنکار ہیں۔"

میں نے انہیں بتایا کہ "وہ دسمبر میں اپنے بھانجے کی شادی پر یہاں آرہے ہیں ان سے آپ کو ملواؤں گا۔"

وہ سرینگر تھوڑے عرصے کے لیے آئے تھے۔ کہنے لگے "یہ میری بدقسمتی ہوگی اگر ان کے آنے سے پہلے میرا کسی اور اسٹیشن پر تبادلہ ہو گیا تو!"

۱۹۵۲ کے شروع میں ان کے بھانجے اشوک کی شادی مقرر ہوئی۔ یہ شاید جنوری یا فروری کا مہینہ تھا۔ سلام مچھلی شہری سرینگر سے چلے گئے تھے۔ کمال احمد صدیقی تو سرینگر اپنے علاج کے لیے آئے تھے اب ریڈیو کشمیر میں کام کر رہے تھے۔ اس عرصے میں اشوک سے کافی ہاؤس میں اور ان کے گھر پر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اب وہ میرے قریبی دوستوں میں سے تھے۔

بلراج جی بہت ہی کم عرصے کے لیے سرینگر آئے تھے۔ اب وہ لندن بی بی سی

ہوا کا سٹرہاوا ای نیفرزی فلم دھرتی کے لال کے ہیرو ہی نہیں تھے بلکہ ہندوستانی پیمانے کے ایک بہت ممتاز اداکار — ہندوستان کے ہر شہر میں ہم لوگ کی دھوم تو تھی ہی لیکن سرینگر جیسے چھوٹے شہر میں ہر بچہ، جوان، خاص طور سے تانگے والے "ہم لوگ" کا مکالمہ "اپنے کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے" بار بار دہرا رہے تھے۔ یہ تو اچھی بات تھی کہ وہ ایسے موسم میں آئے جب بازاروں میں جلدی اندھیرا پڑنے سے رونق کم ہوتی ہے اور بازار جلدی بند ہو جاتا ہے ورنہ شاید ان کا لال چوک سے گزرنا محال ہو جاتا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے وزیر باغ میں ہوئی۔ ان کے اکثر مہمان یہاں موجود تھے۔ ان کے یہاں شراب کا اچھا خاصہ دور بھی چلا وقت کم ہونے کے باوجود انہوں نے ریڈیو اسٹیشن کے ایک ڈرامے میں بھی حصہ لیا اور پران کشور کے ہاں کشمیری کھانے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔

وہ کشمیر کے اکثر نئے ادیبوں اور مصوروں سے ملنا چاہتے تھے خاص طور پر ت کاشمیری سے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ پران کشور کے یہاں کھانا کھانے سے پہلے "لب کول" کے بار پر چند دوستوں کے ساتھ شراب کا پروگرام ہو۔ "لب کول" کا بار اس وقت سرینگر کے فن کاروں سے بھرا رہتا تھا۔ ریذیڈنسی روڈ پر انگریزی فلمیں دکھانے والے ریگل سینما کے یہ بالکل سامنے تھا — پران کشور کے ریڈیو کشمیر والے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا پینے پلانے کا دور دیر تک چلے گا اور اس وقت سواری وغیرہ کا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بلراج جی کو دوسرے روز اپنے ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں اسٹیشن جانا تھا اسٹیشن کی گاڑی انہیں لینے آئی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا وہاں سے ہم لوگ پران کشور، بشیر بٹ وغیرہ اسٹیشن کی گاڑی سے ہی "لب کول" کے بار میں آئے اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور عبدل کی اپنی ہی ایک خاص شخصیت تھی وہ بھی کسی

یکطرے کم نہیں تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے پروگراموں میں حصہ لینے والے کئی نامور لوگوں کو وہ اپنی گاڑی میں سوار کرچکا تھا۔ ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے وقت وہ بڑے احترام سے سر کو نیچے جھکاتا۔ بلراج جی کے لیے دروازہ کھولتے وقت احترام سے سر جھکانے کے ساتھ وہاں کی فلم "ہم لوگ" کا مکالمہ بھی دہراتا ـــــ

"ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے" اور بلراج جی پھر اسے گلے سے لگا لیتے۔

"لب کول" کے بار میں ہمیں چھوڑتے ہوئے عبداللہ نے یہ بھی کہا کہ وہ دو تین گھنٹے میں گاڑی لے کر آئے گا اور ہم گاڑی میں ہی بران کشور کے یہاں جائیں گے۔ بران کشور نے کھانے کے لیے اسے بھی دعوت دی تھی۔

کئی دنوں سے بڑے زور کی برفباری ہو رہی تھی خاص طور پر اس روز سڑکوں اور عمارتوں پر چاروں طرف جیسے ایک طویل سفید چادر چھائی پڑی تھی۔ ہم لوگوں کے پہنچنے سے بار اور بھی بھر گیا تھا۔ اس شدید سردی میں سب کو کسی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

بلراج جی سے جب ہم نے پوچھا کہ وہ کیا پئیں گے تو بولے "بی بی سی کے زمانے سے ہی "GUINNESS" (بیئر) پینے کی عادت سی پڑ گئی ہے اگر یہ مل جائے تو کیا بات ہے"

انگریزوں کو ہندستان سے گئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ BEER بھی وہ یہاں ایک LAGER تھی جو وہ چھوڑ گئے۔ "لب کول" کے اسسٹنٹ محمود نے GUINNESS کی دو بوتلیں میز پر رکھ دیں اور انھیں بلراج جی کے لیے گلاس میں ڈالتے ہوئے بولا "ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے"

محمود کی عمر مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ وہ بار کی میزیں وغیرہ صاف کرنے اور "لب کول" کے لیے خرید و فروخت کا سامان باہر سے لانے کے علاوہ وہاں کا "ساقی" بھی تھا۔

شراب کے دور کے ساتھ ہی ادب اور آرٹ پر گفتگو شروع ہوئی جو [illegible] سیاست کا احاطہ کرتے ہوئے ساری دنیا کی سیاست تک جا پہنچی۔ اس میز کے گرد

بیٹھے ہوئے تھے اور ہم سب اور من کار جیسے ساری دنیا کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ وہ بھی اس بحث میں خاصی دلچسپی لے رہے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے اس جوش و خروش کو صرف ہمارے نوجوانی کے "گرم خون" بلکہ شراب کے نشے سے بھی متعلق سمجھ رہے ہیں۔

اور بھر بیئر ختم ہو گئی۔ نب کول پریشان سے تھے۔ بلراج جی نے کہا "کوئی بات نہیں، بس دو بوتلیں کافی تھیں"

مگر ہمیں معلوم تھا کہ وہ اور پینا چاہیں گے لیکن وہ کسی اور چیز پینے کے لیے رضامند نہیں تھے۔

محمود کے کانوں میں اس بات کی بھنک پہنچی تو ایکدم سے اچھل کر بولا:

"اگر بلراج جی کو بیئر چاہیے تو ہم اس کو بیئر لا کر دے گا، ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے!"

"سالے تو کہاں سے بیئر لائے گا" نب کول نے اسے ڈانٹا "رات کے نو بج چکے ہیں، سارا بازار اب بند ہو چکا ہے"

نب کول کے بارکے قریب "آف لائسنس" شراب کی دوکان تھی جہاں سے ان کی سپلائی آیا کرتی تھی لیکن یہ سردیوں کے دن تھے اور نب کول نے بتایا کہ پنڈت جی کی حال ہی میں دوسری شادی ہوئی ہے، ادھر سردیوں میں دوکانیں اکثر جلدی بند ہو جاتی ہیں، لیکن دوکان وقت سے پہلے بند کرنے کی پنڈت جی کو ایک اور شہہ بھی جیسے مل گئی تھی!

"نئی شادی ہوئی ہے تو کیا!" محمود نے بڑے اعتماد سے کہا "ہم اس سے بولے گا بلراج جی کو بیئر چاہیے، ہم پنڈت جی کو اس کے بستر سے آج نکالے گا، ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے!"

بلراج جی نے اپنا خالی گلاس اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "ہاں محمود، ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے!"

میں محمود کے ساتھ پنڈت جی کی دوکان تک جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ باہر چاروں طرف تاریکی تھی۔ برفباری اور تیز ہو گئی تھی۔ شائیں شائیں کرتی ہوئی ہوا چاروں طرف پھیلی ہوئی برف کی چادر کو اڑانے کی بیکار کوشش کر رہی تھی۔ بجلی کے کھموں سے لٹکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بلب اپنی کمزور روشنی پر جیسے شرمسار تھے۔

پنڈت جی دوکان کے اوپر ہی رہتے تھے۔ دوکان کے سامنے وسیع برآمدہ ساتھا۔ محمود نے برآمدے میں جاکر زور سے اوپر کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔

محمود نے دو تین بار دروازے پر دستک دینے کے بعد برآمدے سے باہر آکر زور سے چلانا شروع کیا "پنڈت جی، پنڈت جی دروازہ کھولو"۔

تب کول نے ٹھیک کہا تھا پنڈت جی اپنی نئی بیوی کی آغوش میں جیسے کسی اور دنیا میں ہی تھے اور پھر اس شدید سردی میں گرم رہنے کے لیے اس سے بہتر اور کونسی جگہ ہوسکتی تھی پہلے تو محمود بڑبڑایا "پنڈت جی مزے لے رہے ہیں"۔

اور پھر ایکدم چیخ کر بولا "پنڈت جی! ہم بلراج ساہنی کے لیے آیا ہے، پنڈت جی ہم کو بیئر چاہیے"۔

فلیٹ کی کھڑکی ایکدم سے کھلی۔ تیز ہوا سے جیسے کھڑکی بار بار بند ہو رہی تھی پنڈت جی اپنے بھاری "فرن" ملبوس تھے۔ انھوں نے منہ تک ——— (گرم ٹوپی) چڑھا رکھی تھی۔ ٹوپی کو منہ سے اٹھاتے ہوئے بولے "کمبخت اتنی رات گئے کیا چلا رہا ہے؟ کس کو بیئر چاہیے؟"

"بلراج ساہنی کو بیئر چاہیے" محمود نے چلاتے ہوئے کہا "بلراج ساہنی ہمارا یار ہے" ہم لوگ "بجلم (فلم) کا ہیرو ہے۔ ہم کو یار کی یاری سے مطلب ہے"۔

کھڑکی بند ہو گئی۔ ہم دونوں بے حد مایوس تھے۔ پھر نیچے کا دروازہ کھلا اور پنڈت جی بولے "بیوی نے کئی بار کہا" ہم لوگ "دیکھنے چلو، مگر مجھے وقت ہی نہیں ملی، وہ کہتی ہے بہت اچھی بجلم (فلم) ہے"۔

اور پھر بنارسی نے دوکان کھولی اور بیٹسر کا ایک کیس ــــ یعنی بارہ بوتلیں دیں۔

پلان کمیشن کا کھانا کھاتے ہوئے بلراج جی ایکوم سے بولے "یہ محمود آج کا نئی کشمیری پود کا نمایندہ ہے۔ اس نے پچھلے دنوں میں اس کا اعتماد اس راستے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو آنے والے دنوں میں کشمیر کی تعمیر کی ترقی کا ضامن ہوگا"

محمود نے ان سے ایک آٹوگراف کی ہوئی تصویر مانگی تھی۔ وہ دوسرے روز صبح بمبئی واپس جا رہے تھے۔ میں نے کہا "یہ تصویر مجھے دے دیجیے، میں اسے دے دوں"

دوسرے روز معلوم ہوا کہ وہ صبح ہی صبح روانہ ہونے سے پہلے یہ تصویر ٹیب کول کے بار پر دے آئے تھے!!!

فارم ۴

نام رسالہ:۔	عصری ادب
زبان:۔	اردو
وقفہ:۔	سہ ماہی
نام مالک:۔	سید بہاء الدین احمد
قومیت:۔	ہندستانی
نام ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر:۔	سید بہاء الدین احمد
قومیت:۔	ہندستانی
پتہ:۔	ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ نئی دہلی ۹

میں سید بہاء الدین احمد اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات علم واطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔ سید بہاء الدین احمد

انور خان

خوشبو

اندھیرے سنسان راتوں سے گزرتے ہوئے بس مسلمان علاقوں میں داخل ہوئی تو منظر بدل گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ، دکانوں پر تیز چمکتے قمقمے، مٹھائیوں، کبابوں کی خوشبوئیں، مسجدوں میں چراغاں۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ لوگ تراویح پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ بشر اپنے اسٹاپ پر اترا تو گلی کے نکڑ پر اسے دوست کھڑے نظر آئے۔ سفید کرتے، سفید پائجامے، سروں پر ٹوپیاں۔

گھر جانے کی عجلت تھی لیکن دوستوں سے ہیلو ہائے کیے بغیر کیسے گزر سکتا تھا۔

"ابھی آ رہے ڈیوٹی سے؟" ایک دوست نے پوچھا۔

"ہاں یار، نائٹ شفٹ تھی۔" بشر نے جواب دیا۔ "تراویح پڑھ کر آ رہے ہو تم لوگ؟"

"ہاں یار ویسے تو کبھی توفیق نہیں ہوتی۔" اس نے جواب دیا۔ "کم از کم رمضان میں کچھ عبادت کریں اور نمازوں کے بغیر روزے رکھنے کا لطف ہی کیا؟"

"آفس سے چھٹی لے لی ہے کیا؟" بشر نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں کنپٹیوں کے بال تو سفید ہو چلے۔" بشر نے دوست کو چھیڑا۔ "اب موت کا خوف ستا رہا ہوگا، کیوں؟"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا کیا؟" اُس نے پوچھا۔
بشر چپ ہوگیا، پھر چند ثانیوں بعد بولا:
"واقعی یار ہم لوگ بھی عجیب ہیں۔ نوجوانی میں خوب گل چھرے اڑاتے ہیں، بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، خدا ایک کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مذہب، اخلاق، انسانی رشتے، ہر چیز کا مذاق اڑاتے ہیں پھر معلوم ہوتا ہے کہ زبیر نماز بس پڑھ رہا ہے، سعید تبلیغی جماعت میں شامل ہوگیا، ظفر کو تصوف ہوگیا ہے، مظفر درگاہوں کے پھیرے کر رہا ہے۔"
"ہاں یار یہ بات تو ہے" اس نے کہا "پر کیا کریں، پتہ نہیں کیا ہوجاتا ہے سب کچھ بیکار معلوم ہونے لگتا ہے۔"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مائل لکھنوی مسجد سے برآمد ہوئے۔ سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مائل بڑے اچھے شاعر تھے، رٹل میں ان کا جواب نہ تھا۔
"کیا مائل صاحب آپ بھی؟" بشر کے ایک دوست نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔
مائل مسکرائے، مارنا دائیں بائیں دیکھا اور پھر گویا ہوئے۔
"میاں ــــ معبود کی طاعت کوئی آسان نہیں۔"
دوسرا مصرع رٹل کا تھا جو عشا کی سترہ رکعتیں اور تراویح کی بیس رکعتوں کے پیش نظر کہا گیا تھا۔ ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ دو ایک راہ گیر جو مائل کو دیکھ کر رک گئے تھے وہ بھی اس میں شامل ہوگئے۔
"آیئے پان کھاتے ہیں" مائل نے کہا۔
بشر کے دوست ان کے ساتھ ہولیے، بشر اجازت لے کر گھر کی طرف چلا گیا۔
گھر میں داخل ہوا تو بیوی ٹی۔ وی پر لیٹ نائٹ فلم آئی یو یو ۔ ز ۔ ۹ دیکھ رہی تھی۔ جی میں تو آیا کہ بیوی کو ڈانٹے کہ رمضان میں

یہ خرافات، لیکن چند سال قبل یہ فلم اس نے ایک فیسٹول میں دیکھی تھی اور اس کی ہیروئن اسے بہت پسند آئی تھی. خوبصورت کردار ادا کیا تھا، دیکھ کر پھر یاد ہوئے تھے، زبان خواہ مخواہ خشک ہو جائے.

اس فلم کا موضوع بھی وہی ہے جو بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" کا ہے بشر نے بیوی سے کہا.

"کون بیدی، جنھوں نے دستک فلم بنائی تھی؟" بیوی نے جو کھانا گرم کرنے جا رہی تھی پوچھا.

"ہاں وہی" اس نے جواب دیا "یہودیوں میں رسم ہے کہ بڑے بھائی کا انتقال ہو جائے تو اس کی بیوہ سے چھوٹے بھائی کی شادی کر دیتے ہیں."

"توبہ اللہ" بیوی نے کانوں پر ہاتھ رکھا "فلم والوں کو بھی ایسے ہی گندے موضوع ملتے ہیں فلمانے کے لیے."

بیوی نے کھانا پروسا اور دن بھر کی روداد سنانے لگی. بچوں کی پڑھائی کی باتیں، رشتہ داروں کی باتیں.

"یا تو باتیں بند کر دیا ٹی. وی." بشر زچ ہو کر بولا.

بیوی خاموش ہو گئی. دونوں خاموشی سے فلم دیکھنے لگے. فلم میں اس کا جی نہیں لگا. اس چھوٹے سے اسکرین پر ہیروئن کے خدوخال میں وہ بات کہاں سے پیدا ہوتی جو فلم کو بڑے اسکرین پر اسے محسوس ہوئی تھی. دور کے شاٹ میں خدوخال قریب قریب غائب ہو جاتے.

وہ بستر پر لیٹ گیا. بیوی نے اسے لیٹتے دیکھا تو ٹی. وی بند کر کے پہلو میں آ لیٹی. بچے بچھونوں میں گہری نیند سو رہے تھے.

"ارے میں آپ سے کہنا بھول گئی، شبو آیا تھا."

"کیوں؟" بشر نے پوچھا.

"پولے والی خالہ کا انتقال ہو گیا."

بشر کے ذہن میں قبرستان کا منظر گھوم گیا۔ روزانہ آتے جاتے اس کی بس ایک قبرستان سے گزرتی تھی قبرستان کے دروازے کے پاس ہی پھولوں کی دو دکانیں تھیں جن پر بیٹھے خمیدہ کمر، پوپلے منہ والے دو بوڑھے پھوس وہ برسوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ ماحول سے بے نیاز، لاتعلق، جیسے دو گڈے رکھ دیئے ہوں، نان کے ٹکڑوں پر گرتے فقیروں کے بچے اور عورتیں، وضو کے لیے رکتے کسی میت کے لواحقین یا سگریٹ، پان کی دکان پر ہجوم کرتے لوگوں سے جیسے انہیں واسطہ ہی نہ تھا۔ کل وہ ان بوڑھوں کو بالکل پاس سے دیکھے گا اس نے سوچا اور بل ڈیکر بس کی کھڑکی سے اس نے انہیں دیکھتے ہوئے کئی بار یہ بات سوچی تھی۔

"میت کب جائے گی؟" بشر نے پوچھا۔

"صبح جائے گی نو دس بجے۔ پونے میں ان کے میکہ والوں کو خبر کر دی ہے بتا رہا تھا صبح پہنچ رہے ہیں وہ لوگ۔"

"ٹھیک ہے، پھر کل صبح دیکھا جائے گا۔" اس نے سوچا کل دفتر میں اسے ایک اسٹیٹمنٹ بھی دینا تھا شام تک کسی بھی حالت میں مکمل کرنا تھا۔

"بڑی نیک عورت تھیں۔" بیوی نے کہا

"ہاں۔" اس نے تائید کی۔

سچ مچ بڑی نیک عورت تھیں۔ سب سے قریب اسی کا گھر تھا۔ دو محلے چھوڑ کر۔

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ گجرے کی بھینی بھینی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔

"گجرا لگایا ہے؟" اس نے نادرہ کے سر کو پہلی بار غور سے دیکھا۔

نادرہ ہنس پڑی۔

"آپ تو کبھی لاتے نہیں، آج گجرے والا دروازے پر آیا تو میں نے خرید لیا۔"

واقعی اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی گجرا خریدا ہو۔ اس کی مہک سے ہی

اسے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں نادرہ پابندی سے گجرا لگایا کرتی تھی۔ جب وہ پاس پاس لیٹتے تو بشر کا عجیب حال ہوتا۔ خوشبو اس کی تمام حسوں کو جگا دیتی۔ کانوں کی لویں آنچ دینے لگتیں، سانسیں تیز ہو جاتیں، ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے اور سب کچھ اتنی تیزی سے ہو جاتا کہ وہ مجل رہ جاتا۔ بیوی سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ رہتی۔ ابتدا میں تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بعد کو اندازہ ہوا کہ یہ ساری آفت پھولوں کی ہے۔ نادرہ سے کیسے کہتا کہ گجرا مت لگایا کرو۔ جب کچھ بے تکلفی بڑھی تو اس نے اپنی مشکل نادرہ کو بتائی۔

وہ حسبِ عادت ہنس پڑی۔

" رہنے دیجیے، ہمیں یونہی اچھا لگتا ہے، ہم نے تو آپ سے کبھی شکایت نہیں کی۔"

وہ کچھ دیر یونہی پڑا رہا۔ رابعہ خالہ کی موت نے اسے اُداس کر دیا تھا۔ لیکن یہ کم بخت گجرے کی خوشبو۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ نادرہ کو بھی آج ہی گجرا خریدنا تھا۔ شبّو دیر سے آیا ہوگا، ورنہ وہ یقیناً گجرا نہ خریدتی اور یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ نادرہ گجرا خریدے اور نہ لگائے۔ پھول اسے بے حد پسند تھے۔

شاید اس کا بدن آنچ دینے لگا تھا۔ نادرہ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کیونکہ اس نے کروٹ لے کر اپنا بازو بشر کی گردن میں حمایل کیا اور سر سینے میں دھنسا دیا۔ اب گجرا عین اس کی ناک کے نیچے تھا۔

" تو کل آپ میت میں جائیں گے نا؟" نادرہ نے اچانک کہا "بڑی نیک تھیں بیچاری۔ کتنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ مل آؤں پر وقت ہی نہ ملا بچوں میں دن کہاں گزر جاتا ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔"

بشر کو بڑی کوفت ہوئی۔ یہ عورتیں اس قدر بدذوق کیوں ہوتی ہیں بھلا یہ وقت ان باتوں کا تھا؟ قبرستان کے پوپلے منہ کے بڈھے جیسے یاد

آگئے ہوں۔ اس کے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی جھنجھلا کر کچھ کہنے کے ارادے سے اس نے منہ کھولا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ ایک لمبی سانس لی۔ گھرے کی مہک دماغ میں جاکر لگی اور وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔

اس بار بھی وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ عجالت اور غصہ۔ غصہ دراصل اسے خود پر آتا ہے اس نے سوچا وہ چاہتا ہے ان لمحات کو طول دے لیکن اس کا بس نہیں چلتا۔ جسم و دماغ کی اس کشمکش میں فتح ہمیشہ جسم کی ہوتی ہے اور سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ اس نے اُٹھ کر بتی جلائی۔

"بہت جلدی ہوگیا" اس نے نادرہ سے کہا۔

"نہیں تو" نادرہ نے کہا۔

بشر کو صاف محسوس ہوا کہ وہ اس کا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہہ رہی ہے۔

بلڈنگ کے سامنے فٹ پاتھ پر جنازہ رکھا تھا۔ بتیاں بجھ گئی تھیں۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، کچھ لوگ دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ سب نے ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ چہرے سوگوار تھے۔ زینے طے کرکے وہ رابعہ خالہ کے گھر پر پہنچا۔ ان کے میکے کے رشتہ دار نظر آئے۔ بشر نے رابعہ خالہ کے لڑکوں کو پُرسہ دیا اور سوگوار صورت لیے کھڑا ہوگیا۔ ذہن میں کہیں بار بار یہ خیال کچوکے دے رہا تھا کہ اسے آج اسٹیٹ منٹ بنا کر دینا ہے۔

"میت کب جلے گی؟" ایک پڑوسی نے آکر پوچھا۔

"دس بجے" خالو نے جواب دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قبرستان تک پہنچنے تک پونے گیارہ تو بج ہی جائیں گے ضرور آدھا پون گھنٹہ اور رکنا ہوگا۔

وہ نیچے اتر آیا۔ بلڈنگ سے آتے باہر ہی اس کی ملاقات اپنے چچازاد

بھائی حسین سے ہوئی۔" آؤ چائے پیتے ہیں، ان سے دیکھتے ہی حسین نے کہا۔
" ابھی کافی وقت ہے۔"

حسین سے اس کی بے تکلفی تھی، دونوں ساتھ ہی پڑھے تھے۔ چائے پیتے ہوئے اس نے حسین سے اپنی مشکل کا ذکر کیا۔

" تم آفس فون کیوں نہیں کر دیتے۔" حسین نے کہا۔

" یار! اسٹیٹمنٹ تو مجھے ہی بنانا ہے۔"

" تم فون کر کے بات تو کرو۔"

بشر نے دفتر فون ملایا، سپرنٹنڈنٹ تو نو بجے دفتر پہنچ جاتا تھا، اس نے کہا " فکر کرنے کی ضرورت نہیں، ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ کل شام دلی سے ٹیلیکس آیا تھا۔ چیرمین صاحب سویرے ہی دلی روانہ ہو گئے اب دو روز بعد لوٹیں گے، تم چاہو تو اتفاقیہ رخصت لے لو یا پھر دوپہر میں آجاؤ۔"

بشر کے سر سے ایک آفت ٹلی۔ وہ بالکل نارمل ہو گیا۔ ہوٹل سے واپس ہوئے تو جنازہ تیار تھا۔ قریبی رشتہ دار آخری دیدار کے لیے جا رہے تھے۔ دبی دبی سسکیوں، آہوں اور چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں وہ اور حسین کمرے میں داخل ہوئے۔

رابعہ خالہ کی لاش رکھی تھی۔ سرہانے اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ چہرہ کھلا تھا، پُرسکون چہرہ۔ آخری سفر کے لیے تیار، ہنستا مسکراتا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر انھیں ٹکٹکی جمائے دیکھتا رہا پھر یوں بے ساختہ آنسوؤں کا جھرنا بہہ اٹھا۔ حسین اسے سنبھال کر باہر لے آیا۔

جنازے کو کندھا دینے میں وہ پیش پیش رہا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے اسے وہ پوپلے منہ کے بوڑھے یاد آئے۔ جنازہ رکھ کر جب لوگ سستانے، وضو بنانے لگے تو وہ پھولوں کی دکان کی طرف چل دیا

اس نے قریب جاکر دیکھا۔ ان بوڑھوں کے چہروں پر عجیب اطمینان تھا وہ واقعی بڑے مطمئن اور ماحول سے بے نیاز تھے گویا کہہ رہے ہوں کہ ہم تو دنیا کے سارے سرد و گرم دیکھ چکے ہیں دنیا سے کیا لینا دینا، جب بلاوا آئے گا چلے جائیں گے۔

نماز جنازہ اس نے بڑے خشوع وخضوع سے ادا کی۔ دفنانے میں عزیزوں کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ فاتحہ پڑھ کر لوگ رخصت ہوئے۔ بشر رک گیا اس نے سوچا اب وہ آیا ہے تو والدین کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جائے گا۔

والد کی قبر تلاش کرنے میں اسے دقت نہیں ہوئی۔ اس نے قبر پر پڑا جھاڑ جھنکار صاف کیا۔ بھشتی گزر رہا تھا اسے آواز دے کر پانی منگوایا۔ جتنی دیر میں اس نے فاتحہ پڑھی بھشتی پانی لے آیا۔ والد کی قبر کے برابر میں والدہ کی قبر تھی۔ اس نے دونوں قبروں پر پانی بہایا۔ بھشتی روپے لے کر چلا گیا۔ بشر قبر کی پائینتی بیٹھ کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ فاتحہ پڑھ کر اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اطراف میں نظر دوڑائی۔ ویران قبرستان میں دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا صرف ہوا کی شائیں شائیں سنائی دے رہی تھی۔ درختوں سے گزر کر آتی شفیق ٹھنڈی ہوا کی تھپکیوں سے اس پر غنودگی چھانے لگی۔ پیر بوجھل ہو کے چلے گئے، زمین نے پیر پکڑ لیے۔ کیسی اپنائیت تھی یہاں۔ اسے اپنے بچپن کا گھر یاد آیا۔ والدین کے زیر سایہ وہ کتنا خوش تھا کچھ ایسی ہی کیفیت اسے اب محسوس ہوئی۔ فضا میں خالی پن تھا مگر کسی قدر سکون بخش۔ کچھ دیر بیٹھا وہ ہوا کی شائیں شائیں سنتا رہا پھر پیر موڑ کر ماں کی قبر کے سہارے لیٹ گیا اور تھوڑے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہوا کی شائیں شائیں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ اس طرح لیٹا رہتا شاید وہ سو جاتا لیکن خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

دور کچھ فاصلے پر ایک تازہ قبر کے نزدیک اسے چند لوگ کھڑے نظر آئے۔ قبر پر پھولوں کی چادر پڑی تھی۔

رفعت نواز

خواب سراب

دن تو جیسے تیسے گزر جاتا لیکن رات کو تھک کر بستر پر لیٹتا تو لگتا جیسے بستر پر کانٹے بکھرے ہوں، کسی کروٹ چین نہ ملتا، نیند اُڑ جاتی اور ملی لوئی خیالات لیٹنے نہ دیتے، بار بار اٹھ کر پانی پیتا، سگریٹ پر سگریٹ پھونک جاتا لیکن اس کے خیال سے چھٹکارا نہ ملتا۔ کئی دنوں سے یہی کیفیت تھی۔ بیوی تو اس سے زیادہ ہی پریشان تھی، رات میں بھی وہ ٹہلتی رہتی، بار بار اس کے پلنگ کے پاس آتی اور بڑبڑانے لگتی، رندھے گلے سے پہلے تو التجا کرتی جواب نہ پاکر اسے سنگدل، بے حس اور ظالم تک کہہ دیتی۔ اسے بیوی سے ہمدردی تھی، اس کے جذبات کو سمجھتا تھا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا تسلی دیتا تو وہ بگڑ جاتی اور ساری ذمہ داری اس پر ڈال دیتی۔ بیوی کا خیال تھا کہ یہ سب اس کی ضد کی وجہ سے ہوا تھا اگر وہ بیٹے کی بات مان لیتا تو ایسا نہ ہوا ہوتا۔ وہ خود کو حق پر سمجھتا تھا۔ بیٹے کی بات وہ کیسے مان لیتا۔ اگر مان بھی لیتا تو اس کا کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیٹا سیڑھی سیڑھی چڑھ کر سب سے اوپر والی منزل پر پہنچے۔ اسے محنت کرنا پڑے تو منزل پر پہنچ کر احساس ہو کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت لگتی ہے۔ لیکن بیٹا تو لفٹ کے ذریعہ ایک منٹ میں سب سے اوپر والی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا لیکن ایسا ہونا ممکن کہاں تھا۔ وہ بیٹے کو پیار سے سمجھاتا، اپنی جدوجہد کی کہانی سناتا اور چاہتا کہ وہ بھی ایسی ہی جدوجہد کر کے منزل پر پہنچے۔ اس کی باتیں بیٹا بے دلی سے سن لیتا لیکن اس کا رد عمل ایسا ہوتا کہ اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ بیٹا اس کی

ماموں کو داستان سے زیادہ اہمیت دے رہا تھا کہ وقت گزاری کے لیے سن لی جاتی ہے۔ برسوں سے بیٹے کو آپ بیتی سناتا آ رہا تھا۔ اس نے قسمیں کھا کر یہ بات بیٹے کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی تھی کہ اس کی آپ بیتی میں ذرا سی بھی جھوٹ کی ملاوٹ نہیں ہے، ایک بات بھی غلط نہیں ہے۔ ماں باپ جب مرے تو وہ چھ سال کا تھا اور اس کی بہن آٹھ سال کی تھی۔ ماموں نے مجبوراً اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ بہن گھر کے کاموں میں ممانی کا ہاتھ بٹاتی اور وہ ماموں کے بچوں کی گالیاں سنتا، مار کھاتا تھا اور ان کے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اسکول جاتا تھا۔ دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی لیکن بڑی شفقت کرنے اور ذلت اٹھانے کے بعد جوں توں کر کے ہائی اسکول پاس کر لیا تو روٹی ملنا بھی بند ہو گئی اور گھر سے نکال دیا گیا۔ بغیر ٹکٹ کے ٹرین میں سوار ہو گیا۔ پکڑا نہ گیا تو بمبئی پہنچ جائے گا۔ اگر پکڑا گیا تو کچھ دنوں تک روٹی کا سہارا تو ہو جائے گا۔ دو دن سے بھوکا تھا جسم پر میلے کپڑے تھے۔ دادر ریلوے اسٹیشن پر اتر گیا، ٹکٹ چیکر کی نظر چوکی اور ہجوم کے ریلے میں باہر نکل گیا۔ تین ہوٹلوں میں کام کی تلاش میں گیا، ضمانت مانگی گئی۔ ایک مندر کی سیڑھیوں پر نڈھال ہو کر گر گیا۔ ایک مہربان نے محبت سے احوال پوچھا، روٹی کھلائی، اپنی کھولی کے سامنے سونے کو جگہ دی اور کیپسول بنانے والی فیکٹری میں کام بھی دلایا۔ دن بھر فیکٹری میں کام کرتا رات میں دو گھنٹے ایک ٹائپ رائٹنگ انسٹی ٹیوٹ میں ٹائپنگ سیکھتا۔ چار سال یوں ہی گزر گئے۔ وطن کی یاد ستانے لگی، بہن کی محبت نے کلپایا، گھر بسانے کی دھن تھی۔ وطن لوٹا تو پورٹیبل ٹائپ رائٹر بغل میں تھا اور باقی دو پیسے جیب میں۔ دو وکیلوں کے یہاں جز وقتی کام مل گیا۔ سول کورٹ کے سامنے کلرکی کا لائسنس حاصل کر لیا۔ دن بھر وہاں بے تکان ٹائپنگ کا کام کرتا۔ ... بڑھتی ہی گئی۔ پھر شہر کے گنجان علاقے میں ٹائپ رائٹنگ انسٹی ... ٹائپ رائٹر خریدے، فیوٹر رکھا، انسٹی ٹیوٹ رجسٹرڈ کرا لیا۔ کاروبار

چل نکلا۔ اچھے گھرانے میں شادی رچائی، چھوٹا سا گھر بسایا۔ زندگی میں پہلی بار شگفتہ ملا۔ بیٹا پیدا ہوا تو جیسے خوشیوں کی تکمیل ہو گئی۔ بیٹا چار سال کا ہوا تو شہر کے سب سے اچھے اسکول میں ایک ہزار روپے بلڈنگ فنڈ میں دے کر داخلہ دلوایا۔
پانچویں کلاس سے ہی ٹیوشن دلانے لگا۔ بیٹے کو ڈاکٹر بنانے منصوبے باندھنے لگا۔ بیٹا اچھے قد اور کاٹھی کا تھا گیہواں رنگ، سر پر گھنے گھنگریالے بال، اس کے ہاتھوں پر بھی گھنے بال تھے۔ اسے یقین تھا کہ لڑکا ڈاکٹر بنے گا۔ بچپن میں سرکاری اسپتال کے ڈاکٹروں کو دیکھا تھا وہ بڑے وجیہہ ہوتے تھے اور ان کے ہاتھوں پر گھنے بال ہوتے تھے اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ڈاکٹر وجیہہ ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں پر گھنے بال ہوتے ہیں۔
بیٹا ایس۔ ایس۔ سی میں سیکنڈ کلاس پاس تو ہو گیا تھا لیکن کالج میں اس کی توجہ کورس کی کتابوں سے ہٹتی گئی فلم اور ڈراموں میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ اچھے اچھے اور قیمتی کپڑوں کا شوق بڑھا، اسکوٹر کے لیے ضد کرنے لگا۔ وہ ان فرمائشوں پر روک لگانا چاہتا تھا، اسے محنت کا عادی بنانا چاہتا تھا اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ آرام طلبی علم کی راہ کا بڑا روڑا ہے یہی وقت ہے کہ دل لگا کر پڑھے فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرے۔ لیکن بیٹا اس کی باتوں پر دھیان ہی کہاں دیتا تھا پھر ماں کی حمایت بھی اسے حاصل تھی اور چاہتے ہوئے بھی اسے بیٹے کی فرمائشوں کی تکمیل کرنا پڑتی تھی، وہ کڑھتا رہتا اور بیوی اسے ڈراتی رہتی کہ بے جا سختی کی گئی تو لڑکا باغی ہو جائے گا نہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا جیسا وہ چاہتا تھا ویسا ہو نہیں رہا تھا۔ بیٹا کالج چھوڑ دینا چاہتا تھا اور کاروبار میں تبدیلی چاہتا تھا۔ ٹائپ رائٹنگ انسٹی ٹیوٹ بند کر کے آفسٹ پرنٹنگ پریس خریدنے کا مشورہ دے رہا تھا، اخبار نکالنا چاہتا تھا اور کتابیں چھاپنا چاہتا تھا، بنک اور فنانس کارپوریشن سے قرض لے کر کاروبار پھیلانے کا مشورہ دے رہا تھا

وہ ان اُلجھاؤں میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ جب بھی بیٹا کاروبار کی بات چھیڑتا وہ بھڑک اٹھتا تھا۔ اس مسئلہ پر دونوں میں اکثر جھگڑا ہوا کرتی۔ ماں بیٹے کی طرف داری کیا کرتی تھی۔ وہ ذرا اونچی آواز میں اختلاف کرتا تو بیٹا اس سے بھی اونچی آواز میں جواب دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بیٹے کو جھڑکتا تو بیوی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور بیٹا غصّے میں بڑبڑا کر باہر چلا جاتا۔ یہ ڈرامہ کئی دنوں سے چل رہا تھا۔ لیکن اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس دن ناشتے کی میز پر لڑکے نے پرنٹنگ پریس کی بات چھیڑ دی تھی، ہمیشہ کی طرح اس نے مخالفت کی تھی، بات بڑھ گئی تھی اور وہ غصہ میں انسٹی ٹیوٹ چلا آیا تھا۔ کام زیادہ تھا اس لیے دوپہر کو بھی گھر گیا نہیں تھا۔ رات کو گھر پہنچا تو لڑکا غائب تھا۔ بیوی نے بتایا کہ دوستوں کے ساتھ کسی تفریحی پروگرام میں گیا ہے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے لڑکا آیا تو اس نے دروازہ کھولا تھا اور دیر سے آنے پر ڈانٹا بھی تھا۔ بیٹے نے بدتمیزی سے جواب دیا تو دو طمانچے بھی لگا دیئے تھے اور لڑکا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو لڑکا غائب تھا۔ الماری کا لاکر کھلا پڑا تھا اور چار ہزار روپے اڑا لیے گئے تھے۔ بیوی نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ وہ بیٹے کے دوستوں سے پوچھ گچھ کر چکا تھا کہیں سے پتہ نہ چل سکا۔ قریب کے دیہاتوں میں اپنے ملنے والوں کے یہاں بھی جا کر دیکھ آیا تھا۔ بیوی کو روتا دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتا لڑکے سے بچھڑنے کا اسے بھی دکھ تھا لیکن بیوی کی طرح وہ رو تو نہیں سکتا تھا۔ رات میں بستر پر لیٹے لیٹے بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے کبھی اس کے تصور کی آنکھ دیکھتی کہ بڑا شہر ہے لوگوں کا ہجوم ہے کہ بیگانہ وار گزرتا جا رہا ہے، پریشان، حیران بیٹا کھڑا ہے چہرے پر نقاہت ہے، بھوک سے چکرا کر گر رہا ہوتا ہے کہ کوئی تھام لیتا ہے محبت کے بول بولتا ہے، روٹی کھلاتا ہے، رہنے کو جگہ دیتا ہے، کام دیتا ہے

بیٹا من لگا کر کام کر رہا ہے۔ رات میں کسی انسٹی ٹیوٹ میں بھی جاتا ہے۔ [illegible] کورس کر رہا ہے کہ تصور ٹوٹ جاتا ہے اور حقیقت کا سامنا ہوتا ہے جو تصور سے یکسر مختلف تھی۔ کبھی کبھی خود کے اور بیٹے کے فرار ہونے کے حالات کا موازنہ کرتا تو اس بات سے تسلی ہوتی کہ بیٹے کے پاس روپے ہیں۔ وہ تو خالی ہاتھ تھا۔ بیٹا اس کے مقابلے میں صحت مند اور وجیہہ ہے، فر فر انگریزی بولتا ہے، کسی بھی جگہ فٹ ہو سکتا ہے۔ جب محنت کر کے کمانے لگے گا تو اسے احساس ہو گا کہ روپیہ کمانے میں خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے اور جسمانی مشقت کے بعد روٹی کھائی جائے تو اس کا ذائقہ ہی بدل جاتا ہے۔ روپے جانے کا اسے غم نہیں تھا بلکہ وہ روپیوں کو بیٹے کو راہ راست پر لانے کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ حقائق کی بھٹی میں آگ سے تپ کر نکلے گا تو وہ کندن ہو جائے گا۔

لیکن بیوی کو وسوسوں نے ہلکان کر دیا تھا۔ کسی نے چاقو گھونپ کر اسے ہلاک نہ کر دیا ہو، جیب کترے نے روپے نہ اڑا لیے ہوں، بیٹا بھوکا پیاسا بھٹک رہا ہو گا، اس کا چہرہ کمہلا گیا ہو گا، گھبرا کر خودکشی نہ کر بیٹھے۔ ملاؤں اور نجومیوں کے گھروں کے پھیرے لگا رہی تھی، ٹونے ٹوٹکے کرنے والوں کو بلا رہی تھی، درگاہوں پر جا کر منتیں مانگ رہی تھی، گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

اس رات بھی بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ لپک کر دروازہ کھولا، لڑکا ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری لیے کھڑا تھا۔ بیٹے نے جھک کر سلام کیا تو وہ اس سے لپٹ گیا۔ بیوی بھی دوڑتی ہوئی آئی اور بیٹے کو لپٹا کر رونے لگی۔ بیٹے نے رک رک کر کہا "سوری ممی، سوری پاپا! آپ لوگوں کو بتائے بنا ہی بمبئی چلا گیا تھا۔ دراصل میں یہاں کے ماحول سے اکتا گیا تھا سو چلا گیا تھا۔ پاپا! بمبئی میں میں نے ایک اچھی آفسٹ پرنٹنگ مشین دیکھی ہے اس کے بارے میں لٹریچر بھی لے آیا ہوں اور کچھ ٹریننگ بھی لے چکا ہوں۔ اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔" "میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں بیٹے" اس نے رندھے گلے سے کہا اور آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گیا۔

ش۔ حیات

خلیفہ

کتنی عجیب ہے یہ زندگی۔ نہ جانے کتنے روپ ہیں اس کے کبھی عالیشان محلوں، تفریح گاہوں میں اپنی تمام رعنائیاں لٹاتی، قہقہے بکھیرتی نظر آتی ہے تو کبھی رنج و غم سمیٹے کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید ہو جاتی ہے کبھی مسکراہٹوں تو کبھی آنسوؤں میں ڈھل جاتی ہے یہ زندگی۔ اب آپ ہی دیکھیے نا کچھ لوگ کس چین سے ایرکنڈیشنڈ کمروں میں زندگی کا لطیف احساس کرتے ہوئے اپنی عمر کے حسین لمحے گزارتے ہیں تو چلچلاتی دھوپ میں ــــ تیز بارش کے درمیان یا سخت سڑکوں پر ــــ تپتے ہوئے کھیتوں کھلیانوں میں لڑتے لڑتے گزرتی ہے کچھ لوگوں کی زندگی۔

اب یہی دیکھیے، سورج پہاڑیوں کے پیچھے نہ جانے کب کا چھپ چکا ہے پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ چکے ہیں، دن بھر کے دکھڑے دھندے کے بعد تھکے ہارے انسان بھی اپنے گھروں میں واپس آ گئے ہیں، شام گہرا چکی ہے رات شروع ہونے والی ہے مگر ابھی تک اس چھوٹے سے شہر آرہ کے ریلوے سٹیشن پر ڈٹا ہوا ہے خلیفہ ــــ جب تک سگنل نہ آ جائے وہ یہاں سے ہلنے کا ہی نہیں ــــ بس انتظار کرتا رہے گا کسی پسنجر کا ــــ مگر کیوں؟ آخر کس لیے تاکہ وہ زندگی سے لڑنا چاہتا ہے۔ اپنی محنت کے سہارے اپنی زندگی کے تاریک گوشے روشن کرنا چاہتا ہے۔

آپ خلیفہ کو جانتے ہیں؟ ضرور جانتے ہوں گے، وہ آپ کو آرہ کی ہر

سڑک پر نظر آسکتا ہے اپنے مچلاتے ہوئے رکشے کی پیڈل پر تیزی سے پیر مارتے ہوئے شہر کے بازاروں، دفتروں، اسکولوں اور کالجوں تک بھاگتا ہوا۔ گورا رنگ، مگر دھوپ سے جل کر ماند پڑ گیا، چہرہ، دراز قد، دبلی پتلی کایہ، چوڑے چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی، بے ترتیب بال ــــ یہی تو ہے اس کا پورا حلیہ ــ ایک پرانی لنگی اور بوسیدہ سی گنجی میں ملبوس وہ ہر وقت بھاگتا رہتا ہے۔ شاید بھاگتے رہنا ہی اس کی زندگی ہے ــــ بھاگتے رہنا بھاگتے رہنا ــــ

آج گرمی شباب پر ہے۔ اس نے اپنے گمچھے سے پسینہ پونچھ کر پلیٹ فارم کی طرف نظر دوڑائی، شاید ٹرین آنے میں ابھی دیر ہے۔ تھوڑا آرام کر لیا جائے اس نے سوچا اور اپنے سجے سجائے رکشے کی نئی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا تھوڑی دیر میں ہی اس کے کانوں کے بالکل قریب کسی دوسرے رکشے کی گھنٹی جھنجھنا اٹھی۔ اس نے اپنی بند آنکھیں کھولیں سامنے گنیش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

" کا ہو کھلیپھا بھیا سو گئے تھے کا ہو؟" گنیش نے مسکرا کر سوال کیا تھا اُس سے۔

" نا ہو گنیش بھائی، ایسے ہی انکھوا بند کیے تھے" مسکرا کر ہی جواب دیا تھا خلیفہ نے۔

" تنی کھینی بناؤ نا بھیا" گنیش نے تمباکو کا مطالبہ کیا۔

خلیفہ نے لنگی کی گانٹھ سے کھینی اور چونے کی ڈبیہ نکالی اور اپنی ہتیلی پر کھینی کے چھوٹے چھوٹے چونے کے ساتھ ملنے لگا۔

" اور، تا گنیس کا حال چال ہے؟" اس نے گنیش کی خیریت دریافت کی۔

" کا حال بتائیں ہو ــــ حالوا تو کھرابے ہے، ہمنی شسری روج رو

بڑھتی جارہی ہے۔ چاول، دال، آٹا، مسالہ سب تو مہنگے ہوگیا ہے بھائی کا کھائے آدمی، کا پہنے کا کرے ــــ"

"ہاں ہو بھائی ــ ٹھیک کہتے ہو۔ جینا مسکل ہوگیا ہے اب تو ــــ ایک تو ای مہنگائی بڑھ سے بابرے دوسرے روج روج دنگا پھساد۔ سن سن کے جی گھبرا گیا ہے"۔ خلیفہ نے گنیش کے خیال کی تائید میں اپنی بات رکھی۔

"کا بھائی! کا گھر پھر چل رہا ہے؟" پاس آتا ہوا ہردیا آہستہ سے بولا۔

"کچھو نا ہوا ایسے ہی دیکھ سکو۔ تیار ہے تھے"۔ خلیفہ نے کھینی ٹھوکتے ہو جواب دیا پھر چٹکی بھر کھینی ہردیا اور گنیش کو بانٹنے کے بعد باقی بچی کھینو اس نے اپنے ہونٹوں تلے دبالیا۔

"کھلیبھا بھائی، بچیا کا کا حال ہو ــــ کچھ سدھار ہوا کہ نہیں؟" ہردیا نے اس کی بیمار بچی کی خیریت دریافت کی۔

"ابھی تک بخار نا اترا بھائی، دھیرے دھیرے کمجور ہوتی جارہی ہمری حالت کھراب ہوتی جارہی ہے ــــ کا بتاویں ــــ اِتنا پیسہ بھی نہیں ہے کہ جم کر کوئی بڑا ڈاکٹر سے علاج کراویں"ــــ اچانک خلیفہ کی اداس آنکھو کی اداسی مزید گہری ہوگئی اور چہرے پر مایوسی کے بادل چھاگئے۔

"نا بھیا! پیسے بھی ہو، بڑھیاں ڈاکٹر سے دکھاؤ نا تو لوٹو کی ہاتھ سے بے ہاتھ ہوجائے گی"۔ گنیش نے اس بچی کے لیے اپنی تمام ہمدردیاں اُنڈیل کر رکھ دیں۔

"ہاں" خلیفہ نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا "اچھا ڈاکٹر سے دکھانے کے واسطے پیسو تو ہونا چاہیے بھائی ــــ کوسس تو بہت کررہے ہیں، بچا اور یا ہر کے دُکان سے کچھ کھانا پینا ابھی چھوڑ دیئے ہیں کہ او ہی پیسوا بچے تو کچھ کے کام آوے۔ کچھ پیسا اکٹھا بھی ہوگیا ہے۔ آج ڈاکٹر بدلنے کا کہاں ہے بھائی

اور بولتے بولتے خلیفہ کی اداس آنکھوں میں بخار سے تپتی پانچ سال کی بھولی سی بچی منی کا چہرہ ابھر آیا —— "بابا! ہم کب اچھا ہوں گے؟" منی بار بار پوچھ چکی تھی منی یہ سوال اس سے۔ اور ہر بار اس معصوم سوال نے اس کو اندر تک ہلا دیا تھا۔ کتنا درد چھپا تھا اس سوال میں، کتنی تڑپ تھی اس کا جواب تو وہ اور صرف وہ ہی کر سکتا تھا۔ مگر اندر سے تڑپ کر پھر بھی خاموش رہ جاتا تھا خلیفہ —— کوئی جواب نہیں دے پاتا تھا اپنی معصوم بچی کو جو پچھلے بیس دنوں سے بخار سے مسلسل تپ رہی تھی —— جسم لگاتار جلتا اور تپتا رہا تھا بیس دنوں سے آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں، چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور ان پر پپڑیاں جم گئی تھیں، سارا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا ان بیس دنوں میں۔ اور وہ محلے کے باہر سڑک پر ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنرجی صاحب کی دکان کی دو روپے والی پڑیا سے کام چلائے جا رہا تھا۔ کیا کر سکتا تھا بیچارہ، اگر دن بھر کی کمائی منی کی بیماری میں لگا دیتا تو گھر کے سب لوگ کیا کھاتے —— بھوکوں نہیں مرنا پڑتا سب کو، اسی لیے دو روپے کی پڑیا پر اب تک اکتفا کرتا رہا تھا وہ۔ ڈاکٹر بنرجی بتلا رہے تھے کہ منی کو ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ کڑی سے کڑی دوا دے رہے تھے ڈاکٹر بنرجی، مگر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ مرض کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہا تھا اور روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی تھی اس کی بچی۔

"اے جی! بڑھیاں ڈاکٹر سے دکھا دے نا، اچھی ہو گی مری بچی" کہہ رہی تھی بیوی اس سے۔ تب وہ کیا کرے —— شہر کے کسی بڑے انگریزی ڈاکٹر سے دکھا دے منی کو —— مگر شہر کے بڑے ڈاکٹروں کو دکھانے کے لیے تو تھیلے کی بڑی تھیلی بھی چاہیے نا۔ اس کی بیوی لاڈلی تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ بس ایک بار کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس جاؤ، اور ایک سلسلہ بن جاتا ہے —— خون کی جانچ کراؤ، پیشاب پاخانہ کی جانچ کرواؤ، ایکسرے کراؤ، سوئی لگواؤ، سو روپے

جانچ وانچ کے چکر میں خرچ کرو تب جاکر نسخہ لکھیں گے ڈاکٹر صاحب، اور تب جاؤ بازار میں دوائیاں خریدنے اور دیکھو دوائیوں کی قیمت — خدا کی پناہ — سو روپے سے کم میں دوائیاں مل ہی نہیں سکتیں بازار میں۔ روپیوں سے جیب بھری ہو تب جا کے بات نہیں بنتی ہے۔ ایک چھوٹی سی شیشی کے بھی پندرہ بیس روپے لگ جاتے ہیں۔ اب بھلا اس کے پاس اتنے سارے پیسے ایک ساتھ کہاں سے آئیں گے۔ پھر وہ کیا کرے ؟ اپنی پھول سی بچی کو یونہی موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھتا رہے ؟

"کا ہو کھلیسا بھیا کہاں پہنچ گئے کچھو سوچے لگے کا بھائی ؟" ہردیا نے ٹوکا تو چونک پڑا خلیفہ۔

"اوں — ہاں ہو منی سوچنے لگے تھے :" اس نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

تبھی اسٹیشن کے مائیکرو فون سے پٹنہ صاحب بکسر شٹل کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ ہردیا اور گنیش دونوں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"اچھا — اب ہم چلتے ہیں کھلیسا بھیا۔ بھگوان تیری بچیا کے جلدی اچھا کریں :" اور دونوں اپنے اپنے رکشوں کی طرف بڑھ گئے۔

کچھ ہی منٹوں میں شٹل پلیٹ فارم نمبر دو پر آ لگی تھی۔ ٹرین سے اتر کر لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

"کیوں بھئی، گوپال چوک چلو گے ؟" ایک مسافر خلیفہ سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں مالک، جرور — جرور چلیں گے :"

"کتنے پیسے لو گے ؟"

"بس تین روپے :"

اور مسافر کے بیٹھ گیا تھا رکشے کو اسٹینڈ سے باہر نکال رہا تھا خلیفہ۔ گلی سے سواری ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا رکشہ سب سے

صاف ستھرا اور سجا سجایا رہتا ہے۔ مسافر خود بخود اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ رکشے کا مالک ہمیشہ ایک نیا رکشہ اس کے ذمے لگائے رکھتا ہے اور وہ بھی تو بڑی تندہی سے رکشے کی صفائی اور دیکھ بھال کیا کرتا ہے۔ رکشے کے پیڈل، فریم، گھنٹیاں، سیٹ اور پردے سب ہم ہم چمکتے رہتے ہیں۔ بہت محنتی ہے خلیفہ، یہ بات مالک اچھی طرح سمجھتا ہے۔

اس نے رکشے کو موڑا۔ اب اس کا رکشہ اسٹیشن سے شہر کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ رہا تھا۔

آج گرمی بھی کچھ زیادہ ہی پریشان کن تھی اور ہوا چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ عجیب حبس اور گھٹن کا احساس فضا میں گھل گیا تھا۔ پسینہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سچ مچ برسات کی گرمی بڑی پریشان کن ہوجاتی ہے۔ آدمی ایکدم سے بے چین ہوجاتا ہے۔ بار بار اپنے گمچھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا خلیفہ، گنجی پسینے سے ایسے شرابور ہوچکی تھی جیسے وہ ابھی دھو دی تھی ہو۔ نچوڑ دو تو ڈھیروں پانی نکل آئے۔ ایسے میں رکشہ کھینچنا بڑی جانفشانی اور دل گردے کا کام ہوجاتا ہے۔ اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں مگر آج بھی اسٹیشن سے سواری لے کر چل پڑا تھا خلیفہ۔ اس کے پیر پیڈل پر تیز تیز چل رہے تھے ماتھے سے ٹپکتا پسینہ آنکھ اور منہ میں داخل ہونے لگتا تھا۔

"پانی نہیں برس رہا ہے، ای گرمی تو جان لے لے گی" وہ خود ہی بڑبڑایا تھا۔

آج ہر حالت میں وہ اپنا کام جلدی نپٹا کے گھر جانا چاہ رہا تھا۔ شاید آج منی کو ڈاکٹر سے دکھانا تھا اسے۔ لاڈلی بھی اس کا انتظار کررہی ہوگی گھر پہ ــــ گھر ــــ ہاں لفظ گھر پر اسے یاد آیا تھا۔ باپ دادا کا بنایا ہوا اس کا اپنا ایک گھر بھی ہے اس آرہ شہر میں۔ میر گنج بستی کے نزدیک ــــ چھے

ہوئے گندے پانی کوڑے کے ڈھیر اور سڑاندھ پیدا کرتی نالیوں کے بیچ ایک گھر —— ایک گھر جس کی دیواریں مٹی کی ہیں، مٹی کا ہی فرش ہے اور چھپر پھوس کے مٹی کی ٹیڑھی میڑھی دیواروں سے بنے مرغی خانے جیسے فقط دو مدد کمرے ہیں اس گھر میں جن میں صرف سیلن اور بدبو ہے کیونکہ نہ باہر کی ہوا آتی ہے ان میں دھوپ کی روشنی۔ برسات میں چھپر کا ہر سوراخ خوب کھل جاتا ہے اور سیلاب آجاتا ہے ان کمروں میں شام کے ہوتے ہی مچھروں کی فوج کونوں، کھدروں سے نکل کر یلغار کر دیتی ہے اور آفتاب کے نکلتے ہی شروع ہو جاتا ہے مکھیوں کا خطرناک حملہ۔ ہاں اس گھر کے دوزخ میں تو اس کی بیوی، لاڈلی بیٹی منی، اور چھوٹا بیٹا عبدل سب زندگی کا عذاب جھیل رہے ہیں۔ مگر اس کا خاندان ہی اس دوزخ کو نہیں جھیل رہا ہے۔ اس کے ہی جیسے ہیں یہاں کے سارے لوگ ایسے ہی کوڑے کے ڈھیر گندے پانی اور سڑاندھ پھیلاتی نالیوں کے بیچ جی رہے ہیں سب کے سب۔ اس چھوٹی سی بستی میں اگر پانی کہیں نظر آتا ہے تو صرف گندی نالیوں میں ورنہ پانی کے ایک گھڑے کے لیے محلہ کے باہر سڑک پر کافی دور کے نل پر جاتے ہیں بستی کے لوگ۔ اگر بارش ہو جائے تو ندی بن جاتا ہے پرنالہ اور رستے پر ہی بہنے لگتا ہے۔ پھر اسی میں کھیلتے ہیں بستی کے بچے —— اسی میں تیرتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف اچھال کر خوش ہوتے ہیں پھر یہ پانی غلاظتوں کے ڈھیر چھوڑ کر سرک جاتا ہے اور پھر گندگی اور سڑاندھ میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ گندگی، یہ سڑاندھ ان کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے جسے جھیلتے جھیلتے ان کے بچے بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں۔

پتہ نہیں کیا ہوا، نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ رکشے کے بریک پر خود بخود ... سامنے آتے ہوئے تم تم سے ٹکرا ہی جاتا خلیفہ، تم تم والا اسے ... نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ کچھ

یں سوچے گا کہیں ایکسیڈنٹ ہوجاتا تو ؛
اچانک رکشے نے ایک زور کا جھٹکا کھایا اور مسافر گرتے گرتے بچا۔ اندھیرے
سڑک کے کسی خود ساختہ گڑھے میں اتر گیا تھا رکشے کا اگلا پہیہ۔ اس نے
سنبھال نہیں لیا ہوتا تو زبردست حادثہ ہو سکتا تھا۔ مسافر کے ہاتھ
ر تو ٹوٹ ہی سکتے تھے۔
"ایک تو شہر کا سب سڑک کھراب ہے اوپر سے بجلیو نہیں رہتی ہے
۔ پتہ نہیں اس سہر کا کونو مائی باپ بھی ہے کہ نہیں؛ شہر کی بدتر حالت
جھلا گیا تھا خلیفہ۔
"کیوں بھئی ایسا کیوں ہے ؟ یہ تو بڑا پرانا اور تاریخی شہر ہے" مسافر
اس سے خرابیٔ حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔
"اب کا بتائیں مالک۔ ای سہر کا تو حلئے کھراب ہے۔ بابو کنور سنگھ اور
ب جیون بابو کا علاقہ ہے۔ بڑے بڑے لوگ ایمیسر منتری ہوئے ہیں
اں، مگر آج تک سہر کے بارے میں کسی نے کچھو نہیں سوچا۔ سب سرکاری
پیسہ ٹھیکے دار مل کر پیسہ کھا جاتے ہیں۔ سڑک آدھا سو دھا مرمت ہوتی
ہے۔ سب کام کاغج پر ہی ہو جاتا ہے۔ کوئی دیکھنے والا ہو تب نا۔ سڑک ٹوٹی
ی ہے۔ نالا کا گندہ پانی ایسے ہی سڑک پر بہتا رہتا ہے۔ بھائی لوگ پینٹ
با اٹھا کر سڑک پار کر جاتے ہیں۔ کیچڑ میں جہاں تہاں پیر گھس جاتا ہے
راہ بیچ سڑک پر یونہی پڑا رہتا ہے۔ گندگی اور چوپٹ حالت کے واسطے
ئی آواج نہیں اٹھاتا ـــــ پتہ نا کیسا سہر ہے لوگ سب جیج برداست کرتا
، پر جبان نہیں کھولتا۔ اسپتال ہی چلے جائیے۔ آپ جیسا بھوت آدمی جائے
تو بیمار ہو کر لوٹے گا ـــــ اور کتنا بتائیں مالک ـــــ بجلی کو دیکھیے ایسے
روج دن کٹتی ہے مگر کبھی کبھی بیس بیس گھنٹہ گائب رہتی ہے تو بھی کوئی
پوچھنے والا نہیں؛

تبھی گوپالی چوک آگیا تھا۔ مسافر نے رکنے کا اشارہ کیا تو خلیفہ کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

"بس، یہیں روک دو" مسافر نے کہا۔

اس نے دھیما کر کے رکشے کو روک دیا۔ مسافر گن کر تین روپئے لیے اور آگے بڑھ گیا۔ بے وجہ اس کی نظر گھنٹہ گھر کی طرف اٹھ گئی تھی۔ مونچھ والا کالا ٹریفک کانسٹبل وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور آگے جانے والی سڑک کی طرف چل پڑا۔

"کھلیپھا بھیا، رام رام — کھلیپھا بھیا، سلام"۔ کئی آوازیں ایک ساتھ اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ دینو، کشن، بھیکو، شبراتی، سب رکشے والے اسے سلام کر رہے تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کے سلام کا جواب دیا اور خیریت دریافت کی۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے نا بھائی لوگ؟"

"ہاں بھیا، سب دیا ہے اوپر والے کی"۔

اپنے ہم پیشہ رکشے والوں میں بے حد مقبول تھا خلیفہ۔ ان کی خوشی، غم دکھ سکھ، سب میں وہ یکساں طور پر شریک ہوتا تھا بلکہ بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تھا۔ شہر کے سارے رکشے والے اسے اچھی طرح پہچانتے تھے، سب پیار کرتے تھے اسے۔

اب وہ گوپالی چوک سے چترلولی روڈ کی طرف مڑ گیا تھا۔ تالاب پر جائے گا وہاں اس کے مالک سراج میاں کا گیراج ہے وہاں رکشہ جمع کرے گا راستے میں کئی سواریاں ملیں مگر سب سے انکار کرتا رہا تھا خلیفہ۔ اسے رکشے فارغ کر کے گھر پہنچنا ہے۔ آج پھر شٹل کے لیٹ ہو جانے سے اسے گھر ادھر دیر ہو گئی تھی۔ ملا دُلی انتظار کر رہی ہوگی۔ جب بازار سے آٹا چاول، اور مسالہ خرید کر گھر پہنچتا ہے تو کہیں چولہا سلگتا ہے اس کے گھر کا۔

ن بھر کی کمائی وہ ان سامانوں کی شکل میں ہر روز گھر لے جاتا ہے تب اس
م اور دوسرے دن کے کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ ایک دن کسی وجہ سے
بیماری کے چلتے وہ گھر بیٹھ جائے تو ایک دانہ نصیب نہیں ہوتا کسی کو۔
اب گاڑی جمع کرنے اور مالک کے ہاتھ میں بارہ روپے رکھنے کے بعد
دکو بالکل ہلکا محسوس کر رہا تھا خلیفہ۔ مگر پیٹ میں کافی ہنگامہ مچا ہوا
بھوک کا۔ آج کل وہ گھر کے علاوہ باہر کی کوئی چیز بھی نہیں کھا رہا
ا تاکہ پیسے بچیں۔ بھوک کی یاد آتے ہی اس کے قدم کافی تیزی سے بازار
طرف بڑھنے لگے۔

اب وہ میوہ لال بنیے کی دوکان پر کھڑا اپنے سامان کی تفصیل
ٹ کروا رہا تھا۔

"تین کلو آٹا، دو کلو چاول، آدھ پاؤ کڑوا تیل، دو پے کا سب مسالہ
بھو میوہ بھیا:

پیسے چکانے کے بعد ہاتھ میں سامان کی پوٹلی لٹکائے وہ بھاتی سبزی
ش کے اسٹال کی طرف لپکنے کے انداز میں بڑی تیزی سے بڑھا۔

"بھاتی بھیا! ایک آلو، پاؤ بھر پیاز اور پاؤ بھر بیگن تول دو" اس
دور ہی سے آواز لگائی۔

سبزیاں خرید کر وہ کما نی کی چائے کی دوکان کی طرف چل پڑا۔ ایک
پ گرما گرم چائے پینے۔ شہر کی سب سے اچھی اور سستی چائے ملتی ہے یہاں۔
زمانہ کا معمول ہے اس کا۔ ہر شام وہ اسی طرح شٹل کی سواری چھوڑنے
بعد گیراج میں رکشہ بند کرتا ہے، رکشہ مالک کو کرایہ ادا کرتا ہے اور سیدھا
تا ہے بازار کی طرف، وہاں سے چاول، مسالہ، سبزی وغیرہ خرید کر کمانی
یہاں چائے پیتا ہے پھر گوپالی چوک پر نیاز پان والے کے یہاں سے
ڑی خریدتا ہے اور گھو کی دوکان سے کھینی ۔۔۔ بس اسے اور کسی

نشے کی عادت نہیں۔ دوسرے رکشے والوں کی طرح وہ گانجہ یا شراب کبھی نہیں پیتا۔ آخر اسے اپنے بچوں کی پرورش بھی تو کرنی ہے۔ اپنے خاندان کے لیے روٹی پیدا کرنی ہے اسے۔ اس کے ساتھی زبردستی بھی کریں تو ہاتھ جوڑ لیتا ہے خلیفہ ـــ اور اس طرح کھینی بیڑی وغیرہ خرید کر وہ سرپٹ بھاگتا ہے اپنے گھر کی طرف۔ مگر راستے میں کہیں بڑی بڑی مونچھ والا ہیڈ ٹریفک کانسٹبل منوہر سنگھ مل جائے تو ـــ تو شامت آجاتی ہے اس کی۔ وہ جتنا بھی کٹ کر نکلنا چاہے منوہر سنگھ اسے دیکھ ہی لیتا ہے اور دبوچ لیتا ہے اسے کسی باز کی طرح۔

"ارے کھلیچوا! ادھر آؤ۔ آج کتنا کمایا ہے رے ـــ لگتا ہے ڈھیر پیسہ ملا ہے ـــ چل ہمارا حصہ نکال!"

ایسے ہی الفاظ سے منوہر ہمکلام ہوتا ہے اس سے۔ خلیفہ چپ چاپ اس کی ہتھیلی پر پانچ روپے رکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ کیا کرے۔ بچارہ۔ اگر بحث کرے تو بھیو چاٹ جاتا ہے بڑی بڑی مونچھوں والا یہ بدمعاش کانسٹبل۔ اگر اسٹیشن سے چوک تک رکشہ چلاتا ہے تو اس موٹے شرابی پولیس والے کو خوش رکھنا ہی پڑے گا۔ سب رکشے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ سب سلامی دیتے ہیں اس موٹے رشوت خور کو۔ جو سلامی نہ دے اس کی مرمت کر دیتا ہے منوہر سنگھ۔ پھر اس مار پیٹ کی کہیں بھی جاکر شکایت کرو۔ کوئی سنوائی نہیں۔ الٹا رکشہ بھی تھانے میں بند کرا دیا جاتا ہے۔ اب کون لڑے اس بدذات سے روزی روٹی بند کروانے کے واسطے۔ نتھو کہتا تھا کہ منوہر وا کی پہنچ اوپر تک ہے بڑے صاحب تک حصہ پہنچاتا ہے منوہروا۔ سارا دن رکشہ، ٹم ٹم، بس، ٹرک، ٹیمپو والوں سے پیسہ وصولتا رہتا ہے یہ منوہر سنگھ۔

"بابا! ہم کب اچھا ہوں گے؟" کانوں میں پھر جاگ اٹھا ہے منی کا معصوم سوال۔ کانپ گیا خلیفہ اندر سے۔ جیسے تیسے چائے ختم کی۔ فوراً گھر پہنچا ہے

پھر ڈاکٹر کے یہاں لے جانا ہے منی کو۔ چائے کے پیسے چکانے کے بعد تین روپے بچ گئے تھے جیب میں۔ ان روپیوں میں کچھ کل اور کچھ آج کی کمائی کے ہیں۔ گھر پر اور بیس روپے بچا کر رکھے تھے اس نے۔ کل پچاس روپے ہوئے اتنے میں شاید دوا کا کام ہو جائے۔ بچ گئی ڈاکٹر صاحب کی فیس تو یہی پہچان کے ڈاکٹر شریواستو جی سے دکھا دے گا بچی کو۔ امید ہے ڈاکٹر صاحب فیس نہیں لیں گے اس سے۔ بہت بھلے انسان ہیں ڈاکٹر بھاسکر شریواستو۔ اور پھر اس نے بھی تو ان کا بہت بڑا کام کیا تھا۔ سو سو روپے کے نوٹوں سے بھرا بیگ خود ان کے گھر جا کر لوٹا آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تو رینگتی ہوئی ٹرین کو پکڑنے کے لیے بدحواس ہو کر بھاگے تھے اور بیگ رکشے کی سیٹ پر ہی پڑا رہ گیا تھا۔ خلیفہ نے تو گنا بھی نہ تھا کہ کتنے پیسے تھے سیدھا ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کر بیگ لوٹا آیا تھا۔ پہلے بھی تو کتنی بار وہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم کو گھر تک چھوڑنے گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا گھر تو اس کا دیکھا بھالا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب خود اس سے ملنے آئے تھے اور اسے کچھ انعام دینا چاہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا "ای تو ہمارا پھرج تھا ڈاکٹر صاحب" اور کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تھا اس نے۔

"کوئی بھی ضرورت ہو تو بے جھجک چلے آنا" ایسا یقین دلایا تھا اس کو ڈاکٹر صاحب نے۔

تو وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس جائے تو وہ ضرور اس کی بچی کو اچھی طرح سے دیکھیں گے فیس بھی نہیں لیں گے، ہو سکتا ہے اپنی طرف سے دوائیں بھی دے دیں ڈاکٹر صاحب۔ اگر نہ بھی دیں تو کیا تھوڑا تھوڑا کر کے وہ خود ہی خرید لے گا۔

ایسی ہی نہ جانے کتنی باتیں سوچتا گھر کی طرف لوٹ رہا تھا خلیفہ اس کے ننگے پیر کیچڑ بھرے راستے پر تیز تیز چل رہے تھے۔ اچانک اس کے [illegible] کسی نے چھوا۔ اس نے پیچھے کی طرف گردن گھمائی۔ منوہر سنگھ [illegible]

"کیوں بے سالے ـــ آج بھی ہتا سلامی دیے ہی بھاگ رہا تھا ـــ یاد ہے چار دن سے کچھو نہیں دیلے ہے تو ـــ بیٹا ـــ آج دھرائے ہو ـــ" منوہر سنگھ کے منہ سے شراب کی بدبو پھوٹ رہی تھی۔

"ناجور ـــ ہم بھاگ نا رہے تھے ـــ آپ ہی کے پاس آ رہے تھے۔ آپ ہی کے پاس ہی آ رہے تھے مالک ـــ" اچانک نازل ہونے والی اس آفت سے گھبرا گیا تھا خلیفہ۔

"چل مال نکال" منوہر نے پیسے کا مطالبہ دہرایا تھا۔

"آپ سے ایک بات کرنا تھا ـ ایک بنتی کرنا تھا جور"

"ابے کا بنتی پھنتی لگا رکھا ہے۔ رے ـــ جلدی بول"

"اوی کہہ رہے تھے مالک ـــ آج پھر ہم کو مایہ کر دیں"

"کیوں بے ؟" ـــ آنکھیں تریر کر بولا تھا منوہر۔

"حاکم : ہمری چھوٹی والی بچی منی بہت جادہ بیمار ہے ـــ ڈاکٹر صاحب سے دکھا کے دوائی لینا ہے ـــ بس ابھی جا ہی رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس ـــ آج بھر مایہ کر دیں ـــ بس آجے بھر" گڑگڑانے لگا تھا خلیفہ۔ اس کے چہرے سے عجیب سی بیچارگی ٹپک رہی تھی۔

"ارے سسرا! تو روج روج کوئی نہ کوئی بہانہ بنا تا رہتا ہے۔ کل کسی کا اُدھار چکانا تھا تو آج دوائی لانا ہے ـــ سالا! ـــ چار دن ہو گئے کچھ نہیں دیلے ہے تو ـــ دیکھ اب جادے بدمست کر ـــ چپ چاپ سے بیس روپے نکال چار دن کے ـــ نہیں تو سمجھ لے میرا نام بھی منوہر سنگھ ہے ـــ ایک دن اندر کر دیا تو نانی یاد آ جائے گی تیری" اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کہہ رہا تھا منوہر سنگھ۔ وہ زبردستی پر اُتر آیا تھا ایکدم سے۔

"بس آجے بھر ـــ کل سب جوڑ کر دے دیں گے ـــ سب لغایا لغا کر دیں گے مالک"

"ابے بیکار بحث لڑائے جارہا ہے تو ——"

اور بات پوری ہونے سے پہلے منوہر نے زور کا دھکا دیا تھا لڑکھڑا گیا تھا خلیفہ۔ سامان کی پوٹلی زمین پر گر پڑی تھی۔ ٹھونگا پھٹ جانے سے سارا چاول اور آٹا ایک دوسرے میں مل گیا تھا۔ تیل کی شیشی زمین پر گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ سارا تیل کیچڑ میں بہہ گیا تھا۔ اس افراتفری میں روپے گنی کی جیب سے باہر جھانکنے لگے تھے۔ منوہر کی شاطر آنکھیں روپیوں کو تول رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ آگے بڑھا تھا اور سارے روپے خلیفہ کی جیب سے اس کی پینٹ کی جیب میں منتقل ہوگئے تھے۔ خلیفہ کے چہرے پر مایوسی اور غصے کے اثرات نمایاں ہو رہے تھے مگر وہ پھر بھی گڑگڑائے ہی جا رہا تھا۔

"نا مالک! ایسا ظلم مت کریئے —— بیٹی مر جائے گی ہمری۔"

تمام رکشے، ٹھم ٹھم والے ارد گرد جمع ہونے لگے تھے۔ اب منوہر روپیوں کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ خلیفہ نے اس کے پیر پکڑ لیے تھے۔

"حاکم! ایسا کٹھور نا بنیئے۔"

"ہاٹ ——" اس نے ایک بار پھر بڑے زور کا دھکا دیا تھا خلیفہ کو۔

"مالک! ای پیسہ ہم ایسے ہی نہیں جانے دیں گے —— اس میں ہمری بیٹی کی جندگی چھپی ہے —— ای پیسہ ہم کو لوٹا دو مالک" وہ چلا گیا تھا۔

"اچھا! —— تو اب کو مار کھانے کا من ہوا ہے سالے —— ہٹ جا میرے سامنے سے، اور سن میرے پیچھے مت آنا نہیں تو مار مار کو بھیجہ نکال دوں گا" ڈنڈا دکھاتے ہوئے بولا تھا منوہر۔

اب منوہر واپس جا رہا تھا اور خلیفہ اسے مایوسی سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

"بابا! ہم کب اچھا ہوں گے؟" بجلی کی تیزی سے کوندا تھا منی کا یہ سوال اس کے ذہن میں اور کسی ہتھوڑے کی طرح چوٹ مارتا ہوا اس کے دل و دماغ کے ٹکڑے کرنے لگا تھا —— یہ تیس روپے چلے گئے تو گھر پر صرف بیس

روہیوں میں وہ منی کا علاج کیسے کرسکے گا ــــ کیسے خرید سکے گا دوائیاں منی کا آخر بخار کیسے اترے گا ــــ اس طرح تو بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی اس کی بچی اور وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا ــــ اپنی کمزوری کے باعث کچھ نہیں کر سکے گا وہ ــــ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جنازے کا منظر ابھر آیا تھا۔ لوگ کسی بچے کو سفید کفن میں لپیٹے قبرستان لے جا رہے تھے۔ تو کیا اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا ــــ واقعی مر جائے گی اس کی بچی ــــ نہیں ــــ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا ــــ چھین لے گا وہ منوہر سے سارے روپئے ــــ چاہے جو انجام ہو وہ لڑے گا اس بے انصافی کے خلاف ــــ آخر وہ روپئے اس کے ہیں، اس کے پسینے کی کمائی کے ہیں یہ روپئے۔ ان پر صرف اس کا اور اس کے بال بچوں کا حق ہے۔ انہیں کوئی غیر چھین لے یہ برداشت نہیں کرے گا وہ ـ ـ ہرگز برداشت نہیں کرے گا ــــ

اور اس نے دوڑ لگائی تھی، منوہر کو اس نے پکڑ لیا تھا۔ اس کا ہاتھ جھنجھوڑتے ہوئے وہ بول رہا تھا:

"اب چاہے جو ہوئے مالک ــــ ای پیسہ ہم نہیں جانے دیں گے" نہ جانے کہاں سے اتنی خود اعتمادی آگئی تھی اس کی آوازمیں۔

"ابے پھر آگیا ــــ نہیں مانے گا تو؟" اسے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا منوہر۔

"نہیں ــــ ہرگج نہیں ــــ"

"تو ــــ لے ــــ سنبھال ــــ"

ایک دم سے پاگل ہو گیا تھا منوہر۔ اندازاً ایک دم جارحانہ بن چکا تھا خلیفہ کی پیٹھ، ہاتھ، پیر اور سر پر جگہ جگہ تڑاتڑ برسنے لگا تھا اس کا ڈنڈا۔ چوٹ کھا کر تلملا گیا تھا خلیفہ مگر کوئی آہ اس کی زبان سے باہر نہیں نکلی تھی چپ چاپ پٹ رہا تھا وہ۔ ایک وار بڑے زور سے سر پر پڑا تھا۔ وہ اپنا سر پکڑے

زمین پر گر پڑا تھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ بھیڑ میں عجیب سی ہلچل مچ گئی تھی۔ دو تین غنڈہ نما اور شبراتی بھیڑ سے باہر نکل آئے تھے اور انھوں نے اسے سہارا دے کر زمین سے اٹھا دیا تھا۔ منوہر سنگھ نے دیکھا تھا بھیڑ کی ہر آنکھ سے اس کے لیے نفرت کے شعلے لپک رہے تھے۔

پتہ نہیں کیا ہوا تھا اچانک اس تھوڑے سے وقفے میں، نہ جانے کیسے سنبھل گیا تھا خلیفہ۔ کون جانے کہاں سے طاقت آگئی تھی اس کے لاغر سے جسم میں۔ شاید اس کے اندر سے اٹھنے والی آواز ہی اسے قوت پہنچا رہی تھی شاید کوئی اس سے کہہ رہا تھا "خلیفہ اتم کمزور ضرور ہو۔ بزدل نہیں ہو۔ اکیلے بھی نہیں ہو۔ آؤ ۔ ہمت کرو ۔ پھر ظلم کی اس چٹان سے ٹکرا جاؤ۔ اس کے سامنے گڑگڑانے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ سب کا جینا مشکل کر دیا ہے اس پاپی نے ۔ اٹھو ۔ کوشش کرو اور مکتی دلاؤ سب کو اس وحشی سے ۔ تم لڑو ۔ جنگ کرو اس کا یرسے ۔ روز روز کی جھنجھٹ سے تو بہتر ہے کہ ایک دن ہی اچھی طرح نمٹ لیا جائے ۔ سوچو مت ۔ اسے مارو خلیفہ ۔ اسے مارو ۔ اسے ۔"

اب خلیفہ کا سپاٹ اور بےجان چہرہ حیرت انگیز طریقے سے تبدیل ہو چکا تھا ۔ اس کی شکل انتہائی خوفناک ہو گئی تھی ۔ غصہ، نفرت اور انتقام، سارے جذبے ایک ساتھ پھوٹ رہے تھے اس کے چہرے سے ۔ بجلی سی کوندنے لگی تھی اس کے جسم میں، رگوں میں آگ سی بھر گئی تھی۔ وہ بڑھا تھا اور ایک ہی جھٹکے سے منوہر کا ڈنڈا اب اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ منوہر پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا خلیفہ۔ اس کے ہاتھ مشین کی سی تیزی سے چل رہے تھے کلاک مونچھوں والا کڑیل کانسٹبل اب وار کرنے کی جگہ "ارے! ارے" کر کے وار بچا رہا تھا ۔ کچھ ہی دیر میں ٹوٹ گیا تھا لکڑی کا ڈنڈا۔ مگر اس کا غصہ نہیں ٹوٹ سکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک زوردار دھوبیا پاٹ مارا تھا اس

نے منوہر کو ـــــ منوہر زمین پر چت پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بھی جاری تھا۔ اس نے بیہوش منوہر کی طرف ایک حقارت بھری نظر ڈالی تھی اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا تھا۔ اب وہ اپنی چیتھڑا قمیص سے اپنے چہرے کا خون صاف کر رہا تھا۔ پوری بھیڑ اسے تحیر آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اچانک بھیڑ کے درمیان سے آواز ابھری تھی "بھاگو" اور عجیب سی بے چینی پھیل گئی تھی ہر فرد میں۔ پولیس کی ایک تیز رفتار جیپ بھیڑ کے قریب آکر رک گئی تھی۔ بڑے صاحب ڈی۔ایس۔پی اپنی بڑی سی توند لیے برآمد ہوئے تھے۔ ساری بھیڑ پر انھوں نے اپنی قہر آلود نگاہ ڈالی تھی۔ پھر سناٹے میں ان کی گرجدار آواز گونجی تھی۔

"ٹریفک کانسٹبل منوہر سنگھ کو کس نے مارا ہے؟"

سارے چہرے خاموش تھے۔ عجیب سناٹا طاری تھا ماحول پر۔ ایک بار ساری بھیڑ کا چکر پورا کر کے انھوں نے اپنا سوال پھر دہرایا تھا۔

"بتلاتے کیوں نہیں تم لوگ ـــــ منوہر سنگھ کو کس نے مارا ہے؟"

اقبال جرم میں پہلے ایک ہاتھ اوپر اٹھا تھا۔ پھر کئی ہاتھ اٹھے تھے اور چند ہی لمحوں میں ساری بھیڑ کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ بڑے صاحب سکتے میں آگئے تھے وہ حیران حیران نگاہوں سے بھیڑ کو دیکھ رہے تھے۔

میرا ماضی میرے کاندھے پر

کیفی اعظمی

اب تمدن کی ہو یہ جیت کہ ہار
میرا ماضی ہے ابھی تک میرے کاندھے پہ سوار

آج بھی دوڑ کے گلّے میں جو مِل جاتا ہوں
جاگ اٹھتا ہے میرے سینے میں جنگل کوئی
سینگ ماتھے پہ اُبھر آتے ہیں

پڑتا رہتا ہے میرے ماضی کا سایہ مجھ پر
دورِ خوں خواری سے گزرا ہوں چھپاؤں کیونکر
دانت سب خون میں ڈوبے سے نظر آتے ہیں

جن سے میرا نہ کوئی بَیر نہ پیار
اُن پہ کرتا ہوں مَیں وار
اُن کا کرتا ہوں شکار
اور بھرتا ہوں جہنم اپنا

پیٹ ہی پیٹ ملا جسم ہے، دل، نہ دماغ
کتنے اوتار بڑھے لے کے ہتھیلی پہ چراغ
دیکھتے رہ گئے دھو پائے نہ ماضی کا یہ داغ

مَل لیا ماتھے پہ تہذیب کا غازہ لیکن
بربریت کا جو تھا داغ وہ چھوٹا ہی نہیں
گاؤں آباد کیے شہر بسائے ہم نے
رشتہ جنگل سے جو اپنا تھا وہ ٹوٹا ہی نہیں

جب کسی موڑ پہ پُرکھوں کے اُڑتا ہے غبار
جانے ہو جاتا ہے کیوں سر پہ جنوں ایک سوار
کسی جھاڑی سے اُچھل کر جو کبھی ٹوٹی تھی
وہی دم پھر سے نکل آتی ہے
وہی لہراتی ہے

اپنی ٹانگوں میں دبا کے جو بھرتا ہوں زقند
اتنا گر جاتا ہوں صدیوں میں ہوا جتنا بلند
اب تمدن کی ہو یہ جیت کہ ہار
میرا ماضی ہے ابھی تک میرے کاندھے پہ سوار


تصویر: رام جل اوریا گارڈن

سَانپ

کیفی اعظمی

یہ سانپ آج جو پھن اٹھائے مرے راستے میں کھڑا ہے
پڑا تھا قدم چاند پر میرا جس دن
اسی دن اسے مار ڈالا تھا مَیں نے
اُکھاڑے تھے سب دانت، کچلا تھا سر بھی
مروڑی تھی توڑ دی تھی کمر بھی

مگر چاند سے جُھک کے دیکھا جو مَیں نے
تو دم اُس کی ہلنے لگی تھی
یہ کچھ رینگنے بھی لگا تھا

یہ کچھ رینگتا کچھ گھسٹتا ہوا
پرانے شوالے کی جانب چلا
جہاں دودھ اس کو پلایا گیا
پڑھے پنڈتوں نے کئی منتر ایسے
یہ کم بخت پھر سے جلایا گیا

بشوالے سے نکلا وہ پھنکارتا
رگِ ارض پر ڈنک سا مارتا
بڑھا تیں کر اک بار پھر سر کچل دوں
اسے ساری قدموں سے اپنے مسل دوں
قریب ایک ویران مسجد تھی
مسجد میں یہ جا چھپا

جہاں اس کو بہ دوں سے غسل دے کر
حسین ایک تعویذ گردن میں ڈالا گیا
ہوا جتنا صدیوں میں انساں بلند
یہ کچھ اس سے اونچا اچھالا گیا

اچھل کے یہ گرجا کی دہلیز پر جا گرا
جہاں اس کو سونے کی کینچل پہنائی گئی
صلیب ایک چاندی کی سینے پہ اس کے
سموں کا گلوبند گردن میں ڈالا
اور اس دھج سے میدان میں اس کو نکالا
دیا جس نے دنیا کو پیغامِ امن
اسی بے حیات آفریں نام پر
اسے جنگ باری سکھائی گئی

پڑا اس کا دھرتی پہ سایہ

تو دھرتی کی رفتار رکنے لگی
اندھیرا اندھیرا زمیں سے فلک تک اندھیرا
جبیں چاند تاروں کی جھکنے لگی

ہوئی جس سے سائنس زر کی مطیع
جو تھا علم کا اعتبار اٹھ گیا
اور اس سانپ کو زندگی مل گئی

اسے ہم نے ضحاک کے کھاری کاندھے پر دیکھا تھا اک دن
یہ ہندو نہیں ہے، مسلماں نہیں
یہ دونوں کا مغز اور خوں چاٹتا ہے

بنے جب یہ ہندو مسلماں، انساں
اسی دن یہ کم بخت مر جائے گا۔

اس سہ ماہی کا منتخب کارٹون

"اسپین" دہلی کے
شکریے کے ساتھ



آج میں مکمل طور پر کرپٹ ہو گیا

غزل

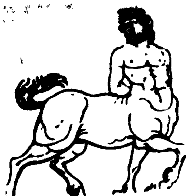
راہی معصوم رضا

سب ڈرتے ہیں، آج ہوس کے اِس صحرا میں بولے کون
عشق ترازو تو ہے، لیکن اس پہ دلوں کو تولے کون

سارا نگر تو خوابوں کی ارتھی لے کر شمشان گیا
دل کی دکانیں بند پڑی ہیں، دل کی دکانیں کھولے کون

کالی رات کے منھ سے ٹپکے، آنے والی صبح کا خون
سچ تو یہی ہے، لیکن یارو، یہ کڑوا سچ بولے کون

لوگ اپنوں کے خوں میں نہا کر، گیتا اور قرآن پڑھیں
پیار کی بولی یاد ہے کس کو، پیار کی بولی بولے کون



مرثیہ عہدِ اُمید

علی عباس اُمید

موم دل سنگ پہ اُبھرے ہوئے اس شہر کی
تعمیر جدید
سنگ دل موم کی مرہون ہوئی

یادِ ایام نے آئینۂ دل توڑ دیا
ایک حسرت ہے جو تصویر دکھا جاتی ہے
قصۂ درد سنا جاتی ہے

موسم گل جسے سمجھے تھے وہی عہدِ جنوں
(وقت و حالات کی آوارہ نگاہی کا فسوں)
ہنستے ماحول کے پہلو میں بنا سوز دروں
--- اور پھر فاصلوں کے پھیلتے صحراؤں میں
ساعد دست بڑھا
صاف اور شفاف سا اک شعلہ اٹھا
آنکھیں بجھنے لگیں، دل لرزا، جگر کانپ گیا
روح پر زخم لگا، درد اٹھا
ضبط کی کوشش بسیار پہ بھی شہر طرب چیخ پڑا اور سر اوج حیات
شہر کی چیخ میں تھا کرب عمر
مگر کیا ہوتا
(بے بسی کو بھی ملا ہے کہیں زخموں کا صلہ!)
بن گئی شہر کی وہ چیخ بھی گنبد کی صدا

ٹوٹتے فاصلے کچھ اور بھی ٹوٹے، وسعت
بڑھ گئی اتنی کہ دانش کے امیں
بے طلب فاصلوں کے ذکر سے کترانے لگے
کاسۂ دست میں سر کو لیے، ہونٹوں کو مقفل کر کے
خالی الذہن مگر فکر کو یکجا کر کے
موند کر آنکھیں یہ سوچا کیے
اک صبح یا پھر شام کوئی آئے گی
جب کہ دیرینہ نفس ساز طرب کی لے پر
عیش کے زمزمے چھیڑے گا
چراغاں ہوگا

چتر لہرائیں گے
آسائشِ دیرینہ کے بات
فصلِ صد رنگ کے چہرے سے بنے کا گھونگھٹ
دو پہر
اور اگر آگ بکھیرے بھی تو ماحول کے ننگے سر پر
دستِ قدرت کا کوئی معجزہ لہرائے گا
— — سایۂ ابرِ رواں کا آنچل

یہ تفکر تھا فقط سعیٔ گراں
اور تفکر کی بھی تفسیر کوئی ہوتی ہے
صیدِ آلام کی تقدیر کوئی ہوتی ہے
دھند کی لوح پہ تحریر کوئی ہوتی ہے
سوچ کے خواب کی تعبیر کوئی ہوتی ہے

اُن کا یہ خواب بھی بس خواب رہا
خواب کی دھرتی پہ تعبیر کا پودا نہ اُگا
رت بدلتی رہی، دن جاتے رہے کچھ نہ ہوا

وقت کے دشنۂ پنہاں کے طفیل
سازِ مضروب بجے نغمے بھی مجروح ہوئے
غنچۂ گل میں اٹھا تیرہ و تاریک غبار —
یوں ہی بس ہوئے جاگتی تقدیروں کے محل
جل گئی آتشِ حالات میں دل کی کونپل

موم دل سنگ کے اس شہر میں
ہر گام پہ ریزوں کی بساط
پھول سے پاؤں کو گلنار بنا جاتی ہے
جس طرف دیکھیے آتشکدۂ زیست میں شعلوں کی زباں
چاٹتی رہتی ہے تاریخ کا جسم
اور گھل جاتے ہیں ماضی کے حقائق کے طلسم

ارتقاء دیکھیے
اس شہر کی سمتوں کی حدیں
دستِ عفریت کی مانند کچھ اس طرح بڑھیں
روح محکوم ہوئی اور وہ حاکم ٹھہریں
نور و نکہت کے سبھی خواب،
وہ سرفاب،
وہ بہتا ہوا آب
نخلِ تہذیب کے پھولوں کی شگفتہ نکہت
کیفِ صہبائے سکوں،
غنچۂ دل کی راحت
سب کی سب آہنی زنجیروں میں محبوس ہوئیں
جینے سے مایوس ہوئیں

یہ تضرع، یہ گھٹن
کرب کی آگ میں جلتے ہوں رشتوں کے بدن
گرمی ایسی کہ قیامت کا یقیں ہوتا ہے

نفسی نفسی کا یہ عالم کہ سرِ راہ گزر
آشنا چہرہ، رفیقِ سحر و شام کوئی
جادۂ عظمت دیرینہ کا ناکام کوئی
اپنی ہی طرح اسیرِ غم و آلام کوئی
بھول کر بھی نظر آئے تو مسائل کے مزید
اس کے مل جانے کی لمحاتی مسرت پہ
برافروختہ ہو کر یکسر
خنجرِ مصلحتِ وقت اٹھا لیتے ہیں
اور مل بیٹھنے کی خواہشِ موہوم
(جو معصوم بھی مظلوم بھی ہے)
اس کی شہ رگ کو قطع کرتے ہیں
اجنبی شخص سمجھتا ہے، بھلا دیتا ہے
اور کبھی دوست کی مانند دُعا دیتا ہے

سم چشیدہ سا تبسم ہے، بُریدہ فن ہے
سرِ قلم کا بھی قلم ہو چکا الفاظ کی راکھ
اپنے ہی عہد کی تاریخ کے رخساروں پر
گزرے ایام کی تہذیب کے شہپاروں پر
لذتِ زیست کے پچھلے سبھی معیاروں پر
دستِ امروز نے مَل ڈالی ہے
غازہ کی طرح

پیکرِ زخم تکلم ہے، خموشی کا طلسم

مجھ کو جو میں بکھرے سپنے کی طرح
جتنی بھی قسمیں تھیں اُن سب کو بھلا کر یکسر
شب کا تنہائی کا، ماحول کی یکتائی کا
فن کا، گویائی کا
امید کی رسوائی کا
جائزہ لیتا ہے — پھر بجھتے دیے کی مانند
جشنِ شب دیکھتا ہے، ہونٹوں کو سی لیتا ہے
ساغرِ دردِ لبِ روح سے پی لیتا ہے
"تو نہ ہے لب بستہ جو تھا ذہن کے در کی دستک
میں بکھر پا بستہ ہوں — آوارہ ہوا تھا کل تک
"وہ نہ ہے یخ بستہ جسے کہیے فضاؤں کی چمک

رات کے بند کواڑوں پہ کبھی آس کی صبح
اب تو دستک بھی نہیں دیتی کہ
ذہنوں کی گھٹن
خود فراموشی کی بانہوں کا سہارا لے کر
چند لمحوں کے لیے خوابوں کے صحراؤں میں
زرد ٹیلے پہ کھڑی ہو کے
نظر کے لب سے
چوم لے چاند کے رخساروں کو
اور انگڑائیاں لیتے ہوئے کہساروں کو

آج وہ مہکے ہوئے دن کہ جو تھے

رشک کے باعث کل تک
ہوگئے تھے کمانتے دم توڑتے لمحہ لمحہ
گردشِ وقت سے مرنے کی دعا مانگتے ہیں
(ہائے، کیا چاہتے ہیں!!)

رات کی زلف بکھر جاتی ہے جب تابہ کمر
چھپ کے آنچل کے تلے
جل کے شجر اور حجر
جوڑ کر ہاتھوں کو بادیدۂ تر
تا بہ سحر
مالکِ کُل سے اجابت کی دعا کرتے ہیں
جاں کنی ختم ہو
دن کی
یہ کہا کرتے ہیں

فکر امروز و شب و روز کے غار
برگِ فطرت پہ پگھلتے ہوئے لوہے کی پھوار
ایک اک پل کی بجھی آنکھیں،
فسردہ رخسار
خشک ہونٹوں پہ
کسی عقدۂ دشوار کی گرد
کانپتے ہاتھوں میں
روٹھے ہوئے ایام کا درد

ذہن کی سطح کو چھوتا ہوا اک لمحۂ سرد
آج آئینۂ ماحول کا صیقل ہے یہی
روز و شب چاک ہیں
اور چاک کا محور ہے یہی

دشتِ ماحول میں کہرام ہے
کہرام پہ تعزیریں ہیں
گل کی
اور
خار کی
اب ایک سی تقدیریں ہیں
نفسِ مفہوم بدلتی ہوئی تحریریں ہیں
آج بھی جن کا ہے گل پوش
وہ تعبیریں ہیں
پیرہن دھند کا پہنے ہوئے تنویریں ہیں

موم دل سنگ کے اس شہر کی تہذیب و
تمدن کی بہار
سبزۂ کیف — جسے کہیے غرورِ کہسار
حسنِ فطرت کی پھبن، لمحوں کی عشرت کا خمار
آج دیرینہ روایت کے سوا کچھ بھی نہیں!
کسی بوسیدہ حکایت کے سوا کچھ بھی نہیں!!
کچھ بھی نہیں ..

غزل

نشترؔ خانقاہی

یہ ارض بے بہا، اس رُت میں بنجر ہوگئی شاید
گل زر خیز مبری، نذرِ صرصر ہوگئی شاید

سلیقہ ساکنینِ شہر سے سیکھیں، معیشت کا
مروّج اب یہاں تہذیب دفتر ہوگئی شاید

بھٹکتے پھر رہے ہیں، شہروں میں بیٹے کسانوں کے
تقاوی کھیت کی قیمت سے بڑھ کر ہوگئی شاید

تعلق اپنے گھر سے ہے، نہ ہمسائے سے رغبت ہی
طبیعت اب زمانے سے مکدّر ہوگئی شاید

یہاں سب اپنے اپنے دائروں میں قید ملتے ہیں
یہ محتاجی تو اس بستی میں گھر گھر ہوگئی شاید

تشدّد کی خبر وحشت تاسف تک نہیں بنتی
مری حالت تو اب پہلے سے بدتر ہوگئی شاید

گھرانے کتنے ہی مجبور دیکھے کوچ کرنے پر
یہ ہجرت خاندانوں کا مقدّر ہوگئی شاید

تیوہار

جاوید اختر

آج اس شہر میں ہر شخص ہراساں کیوں ہے؟
چہرے کیوں فق ہیں
گلی کوچوں میں
کس لیے چلتی ہے خاموشی
آشنا آنکھوں پہ بھی
اجنبیت کی یہ باریک سی جھلّی کیوں ہے
شہر سناٹے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ملزم سا نظر آتا ہے
اتّا دُکّا کوئی رہگیر گذر جاتا ہے
خوف کی گرد سے کیوں دھندلا ہے سارا منظر
شام کی روٹی کمانے کے لیے
گھر سے نکلے تو ہیں کچھ لوگ مگر
مُڑکے کیوں دیکھتے ہیں گھر کی طرف
آج بازار میں بھی
جانا پہچانا سا وہ شور نہیں
سب یوں چلتے ہیں کہ جیسے یہ زمیں کانچ کی ہے
ہر نظر نظروں سے کتراتی ہے
بات کُھل کر نہیں ہو پاتی ہے
سانس روکے ہوئے ہر چیز نظر آتی ہے
آج یہ شہر اک سہمے ہوئے بچّے کی طرح
اپنی پرچھائیں سے بھی ڈرتا ہے
جنتری دیکھو
مجھے لگتا ہے
آج تیوہار کوئی ہے شاید۔

غزل

منظر سلیم

جلتی سلگتی چیختی شہروں سے جاتی ہے ہوا
صحرا سے مل مل کے گلے آنسو بہاتی ہے ہوا

حیراں، پریشاں، نیم جاں، دریا کے اوپر لوٹتی
شعلوں کے جبر و قہر کا قصہ سناتی ہے ہوا

پیڑوں کو سمجھاتی کہ ہے کا ہے کا یہ کالا دھواں
شاخوں کو ان کی ماتمی کپڑے پہناتی ہے ہوا

چیخیں اڑاتی دشت میں گلیوں سے مل جا کے
سانپوں درندوں کو لہو بہروں رلاتی ہے ہوا

پھولوں کے چہروں پر لکھی دہشت کو پڑھتی سوچتی
غاروں میں تازے خون کی بو کو چھپاتی ہے ہوا

آہوں سے اپنی چومتی کچھ طائروں کے بال و پر
گیتوں کو ان کے مرثیہ خوانی سکھاتی ہے ہوا

اے رقیب یہ دل کس طرح شمار کرے

حسن عابد

اے رقیب یہ دل کس طرح شمار کرے
جو شخص میری طرح تیرے غم سے پیار کرے
ترے خیال کے پیکر سجائے شعروں میں
ترے جنوں میں رہے تیرا انتظار کرے
ترے قصیدے لکھے حرف حرف تازہ تر
غزل کے پھول ترے حسن پر نثار کرے
سجائے راہِ تمنا لہو کے رنگوں سے
تمام جادۂ جاں منظرِ بہار کرے
پلک پلک سے چُنے دلنواز تیروں کو
تمام راہ کے کانٹے گلے کا ہار کرے
نسیم شوق سے تازہ رکھے گلِ وحشت
خود اپنے ہاتھ سے دامن کو تار تار کرے
جلو میں لے کے چلے حوصلے شہیدوں کے
گلوئے عشق کو خنجر سے ہمکنار کرے
عدو کے خوف سے جو بات کوئی کہہ نہ سکے
اسی کا ذکر سرِ عام بار بار کرے
بڑھائے ہاتھ اگر کوئی پھول کی جانب
تو اُس کے قلب میں پیوست نوکِ خار کرے
دراز دستِ ہوس ہو تو شعلۂ گل سے
سزا یہ دے کفِ گلچیں کو داغدار کرے
ہم اُس کے حوصلۂ دل کی داد دیتے ہیں
جو اس دیار میں رہ کر بھی تجھ کو پیار کرے

غزل

اُویس احمد دوراںؔ

نہ جانے کون سی شے مجھ میں ہے چھپی ایسی
جہاں جہاں میں گیا حاسدوں کی فوج ملی

میں نرم لہجہ کا، دھیمے سروں کا شاعر تھا
زمیں پہ ظلم بڑھا دھن بدل گئی میری

مرے چمن کے غزالو! تمہیں سلام مرا
تمہارے دم سے مری فکر سربلند ہوئی

بڑا اداس، بہت سوگوار ہے موسم
کئی دنوں سے لبوں پر ہنسی نہیں آئی

ترے غرور کا مجھ کو جواب دینا تھا
وگرنہ میری طبیعت انا پسند نہ تھی

کچھ آج ہی نہیں صدیوں سے بے اماں ہے یہ
اگرچہ کہنے کو عالم پناہ ہے دلّی

ہزاروں وار ہوئے تجھ پہ قبل بھی لیکن
دُکھی سماج تو اتنا کبھی نہ تھا زخمی

فسادیوں کا جلوس آرہا ہے رک جاؤ
شرارت آگ کے گولے غرور پھینکے گی

نشان ڈھونڈھ رہا ہوں مگر نہیں ملتا
یہیں کہیں پہ ہماری پیاری ماں کی تربت تھی

دعائیں دیجیے گلشن کے سربراہوں کو
انہیں کے حکم سے اردو زباں قتل ہوئی

یہ غمزدوں کی ہیں ویران بستیاں دوراںؔ
دکھائی دیتی ہیں تم کو جو ڈوبی ڈوبی سی

آزاد غزل

حرمت الاکرام

اُس دیئے سے کہ ہے محراب تمنا روشن
عمر تا عمر رہا، نام کسی کا روشن
ہوئی تو سینے کی مدھم اتنی
نہ جبیں پر ہے اجالا نہ ہے چہرہ روشن
یاد آتا ہے مجھے دیکھ کے مسجد کا چراغ
میں نے بھی دل میں کیا تھا کوئی شعلہ روشن
جانے کس اور چلی چھوڑ کے سورج کو سرِبامِ افق
رات سے ہو نہ سکا صبح کا رستہ روشن
ہوتے سیراب تو کیا پاؤ گے: بجھ جاؤ گے، ہو جاؤ گے راکھ
پیاس کی آگ سے رہتا ہے سراپا روشن
کیا جلا تا کوئی کشتی میں چراغ
موجیں ٹکرائیں — سواسینۂ دریا روشن
محلوں کو جس سے شکایت رہی اس کٹیا میں
ایک مٹی کا دیا تھا روشن
بٹ گئی اہلِ ہوس میں مہ و خورشید کی اجلی سوغات
کیسے روشن ہو کوئی راہ گزر، کیسے ہو دنیا روشن
آگ شعلوں کی بھی سینوں کی بھی تھی جنگل میں
دیکھنے آئے تھے ہم — شہر ہے کتنا روشن؟
دل کو جلنے کا سلیقہ ہی نہ آیا حرمت
ورنہ کب ہوتا ہے ایسا کوئی شعلہ روشن!

غزل

شجاع خاور

دونوں بالکل چپ رہتے ہیں خوب زمانہ سازی ہے
شہرِ خرد میں دیوانہ ہے شہرِ جنوں میں قاضی ہے

جینا کہتے ہیں جس کو اس کھیل میں ہم ماہر تو ہیں
ہار گئے تو قسمت اپنی جیت گئے تو بازی ہے

کچھ باتیں برسوں پہلے جوشِ جنوں میں لکھ دی تھیں
بعد میں ہم نے جو لکھا ہے سب انشا پردازی ہے

اپنی مرضی کے رستے پر جاؤں تو کیسے جاؤں
آگے آگے مستقبل ہے پیچھے پیچھے ماضی ہے

سمجھوتہ کروا ہی دیا ہے آخر دوراندیشی نے
دیکھو اب میں بھی زندہ ہوں اور دنیا بھی راضی ہے

اپنی باتیں اپنی کتابیں بے مطلب سی لگتی ہیں
کام کا کوئی لفظ نہیں ہے ہر معنیٰ اعزازی ہے

علیل کاغذ، قلم کا نب، جامنی اندھیرا

جینت پرمار

علیل کاغذ کے آسمانوں میں
شبد کے بیج بو رہا ہوں
قلم کا نب سے ٹپکتا ہے جامنی اندھیرا
تمہارے دل کی پرت ہوں لیکن
وصال کی انگلیوں نے اب تک پڑھا نہ مجھ کو
شجر نے اپنے بدن پہ کتنے لباس بدلے
صدا کا سورج نہ لوٹا واپس
نظر میں کالے سوال روشن
خلا میں خواہش کی دھوپ چسپاں
خلوص کا بلب بجھ چکا ہے
شعور کا ہاتھ چھل رہا ہے شریر بچّا
سفید پرچھائیوں کے ناخن
کھرچتے ہیں خواب رُت جگوں کے
ندی کی آنکھوں کا نیلا پانی تو مر چکا ہے
شکستہ لمحوں کی مٹھیاں کھول دے نہ کوئی
علیل کاغذ!
قلم کا نب!!
جامنی اندھیرا!!!

جینت پرمار

ہوا کی پسلی کو توڑ کر آ رہی ہے باہر
جلتی چمڑی کی گندھ
عذاب تن میں
عذاب من میں
پھٹی ہوئی کھوپڑی نے آواز دی تو چونکا
صدا کے گہرے کنوئیں میں جھانکا
کوئی بھی چہرا نظر نہ آیا
سیاہ ٹھنڈی ہواؤں کے ہاتھ
میری گردن کو بھینچتے ہیں
سفید عینک میں تیرتے ہیں
وہ دھندلے چہرے
تھوہر کا جنگل اُگا ہوا ہے
سراب آنکھوں کی پتلیوں میں
اب اپنے رشتے کا دیپ جانم
بجھا بجھا ہے۔

غزلیں

سیپ، کوڑی، تتلیاں، سائے، شجر روشن ہوئے
ہجرہ اس کا کر شب کے بام و در روشن ہوئے
آج کیوں مٹی ہمارے خون کی پیاسی ہوئی
سارے رشتے بجھ گئے نیزوں پہ سر روشن ہوئے
زرد شاخوں پر ہوائیں مرثیہ گانے لگیں
خواب کی تاریک گلیوں میں کھنڈر روشن ہوئے
شام کو جب اس کی یادیں ڈھونڈ کر لائیں ہمیں
میز پر کاغذ، قلم سوچوں کے پر روشن ہوئے
کان کو اچھی لگیں کچھ دیر کرتب بازیاں
تہہ بہ تہہ کھلتے گئے عیب و ہنر روشن ہوئے

جینت پرمار

گئے دن وصل کی خوشبو لپیٹے لوٹ آتے ہیں
کبھی دریا پہ پڑتے دونوں کنارے لوٹ آتے ہیں
کوئی بھی چیز دنیا میں ہمیشہ تو نہیں رہتی
مگر یہ دھوپ ڈھلتے ہی ستارے لوٹ آتے ہیں
مرے مالک ہر اک شے پر تری رحمت کا جادو ہے
تری آواز سن کر سبز پتے لوٹ آتے ہیں
ندی کی ریت میں جب ننھے بچے بن کے کھلتے ہیں
کناروں پر وہ بچپن کے گھروندے لوٹ آتے ہیں
سنا جو داستانوں میں وہ سب جھوٹا نہیں ہوتا
سنہرے سات گھوڑوں پر سویرے لوٹ آتے ہیں

غزلیں

اختر بستوی

مجرمانِ فن ہمیشہ یہ سزا پاتے رہے
"تاج" کی تخلیق کرکے ہاتھ کٹواتے رہے

شرطِ ناکردہ گناہی یاد تھی کس کو بھلا؟
لوگ بیدردی سے پتھر ہم پہ برساتے رہے

آگیا شعلہ گروں کی صف میں اُن کا ذکر بھی
برف پر چنگاریاں رکھ کر جو سلگاتے رہے

کنکروں کا بھاؤ سن کر عہدِ نو کے جوہری
موتیوں سے جھولیاں بھر بھر کے پچھتاتے رہے

رہروانِ دشت خوفِ مرگ کو کچھ سرپھرے
زندگی کے شہر تک مر مر کے پہنچاتے رہے

موج اک اختر تمہارے ذہن میں اقبال کی تھی
عمر بھر تم جس کی پسپائی سے گھبراتے رہے

نظمیں

اختر بستوی

۱۔ ساتھی

میرے قدموں نے چُنی تھی جو ڈگر اپنے لیے
حکمراں حدِ نظر تک اُس پہ تھیں ویرانیاں
دوسرا رہرو۔ آتا تھا نظر میرے سوا
دل پہ تھا حاوی اکیلے پن کا احساسِ گراں
ذہن کی سانسیں بھی تھیں یہ سوچ کر اُکھڑی ہوئی
بانٹ لے جو بارِ تنہائی کوئی ایسا نہیں
راستے کا ایک پتھر ناگہاں یہ بول اٹھا:
"میں ہوں تیرے ساتھ، تو اِس راہ میں تنہا نہیں"

۲۔ وقت کے قدم

جن کے پھیرے تھے کھنڈر میں اُن ہواؤں نے کہا:
"وقت کی رفتار کا انجام ویرانہ ہے کیوں؟"

اس پہ بولی گرد: "میں اِس مسئلے کے رُخ گئی
اک یہی پہلو بھلا وجہِ پریشانی ہے کیوں!
میرے بارے میں بھی سوچو، وقت ٹھہرے یا چلے
قایم و دایم ہمیشہ میری یکسانی ہے کیوں؟"

۳۔ میرا نقشِ جمیل

تلخیٔ کام و دہن دنیا سے جو مجھ کو ملی
جھلکیاں اس کی نہ آئیں کچھ مری تحریر میں
ظلمتِ بغض و حسد چھائی رہی ہر سو، مگر
خود کو چمکا لیا ہے میں نے پیار کی تنویر میں
گھر کے یوں نفرت میں بھی، الفت کا موں نقشِ جمیل
جیسے گوتم بدھ کی مورت سایۂ شمشیر میں

۴۔ خامشی

درحقیقت خامشی معراج ہے گفتار کی
اس سے بہتر کوئی بھی صورت نہیں اظہار کی
ہو گئی ہے نطق کی ہر ہر ادا جب بے اثر
میں نے دیکھا ہے طلسم خامشی کو کارگر
خامشی ایسے بھی لمحوں کی کہانی کہہ گئی
جن میں گویائی پشیمانی اُٹھا کر رہ گئی

غزل

وجاہت علی سندیلوی

بزم میں تیری بہ اندازِ جنوں کوئی تو ہے
اب حریفِ نازِ چشمِ پُر فسوں کوئی تو ہے

کیسے سمجھوں بے تعلق میرے دل سے تم ہوئے
موجبِ حیرانیِ وجہِ سکوں کوئی تو ہے

تیغ و خنجر دیکھتا ہوں، دستِ قاتل ہے چھپا
حکم سے جس کے بہا ہے میرا خوں کوئی تو ہے

تاک کر پتھر نہ آتے اِس طرح میری طرف
میرے اس شہرِ جنوں میں بے جنوں کوئی تو ہے

آگیا ہے میرا قاتل یا پلٹ آیا رفیق؟
کھول دوں پٹ؟ آہٹیں کب تک سنوں؟ کوئی تو ہے

کیا ہمیں فریاد کا حق بھی نہیں باقی رہا
تم نہیں گر باعثِ حالِ زبوں کوئی تو ہے

بجھ گئی وہ شمع بھی جو آخری دمساز تھی
تھا ارادہ حالِ دل میں بھی کہوں کوئی تو ہے

جوالا مکھی

چندر بھان خیال

یہ بوڑھا وندھیاچل ہے امیں
ہر رات اندھیروں سے تنہا لڑنے والا
وہ باپ مرا
ہر صبح نہا دھو کر دیوی کے مندر میں
نرمل جل ہاتھوں میں لے کر
کہتا تھا ماں سے — بیٹا دے
وہ بیٹا جو جوان ہو کر
اُس کے بوڑھے انگوں کی بوکی جوالا پر
ایسے ہی شیتل جل چھڑکے
اُس پر راحت کے پل چھڑکے

پھر بھڑکا اِک ہوتے شعلوں کی
[illegible] اٹھی
اک رات [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

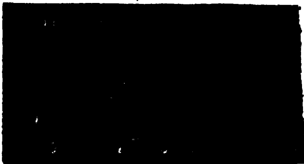
موسم کے پیلے ہاتھوں میں
لہرایا پرچم شعلوں کا
پسلی پسلی سے پھوٹ پڑا
اک نئی سحر کا آفتاب
اُس رات مَیں کتنا رویا تھا
یہ بوڑھا وندھیاچل ہے امیں

میری خواہش —
تھی دور کسی خاموش جزیرے پر پہلے
پھولوں کے جنگل کا جگنو
بن کر پریوں کے ساتھ اڑتا پھرتا
[illegible]
[illegible]
آزاد [illegible]
[illegible]
[illegible]

اب نئے مرشد کے گھر کے آنگن کا کتا
جانے انجانے تلوے چاٹنے والا وہ
نظر آتا ہے
راہی میری مسرت دیکھ کے مسکاتا ہے
خوابوں کا ہرا جنگل بہاتے
میری بو باس سے دور کہیں
میری پرچھائیں سے دور کہیں
افلاس زدہ عورت کی برہنہ چھاتی سا
مستقبل میرا جھکتا ہے
امروز کی وحشی آنکھوں میں
اور تارکول کی شاہراہ جیسا سیاہ
ماضی میرا
جس پر شاہوں کے جوتوں کی کھٹ کھٹ کے سوا
کوئی آواز نہیں آتی
بس ہانپ رہا ہے رہ رہ کر
پتھریلی چھاؤں والا مردہ سناٹا
لگتا ہے بعد از اعتراف

اپنے ہی کفِ حسرت پھری سیال پیش کو
چاٹ رہا ہے
وقت کی اُجلی چھاتی پر بیٹھا کوئی نامرد بھی
اب رات مرے زخموں کو چھپانے کی خاطر
اپنے ملبوس گنوا بیٹھی
یہ بوڑھا وندھیاچل ہے ایسی

میں آگ اگلتا جوالا مکھی
میں آگ نگلتا دریا ہوں
میرے ہاتھوں میں سانپ کئی
لہراتے ہیں پرچم کی طرح
اور شیتل جل کی حسرت میں
وہ باپ مرا
اپنی سوکھی سی بانہوں میں گردن ڈالے
روتا تو ہوگا چیں بہ چیں
اپنے بوڑھے انگوں کی بھوکی جوالا میں
جلتا ہوگا دن رات کہیں۔



غزل

اقبال متین

گمان و وہم نہیں ہیں، مرا یقیں ہیں اب
مرے قدم مرے احساس کی زمیں ہیں اب
میں جام اٹھا کے یہی سوچتا رہا اکثر
نشہ بھی لے گئے وہ لوگ جو نہیں ہیں اب!
کچھ ایسی چرب زبانی سے جہل چھپتا ہے
یہ لوگ اپنے لیے مارِ آستیں ہیں اب
کبھی جو ساتھ تھے میرے، مری رگِ جاں تک
دلوں کو چھوڑ کے محلوں میں جاگزیں ہیں اب
ہمیں نہ پا سکا آسیب ظلمتِ دوراں
ہر ایک خالی مکاں میں ہمیں مکیں ہیں اب
فریدؔ و نشوؔ و پپنؔ کے ساتھ ہے خرّمؔ
پتہ تو دے گئے ہوتے جہاں کہیں ہیں اب
چلو متینؔ وہیں جا کے پھر انہیں ڈھونڈیں
وہ صورتیں جو زمیں سن کے دل نشیں ہیں اب

میرے لختِ جگر

ـہ فرید اقبال مرحوم، ۱۳ سال
عـہ نشو انیس اقبال مرحوم، ۱۰ سال
عـہ پپن سعید اقبال نوستاد مرحوم، ۱۱ سال
ـہ خرّم قیصر مرحوم، ۲۰ سال (میرا بھتیجا، مشہور [illegible] قیصر [illegible] کا بیٹا)

وراثت

اقبال متین

چلو استخارہ بھی آ ہی گیا
کہ اس نے بلایا ہے ہم کو متین
مگر یہ کتابیں، یہ کرسی، یہ میز
یہ میرے قلم، سادہ کاغذ یہ ترشے ہوئے
رسالے کے اوراق ہیں یا تراشے
کوئنک پارکر روشنائی کی بوتل کھلی بھی نہیں
مگر میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس کا تو انبار ہے

بہت کچھ تو ہے، کوئی وراثت نہیں
[illegible] والوں نے میرے کہا بھی نہیں
کہ [illegible] چاہیے [illegible] تو نہ دیں گے
[illegible] میں مگر سب [illegible] دیں گے

کوئی نیک بندہ انھیں یہ بتا دے
کہ ابّا نے اُن کے
کاغذوں اور کتابوں میں اپنا کفن، بڑے ہی جتن سے چھپا کر رکھا ہے
قلم ان کے جتنے بھی ہیں، سب کے سب روشنائی سے ایسے بھرے ہیں
کہ تم عطر کے بدلے اُن کے کفن پر سیاہی چھڑک دو
روشنائی چھڑک دو
اور ان کو انھیں کی کتابوں میں دفنا کے سوچو
کہ ہم ہی تو وارث ہیں
ہم کو وراثت میں کیا کیا ملا ہے

چلو ایک ہی کام باقی رہا اب
کسی بزمِ اردو سے، بزمِ ادب سے
اُٹھا لاؤ تختی کوئی
اور ابّا کی بالیں پہ کتبہ لگا دو۔



غزل

باقر نقوی، لندن

محلوں کے قسمت گانے والا ہی معتوب ہوا
جس نے اپنا راگ الاپا وہ مصلوب ہوا

نہریں کھدوانے والے سارے بے نام رہے
پیاسے ہونٹوں سے ٹھنڈا پانی منسوب ہوا

آئینہ تھا، نور کا چہرہ تو دکھلانا تھا
وحشی دل بھی ڈوب گیا جب چاند غروب ہوا

دل کے خوں ہونے کا منظر کیا دکھلائیں آپ
لختِ جگر کے گم ہونے پر جو یعقوب ہوا

کیا بتلائیں کیا جادو رکھتے ہیں پیار کے لفظ
کتنے زخموں کا مرہم تیرا مکتوب ہوا

کتنی پشتیں چھوٹے سے گھر میں رہ سکتی تھیں
جد کے گھر سے ہجرت کر جانا ہی خوب ہوا

غزل

باقرنقوی، لندن

بن میں بہے گی پھر سے پُروا، آج نہیں تو کل
پانی ہوگا دریا دریا، آج نہیں تو کل
آزادی کی مانگ میں افشاں بن کے چمکے گی
خاکِ فلسطین و افریقا آج نہیں تو کل
کشتِ ستم پر قرض رہے گا یہ معصوم لہو
پھول بنے گا قطرہ قطرہ آج نہیں تو کل
کب تک چاند ستارے یوں گہنائے جائیں گے
روشن ہوگا رستا رستا آج نہیں تو کل
کب تک رہ سکتے ہیں یکجا ظالم اور مظلوم
کٹ جائے گا ظلم کا رشتا آج نہیں تو کل
بستی بستی ہوگا اک دن جشن چراغوں کا
پھول کھلیں گے صحرا صحرا آج نہیں تو کل

غزل

انیس سلطانہ

تلخ حقائق میں تپ کر ہم کندن بن کر آئے ہیں
لوگ ہمیں پہچان نہ پائے، ہم کتنا گھبرائے ہیں
مصلحتوں کی چادر اوڑھے کتنے راز چھپائے ہیں
پھر بھی تم یہ جان نہ پائے کون اپنے کون پرائے ہیں
اپنا نشیمن پھونکنے والو، یہ بھی تمہیں معلوم نہیں
چھالے پاؤں سے ناتا کیسا ہم تو فقط ہمسائے ہیں
اہل جنوں پابند جنوں ہیں، اہل خرد کا ذکر ہی کیا
وہ تو نام کے فرزانے ہیں، کچھ نہ کیا پچھتائے ہیں
پتھر کی بوسیدہ عمارت طوفانوں کو سہار گئی
ایک ہوا کے جھونکے میں نیچے کتنے نگر آئے ہیں
اہل جہاں کا ذکر نہ چھیڑو، تلخ ہواؤں کو چھوڑو
جتنا زہر تھا ان کے لہو میں، اتنے جام پلائے ہیں
تم نے انیس بھری محفل میں کیوں اتنا احساس کیا
ترک تعلق بوجھ نہ سمجھو، وہ خود چل کر آئے ہیں

شکستہ دیوار کے سائے

انیس سلطانہ

مرے تصور کی آندھیوں میں
نہ جانے کتنے شریر پیکر
بگولہ بن کر سمٹ گئے ہیں
شکستہ دیوار و در پہ نظریں جمائے اب بھی یہ سوچتی ہوں
بھڑک رہے ہیں یہ کیسے شعلے
لرز رہے ہیں مہیب سائے
یہی وہ شہر جمیل ہے جس کی بارہا میں نے کھائیں قسمیں
ہر ایک کھڑکی سے جھانکتے تھے
وہ تمکنت سے بھرے نظارے
چہار جانب اٹھے شرارے
مگر میں اب بھی یہ سوچتی ہوں
یہی وہ شہر جمیل ہے جو روایتوں کا امیں رہا ہے
محبتوں کا نگیں رہا ہے
ہزار نفرت کے بیج بوئے، ہزار نقش دلوں میں ڈالے
زمانہ اس کو بھی تاکتا ہے
کسی جھروکے سے سر نکالے طراز ہستی لرز رہا ہے
کوئی سمیٹے ہے بال و پر کو خود اپنے سائے سے چونکتا ہے
سپید ننھا سا وہ کبوتر اماں کی خاطر بھٹک رہا ہے

وہ بربریت کی تازہ مشعل لیے ہیں ہر سو بھٹک رہے ہیں
روایتوں کی سمادھیوں پر چڑھا رہے ہیں یہ برہمی کو
یہ خاک و خوں میں ڈبو رہے ہیں محبتوں کے لطیف پیکر
اور اپنی پھیکی ہوئی انا کو
فریب تسکین دے رہے ہیں
بے چہرگی کی تلاش ان کو
نمود جوہر کی آس ان کو

میں اپنی نظروں سے گر گئی ہوں
مگر ان سب سے پوچھتی ہوں
سبب بتاؤ کہ برہمی کیوں ؟
یہ سارے رشتوں سے دشمنی کیوں ،

مرے تصور کی آندھیوں میں
نہ جانے کتنے شرر بگولہ بن کر سمٹ گئے ہیں
خود اپنا دامن جلا رہے ہیں
خود اپنا خرمن لٹا رہے ہیں
روایتوں کی چتا جلا کر یہ اپنا گلشن جلا رہے ہیں
کوئی تو اس آگ کو بجھائے
کوئی تو آئے
جو نفرتوں کے سمندروں کو
فصیل الفت میں قید کر دے۔

شہسوار

ہو میں کوئی شہسوار
دڑتا ہے رات دن....
کبھی کبھی
یہ پوچھتا ہے کیا ہوئے ؟
وہ جاں بدست قافلے
اس دشتِ آرزو
وقارِ خواب آبرو
کہاں گئے ؟

کہاں بھٹک گئے عظیم
درد کے وہ قافلے !

کبھی کبھی تو یوں ہوا....
میں جنگلوں میں گم ہوا
بڑی مہیب خامشی
بڑی سیاہ رات تھی
کہیں کوئی صدا نہ تھی

کہیں کوئی دیا نہ تھا
نہ چشمۂ خیال تھے
نہ آہوئے غزال تھے
نہ کوئی دستِ آرزو
نہ کوئی خوابِ آبِ جو
نہ جنبشیں نہ حرکتیں
نہ آہٹیں نہ کروٹیں
خیال گم، حواس گم
چہار سمت دشت ہو
چہار سمت دشتِ ہو

اکرام خاور

یری سوزش زدہ آنکھوں نے مجھ سے یوں کہا کل شب
"یہ دھیمی آنچ کا جلنا تجھے دیوانہ کرے گا"
یں کیا کرتا، کہاں جاتا .....
کہ حائل تھا میرے سینے میں اک محبوس سناٹا
تعین کون کرتا ہم کہاں پر خیمہ زن ہیں
مسلط ہے سروں پر کون سا منحوس سایہ
اور ایسے میں.......
تلاطم روز و شب، تیری لگن کا جان لیوا ہے
ترے ہی جاں گسل ہیں تیری چاہت کے صنم خانے
نست خونِ دل کیوں ہے ؟ تمنا سوزِ جاں کیوں ہے ؟
رفیقانِ سفر اتنا بتا نا آرزو اک المیہ کیوں ہے ؟

اکرام خاور

"ایک منظر"

شب بے کیف کی تنہائی میں
بند آنکھوں کے دریچوں سے نظر آتا ہے
گاؤں کا لمبا حصار
نیم کی چھاؤں اور برگد کا خمار
گاؤں کی گلیاں اور تاریک مکانوں کی
خنک ٹھنڈی چھاؤں
خاک جھڑی ہوئی دیواروں میں قید
نیم خوابیدہ زبانوں کا جمود
چاندنی رات میں مسجد کے مینار
کھیت اور مینڈھ اور میدانوں کا زور
ندیاں، فصلیں، چراگاہوں کا شور
دھول اڑتی ہوئی راہوں میں
موذن کی صدا!
سادہ دل لوگ، ستائی ہوئی خلق!!

کنڈلیاں

بھگوان داس اعجاز

دھرتی دھنستی جا رہی ہٹتا جائے وجود
ماں تڑپے ہے بھوک سے بچّہ مانگے دودھ
بچہ مانگے دودھ پیڑ پودے ہیں پیاسے
سب نے آنسو پونچھ دیئے بے جان دلاسے
ہوتی جو برسات تو ماں یوں ہاتھ نہ ملتی
لاشوں کے انبار جلی مرگھٹ کی دھرتی

تنکے تنکے کا یہاں، بارہ ماس اکال
پنچھی اپنا گھونسلہ، اور کہیں تو ڈال
اور کہیں تو ڈال باورے دیس قصائی
گھر گھر میں صیّاد سُنے گا کون دُہائی
سب نے کھائے بھون بھون پنچھی گن گن کے
دانہ ہے بھرپیٹ یہاں نایاب ہیں تنکے

اس گھر میں کئی کھڑکیاں کھلیں گی اتنا جان
بند نہ کر سچائی کا، دروازہ نادان

دروازہ نادان کھلے گا چار پڑھاؤں
گندھ اُڑے گی چرپے ہوں گے گاؤں گاؤں
سچائی کا سر اُونچا ہوتا ہے اکثر
دھواں جھوٹ کا قید رکھو گے کب تک اس گھر

رکھو نہ اتنا حوصلہ، دل کی دبے اُمنگ
چلّو پانی میں کہاں، گز بھر اُٹھے ترنگ
گز بھر اُٹھے ترنگ تو رکھو دل پر پتھر
بھلے موقعہ دیکھ بلائیں جھومیں سر پر
سئے دیکھ کر چال چلو سمجھا تو دل کو
جان بوجھ کر دلدل میں تم پاؤں نہ رکھو

حال الھا گا دیش کا کرسی بیٹھے چور
راج بھون میں بھیڑیئے دہشت چاروں اور
دہشت چاروں اور لوگ ہیں سہمے سہمے
مچی ہے بھگدڑ آگ لگی ہے پیچھے پیچھے
شہر سے دوری دور شرافت پڑا اکال
بچا نہ قصبہ گاؤں کوئی پوچھو نہ حال

نظمیں

علی ظہیر

لال قلعہ

میری بچی نے کہا
گھر سے نکلنے کے سمے
"ابو! دلّی سے مجھے لال قلعہ لے آنا"
میں نے ہنس کر اسے "اچھا" کہا اور پیار کیا۔

آج جب کیمرہ لے کر میں گیا لال قلعہ
بڑی حیرت ہوئی
کیا دیکھتا ہوں اُس جا پر
دور تک ریت کا ساحل ہے
قلعہ ہے نہ فصیل
پیچھے جمنا کی جگہ
کالا سمندر ہے کھڑا
جس کی موجوں میں زبانیں ہیں
کٹاروں کی طرح

عالم وحشت و حیرت میں
میں پلٹا پیچھے
دور مسجد جامع کے کلس روشن تھے

اک تسلی سی ہوئی

پھر وہ رے کے میں ہوٹل کی طرف لوٹ گیا
کیا پتہ مسجد جامع بھی کہیں ہٹ جائے
اپنی بچی کے لیے میں نے سڑک
سے لے لی
قلعہ کی پوسٹ کارڈ کی تصویر

تم سے ..... ـــ ـــ ـ

ایک آنچل ہے
جو پھیلا ہے اُفق تا بہ اُفق
ایک سایہ ہے جو چھایا ہے دل وحشی پر
نغمگی ایک طرح گھومتی رہتی ہے کہیں
خامشی رنگ لیے گھومتی رہتی ہے کہیں

ڈھونڈتا رہتا ہوں
لہجوں میں کبھی باتوں میں
ڈھونڈتا رہتا ہوں
خوش بُو میں
کبھی چاندنی راتوں میں تجھے
تجھ کو پایا تو بہت دل کو سکوں آئے گا
تجھ سے مل لوں گا تو
راتوں میں، مَیں ڈھل جاؤں گا۔

نظمیں

مشرف عالم ذوقی

۱۔ بچے کا سوال

چپے چپے پہ پولیس بیٹھی ہے
پوسٹر کیسے میں چپکاؤں گا
ماں سے بولا تھا کہ کام ہوتے ہی
لوٹ کر جلد چلا آؤں گا

ماں نے بولا تھا کہ یہ پوسٹر جادو کا ہے
اس کو کھولو گے تو اک ملک نکل آئے گا
اس کو کھولو گے تو اک صبح نکل آئے گی
ملک ایسا کہ کبھی تم نے نہ دیکھا نہ سُنا
صبح ایسی کہ کبھی پہلے نہ آئی ہوگی
ایسی دلکش کہ کبھی خواب میں دیکھی ہوگی

ماں نے بولا تھا کہ جب پوسٹر چپکا دوگے
اُس حسیں ملک کی تعبیر نکل آئے گی۔

۲۔ تم انھیں قیدی بنانے کا جرم نہیں کر سکتے

مگر تمہیں اپنے جسم کے ساتھ
ذہن و دماغ کے میزائل کا استعمال بند کرنے کے لیے
کسی تنگ کوٹھری میں دنیا کی نظروں سے چھپا کر
(جہاں تم انھیں چڑیوں کے ان دیکھے سنسار
اور ان دیکھی منزلوں کی داستانیں سنایا کرتے تھے
جہاں آزادی کے ڈینوں پر ڈولتے ہوئے خوبصورت لمحوں پر
شام گھونسلوں میں واپس آنے تک کے درمیان
ایک خوبصورت منزل چھپی ہوتی تھی)

تمہیں ایک گمنام اندھیرے کر کہا جائے کہ چپ چاپ بیٹھ جاؤ
ہونٹ سی لو، آگے مت دیکھو کہ تم نظربند ہو،
قیدی ہو،

ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اس کے باوجود تم قیدی نہیں ہو
تم قیدی نہیں ہو سکتے
تمہاری روح سے اپنا رشتہ جوڑ کر
ہم نے اپنے تمام احساسات سوہان کر لیے ہیں
تم دیکھو، یہ ایک ہاتھ نہیں، کروڑوں ہاتھ ہیں، جو چڑیوں کی،
ان دیکھی منزلوں اور ان دیکھے سنسار کی تلاش میں،
اور برحق جیت کے لیے ابھی سے اٹھ گئے ہیں

تم دیکھو یہ آزاد ہاتھ ہیں اور کروڑوں ہاتھ ہیں

تم گھبرانا نہیں، تمہارے نام آزادی کا اور آنے والی،
سنہری آزادی کا جشن منالیا ہے ہم نے
اوران کے رنگ آلودہ دماغ اور زنگ آلودہ جسم کے چاروں طرف کیلیں
ٹھونک کر،
ان کے جسم نما تابوت کو عبرت کے لیے،
آنے والی نسل اور آنے والی دنیا کے لیے رکھ چھوڑا ہے
اور ہواہیں صرف ایک اعلان لکھ دیا ہے
مسکراتی صبح کا پیغام لانے والی آزادی زندہ باد، پائندہ باد۔

۔ رستی پھاندتی لڑکی

تم اداس تھی
تو آنکھوں کے آگے کھلے ہوئے سارے پھول بھی اُداس تھے
تم اسے دوستی نہیں کہوگی؟
سچ کہوں، تو زندگی کو کبھی میری آنکھوں سے دیکھنا،
دیکھنا اور پڑھنا،
پڑھنا اور جاننا،

وہاں تم بھی ہوگی
لیکن تم خود کو پہچان نہیں پاؤگی
اس لیے کہ وہاں تمہاری شبیہہ مختلف ہوگی

مختلف اور کئی حصوں میں بٹی ہوگی
ایک حصہ پردیس میں کھوئے ہوئے اُس چہرے کا بھی ہوگا
جس کے انتظار میں تم کلنڈر والی اُداس لڑکی بن جاتی ہوگی
اداس اور حساس، اور سارے جنموں کے ساون کی پیاس لیے
ایک حصہ رتیاں پھاندتی، تیزی سے بڑی ہوتی اس لڑکی کا بھی ہوگا
جو ہانپتی نہیں، بکھرتی نہیں، اور رسّی کا سرا جس کے ہاتھ سے
چھوٹتا نہیں،

پہچانا...؟ یہ بھی تم ہو.... ہاں تم
ممکن ہے ایک حصے میں کہیں میری بھی مداخلت رہی ہو
کسی اجنبی لمحے میں کہی گئی میری کوئی بات، جو تمہیں اچھی لگی ہو،
اور تم نے اسی واسطے مجھے یاد رکھا ہو،
لیکن یہ سارے چہرے، ہاں تمہارے چہرے، ہر وقت تمہیں میری آنکھوں میں
ملیں گے

اور میں چاہتا ہوں
"اُداس ہونے سے پہلے، تم اپنے آگے، ان میں سے صرف ایک ہی چہرہ اپنے
پاس رکھو

رتیاں پھاندتی، تیزی سے بڑی ہوتی اُس بچی کا چہرہ
جو ہانپتی نہیں
بکھرتی نہیں
اور رسّی کا سرا جس کے ہاتھ سے چھوٹتا نہیں۔

۴۔ ساون

ہم اس ساون کے منتظر ہی کیوں رہتے ہیں
جو چھلاوہ ہے، دھوکہ ہے
اور زندگی میں کبھی آ بھی نہیں سکتا
کیا ایسا سوچنا مایوسی ہے
ناکامی ہے اور بزدلی ہے

نہیں ہے، تب بھی ہم اس ساون کے منتظر ہی کیوں رہتے ہیں
جو چھلاوہ ہے، دھوکہ ہے
اور زندگی میں کبھی آ بھی نہیں سکتا

ممکن ہے وہ ساون کلپنا ہو
تصور ہو،
کتابی ہو
یقیناً تب بھی ہم اسے کھینچ لائیں گے
اس لیے کہ وہ ساون کبھی ہم نے بچپن میں دیکھا تھا
پھر نہیں دیکھا
اب اس وقت کی دھندلی یادیں ہی بچی ہیں

اور اب ہمارے بچے بڑے ہو چکے ہیں
اور ہمیں موقع بھی نہیں مل سکا کہ انہیں ساون کی کہانیاں ہی سنا سکیں

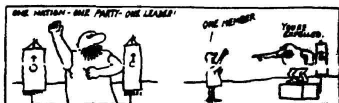
اس پہ کرتب تک حالات ہی بدل چکے تھے
بچے صرف جھگڑا اور لوہے کے موسم ہی دیکھتے رہے
ایک سے موسم

لیکن اب لگتا ہے
ان کی آنکھوں میں بھری ہوئی بغاوت
اس موسم کے تسلسل کو توڑنا چاہتی ہے

چلو اچھا ہے، اگر ان کی آنکھوں میں کوئی ساون پک رہا ہے
لیکن جس طرح پک رہا ہے، میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں
یہ ساون چھلاوہ نہیں ہو سکتا
اور یقیناً ایک دن میرے بچے اس ساون کو کہیں سے توڑ کر اپنے کھیتوں
میں لے آئیں گے
تو کیا میں اُس دن کا انتظار نہ کروں ؟

اس سہ ماہی کے منتخب کارٹون

HOM SAP by DAVID AUSTIN



لفظوں کے انبار میں

مجھے ڈھونڈنا ہے
تو پہلے
حصارِ بدن سے نکل آؤ باہر
بکھر جاؤ
ذرّوں کی مانند
صحرائے فکر و نوا میں
کہ میں
اپنے گھر کی اک اک شے میں
مدفون ہوں
گھر سے باہر فضاؤں میں
بکھرا ہوا ہوں
کتابوں میں لکھا ہوا ہوں
تراشیدہ لفظوں کے انبار میں
دب چکا ہوں
دماغوں کے زندانوں میں بند ہوں
اور دفتر کی سب فائلوں میں
کچھ اس درجہ
پھیلا ہوا ہوں
کہ اب
ڈھونڈنے والوں کو
پہلے خود بھی بکھرنا پڑے گا!

ظہیر غازی پوری

غزل

ظہیر غازی پوری

آئینہ چہرے سے اور عکس تباہی سے بچا
مجھ کو میں نے نہیں دیکھا تو گواہی سے بچا

یہ بھی اچھا ہوا لکھا نہ مجھے تو نے کہیں
ذہن فکروں سے تو کاغذ بھی سیاہی سے بچا

کیوں یہ بیٹھے ہو لئے دامن یوسف کی مثال
کون اس دہر میں ناکردہ گناہی سے بچا

ان زمینوں کی طرف اب کے سفر کرنا ہے
جن کا ہر خط نقوشِ کفِ راہی سے بچا

اس کو شبنم کی لطافت بھی گراں گزری ہے
دشتِ غم میں جو تری شعلہ نگاہی سے بچا

جسم چھلنی ہوا، نشتر گئے، نیزے بھی چبھے
شیشۂ شیشہ مگر احساس تباہی سے بچا

آج تک آئینۂ فکر و مطالب کیسے
میرے اندر کے انا دار سپاہی سے بچا

سباعی

سکندر توفیق

[سباعی، اردو کے شعری ادب میں ایک نئی صنف ہے نوعیت کے اعتبار سے یہ خالص اردو اور خالص ہندستانی ہے۔ سباعی "سبع" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سات۔ اس لیے اسے رباعی کے وزن پر "سباعی" کہنا صحیح نہیں۔

"سباعی" کی تعریف ہے: سات مصرعوں والا ایسا مسمط (یا نظم) جس میں ایک اور صرف ایک مستقل مضمون ڈرامائی اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ وحدت تاثر حاصل ہو۔ ساخت کے لحاظ سے سباعی مندرجہ ذیل اشکال پر مشتمل ہوتی ہے:۔

۱۔ مصرع + مسدس	۵۔ ۱ مصرع + مخمس + ایک مصرع
۲۔ مسدس + مصرع	۶۔ مربع + مثلث
۳۔ ۲ مصرعے + مخمس	۷۔ مثلث + مربع
۴۔ مخمس + ۲ مصرعے	۸۔ قافیوں کا کوئی اور دروبست

ذیل میں چند سباعیاں، بطور نمونہ پیش ہیں۔

(سکندر توفیق]

شباب، شیب بنا ماجرا سناتے ہیں
کہ زندگی کے ورق کو اُلٹتے جاتے ہیں
ہماری ہستی نگارندۂ امور جنہیں
جو فصل بوئی کبھی تھی وہ اب سکھاتے ہیں
سرورِ وقت کی تکرار ہے، نہیں فردا؟
پلٹ پلٹ کے وہی روز، آتے جاتے ہیں
ہم اپنے آپ کو دہرا کے تھکے جاتے ہیں

۲

سوتے ہیں شہر سارے، ویران بستیاں ہیں
وہ جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
سب وقت کی گپھا میں گم گشتہ ہستیاں ہیں
پہچان تھی انھیں سے اِس مشتِ خاک کی بھی
صحرانوردیوں کی، دامن کے چاک کی بھی
دل کے قریب اب تو عصرِ جدید آئے
اپنائیت سے کہتا ھل من مزید آئے

۳

چھوڑ کر شہرِ وفا جب مرے احباب گئے
دل کی دھڑکن کے وہ انداز وہ آداب گئے
تھے مسرت کے امیں سارے جو اسباب گئے
مرے ماحول کے خوش رنگ وہ القاب گئے
بے وطن مجھ کو کیا اپنے وطن میں یکسر
دوست، سب لے گئے، تسکین وخفاں کے منظر
میں اُنا بستہ اندھیرا وہ پراگندہ سحر!

۴

عکس آئینہ مرے پیکرِ خاکی کی نمود
بزمِ اغیار میں شہرت مری افواہ کبود
کیا بتاؤں میں تجھے کیا ہے مرا سِترِ وجود

مرا مسکن نہ مکاں ہے نہ زماں ہے اے دوست
ان میں ہستی کی روانی ہی عیاں ہے اے دوست
میرا مسکن تو ترا دل ہے جہاں پر میں ہوں
میری پہچان، وہی ترا گماں ہے اے دوست

۵

انتشارِ ارماں کا احتساب وعدوں کا
وقت کب رہا باقی پھر نئے ارادوں کا
زندگی بسر کرنے مشغلہ ہے یادوں کا

زیست، سانس لینے کا، گویا اک قرینہ ہے
اب نہ کوئی مقصد ہے مدعا نہ منزل ہے
سجتی اب تصور میں کل کی بکھری محفل ہے
مضمحل قوی سارے دل مگر وہی دل ہے

۶

نخلِ امید پر کھلا غنچۂ پُر فضا ہے موت
اپنے ہر ایک درد کی سمجھو تو اک دوا ہے موت
ایک پیامِ سرخوشی ایک حسیں ندا ہے موت
کیسی نگارِ دلربا کتنی یہ خوش ادا ہے موت

دل کو وفورِ یاس کی گھیر چکی سیاہ رات
صبحِ امید موت ہے موت ہے رمزِ کائنات
جلوہ کے نثار کیجے نقدِ حیات بے ثبات

وحدت الوجود کا اسلامی نظریہ۔

کتابستان

کتابوں کی باتیں

[بعض کتابیں تنقید و تبصرہ چاہتی ہیں بعض بعض خاموشی کی طلب گار ہوتی ہیں، بعض تفصیل طلب ہوتی ہیں، بعض مطالعہ طلب۔ "عصری ادب" کو ہر سہ ماہی بڑی تعداد میں تبصرے کے لیے مطبوعات موصول ہوتی ہیں۔ سب پر تبصرہ ممکن نہیں خواہ تبصرہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ لہٰذا ہم موصولات کے ضمن میں ان کا ذکر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بعض سہواً یا کسی تبصرہ نگار کی تساہلی سے نظرانداز ہو جاتی ہیں۔ آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔

جن حضرات نے پچھلے ایک سال میں اپنی کتابیں "عصری ادب" کو بھیجی ہوں وہ براہ کرام یاد دہانی ضرور کرا دیں۔ ۱۹۹۰ء میں "عصری ادب" غیر حاضر رہا، ڈاک بھی گڑبڑ رہی جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ م ۔ ح]

یوگیش کمار کی دو کتابیں اور پھر کناڈا کے خالد سہیل کی تین کتابیں کسی بھی تبصرہ نگار کا امتحان بن سکتی ہیں۔ یوگیش ہندستان میں رہتے ہیں کتابیں بھی یہیں چھپتی ہیں اور بازاروں میں مل سکتی ہیں۔ خالد سہیل پاکستان میں پلے بڑھے اور اب کناڈا کے شہری ہیں۔ ان کی کتابیں پاکستان میں چھپیں اور ہندستان میں نہیں ملتیں مگر دونوں مصنفوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے

کہ انسان کو انسان اور صرف انسان کی حیثیت سے دیکھنا اور پیش کرنا چاہتے ہیں اور جتنے تفرقے، تعصبات اور تاثرات کے لیبل، جغرافیہ اور جنس، مذہب اور رسم و رواج کے بندھن، تہذیبی منطقوں کی تقسیمیں ممکن ہیں ان سب سے اوپر اٹھنا چاہتے ہیں۔ فخر کی بات ہے کہ یہ عالمی سطح کی تخلیقات اردو میں لکھی گئیں اور اردو میں شائع ہوئیں۔ دونوں مصنف اردو ادب کو بین الاقوامی سطح کی روشن خیالی سے ہمکنار کرنے کے کوشاں ہیں: 'بے نام قاتل' کی امریکی لڑکی کا مکالمہ روشن خیالی کے اس عظیم جہاد کا اشاریہ ہے:

"یوگی! اپنی حفاظت کرنا سیکھو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اور مجھے بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں وہ نہیں ہیں جیسا ماما ہمیں دیکھنا یا بنانا چاہتی ہیں تم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے تم مرد ہو اور میں عورت، اور یہی وہ سچائی ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے پاس کھینچ لائی تھی۔ ماما اپنی حکمرانہ خواہش کی تکمیل کی خاطر آج ہم پر ہندستانی اور امریکی لیبل چپکانا چاہتی کیونکہ وہ بخوبی جانتی ہے کہ دنیا کے لوگوں پر حکومت کرنے سے قبل ان کو بانٹنا یا تقسیم کرنا ضروری ہوتا ہے ایسا کیے بغیر اس کی ظالمانہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ ماما ہماری بھلائی نہیں چاہتی کیونکہ ایسا کرنے سے خود اس کی اپنی موت ہوتی ہے۔" ص، ۱۵

'بے نام قاتل' کہانی بھی ہے اور مجموعے کا نام بھی اور اس مجموعے میں دو ناولٹ اور دو افسانے شامل ہیں۔ 'پیگی' کردار کا روحانی سفر، تکنیک اور نفس مضمون دونوں لحاظ سے منفرد ہے جو ایک امریکی لڑکی کی انسانوں سے اتھاہ پیار کی بنتوان کونسل، ملک، قومیت، مذہب اور روحانیت کے نام پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں سے ٹکراتے دکھاتی ہے اور ایک ایسی جمالیاتی کیفیت اور کردار نگاری کا ایسا دل چھو لینے والا مرقع چھوڑ جاتی ہے جو معاصر اردو ادب میں

نایاب ہے اور یہ کہانی یہیں کی ہیں۔ اس کے نیگرو دوست، ڈکنامین ہندستانی ٹرومیشور، مالک چند پنجابی، ڈِل سنگھ کانسٹبل، ڈاکٹر مسرا، ایک یتیم ہندستانی لڑکے اور ایک ہندستانی بچ شفیع قریشی کی زبانی بیان ہوئی ہے جو مختلف اخلاقی قدروں کو نسل، قوم، زمانے، طبقوں اور شخصیتوں کی چھلنیوں سے گزر جاتی ہے اور آخر میں معصوم بچی کو مری کو گنا ہگار ٹھہراتی ہے جرم جرم بے گناہی، قصور؟ انسانیت سے غیر مشروط پیار۔

یہی قصور افسانہ "کالے سائے" میں گم نام نوجوان کا ہے جو اپنا نام جیمز بریڈلے بتاتا ہے اور جب پولیس انسپکٹر اسے بتاتا ہے کہ "وہ بیچارا تو اسپتال میں پڑا ہے گولی اس کی ناک کو چیرتی ہوئی نکل گئی ہے اور ممکن ہے کہ مر بھی جائے تو وہ گمنام نوجوان صرف اتنا کہتا ہے:

"ہم نہیں مریں گے ..... شریف کلارک کے بکتر بند سپاہی تتر بتر ہونے کا حکم دیں گے لیکن ہم گیت گاتے آگے بڑھتے جائیں گے۔" ص ۹۶

سنوفلادریس یادگار کردار مسز مرفی کا ہے جس کی کردار نگاری میں مصنف نے اپنی ساری شائستگی، ہنرمندی اور صاحب نظری صرف کر دی ہے مسز مرفی کے ہاں محبت کا جو نازک تصور ابھرا ہے وہ بڑا ہمہ گیر اور بھرپور ہے ایسا ہمہ گیر اور بھرپور حس کی مثال اردو ادب میں مشکل سے ملے گی۔ اس کا کردار پڑھنے والے کے تصورِ حیات کو متاثر کرتا ہے۔ سنوفلاور زندگی کی لطافت اور اس کی کثیف افادیت اور منفعت پروری کی دردناک آویزش کی کہانی ہے اور بقول مسز مرفی:

"دراصل کائنات میں پائی جانے والی مختلف اشیا ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہم شاید اسی لیے پریشان رہتے ہیں کیونکہ ہم ایسی رشتوں کو پہچان نہیں پاتے۔" ص ۸۵

(بے نام قاتل" ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ گلی وکیل والی۔ لال کنواں، دہلی۔ ۱۹۹۱ء صفحات ۱۵۰، قیمت ۶۰/-)

آخر میں یہ ذکر ضروری ہے کہ ویگیش کمار نے امریکہ میں چھ سال قیام کیا اور دونوں ناولٹ اور افسانے امریکی زندگی کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں لیکن ان کا فکری اور حسیاتی دائرہ آفاقی ہے اور اسے جغرافیائی حد بندی میں قید نہیں کیا جاسکتا۔

کلر بلائنڈ (افسانے) ________________ انور قمر

قلم پبلی کیشنز۔ بمبئی صفحات ۱۴۴ قیمت: -/۴۰

حال میں شائع ہونے والے مجموعوں میں کلر بلائنڈ کی نمایاں حیثیت ہے ان افسانوں میں ایک نئے ڈھنگ سے علامتی افسانے اور واقعاتی افسانے کو ہم آہنگ کیا گیا ہے اور تعمیم اور تہہ داری کی مدد سے افسانوں میں معنویت کے متعدد زاویے ابھارے گئے ہیں۔ انور قمر کو کہانی کہنے کا فن بھی آتا ہے اس لیے علامتی رنگ کے باوجود یہ افسانے دلچسپی قایم رکھتے ہیں۔ بعض افسانوں کی تہہ داری انھیں دور حاضر کے اہم ترین افسانوں میں شمار کرنے کا مستحق بناتی ہے خصوصاً مہر بند، گم شدہ باپ، ذبیحہ اور پرندے کا سایہ جن میں بیک وقت اپنے دور اور اپنے ملک کے ہنگامی مسائل کو انسان کے ازلی وجود کی کشمکش سے پیوست کرکے افسانے کی تخلیق کی گئی ہے تکنیک کی سادگی اور انداز بیان کی روانی اور دلکشی نے ان افسانوں کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

مہر بند ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو سات دروازوں والی ایک پُر اسرار عمارت میں داخل ہوتا ہے جہاں تنہا رہنے والا انسان اپنی دلچسپیوں کا حال اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب بھی دل گھبراتا ہے وہ اس عمارت کے تہہ خانے میں اُتر جایا کرتا ہے۔ وہ رخصت کے وقت اسے بھی نصیحت کرتا ہے کہ:

"آپ دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہا کریں اس کی بجائے آپ اپنا گم شدہ تلاش کریں...... آپ کی دنیا تقریباً ہر عمارت میں لفٹ ہے پر دکھ کی بات یہ ہے کہ لفٹ اوپر کی جانب

"بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہر عمارت میں ایک تہہ خانہ بھی ہوتا ہے...... تہہ خانے میں اتر کے دیکھیے کہ تہہ خانے کے راستے آپ کو کہاں پہنچاتے ہیں:"

یہ محض خود شناسی اور عرفان ذات کی ترغیب نہیں، اس میں اپنے آپ کو پہچاننے کے علاوہ انسان کو تمام لوازم کے ساتھ پہچاننے کا رمز بھی ہے۔

اسی طرح گم شدہ باپ، جہاں جنریشن گیپ (نسلوں کے درمیان خلیج) کا افسانہ ہے وہاں معاشروں کی مغائرت کی کہانی بھی ہے۔

بہرحال افسانوں کا یہ مجموعہ نہایت توجہ اور دلبستگی کے ساتھ مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے اور یقیناً دورِ حاضر کے افسانوی ادب میں اہم اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔

* جمال ہم نشیں ــــــــــ مترجم: راجندر سنگھ ورما
گھاس منڈی، شیرانوالہ گیٹ، پٹیالہ صفحات ۲۰۰ قیمت -/۱۵

راجندر سنگھ ورما لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ہندو پاکستان کے ممتاز معاصر انگریزی شعرا کے شاہکار اردو نظم میں ترجمے کیے ہیں اور کامیابی سے کیے ہیں ان سے یقیناً اردو شاعری کا افق وسیع ہوگا اور موضوع، طرزِ ادا، اور امیجری کی رنگارنگی سے فیض یاب ہونے کا موقع ملے گا...... .... علاوہ، احمد علی، کملا داس، دلیپ چترے، نسیم، ازیکیل جیسے شاعر شامل ہیں۔ شان الحق حقی کا مختصر سا پیش لفظ بھی اہم ہے۔ ماضی پرستی کے موضوع پر پرتیش نندی کی ایک مختصر نظم کا ترجمہ دیکھیے اور ورما جی کی کاوش کی داد دیجیے:

۱۔ گیا ہوں میں
۲۔ جہاں بھی جس طرف بھی
۳۔ غم تنہائی سے پالا پڑا ہے
۴۔ سوا کچھ اور احساس جلا وطنی ہوا ہے

۵۔ زباں میری محبت کی زباں ہے
۶۔ مگر میرا وطن جانے کہاں ہے
۷۔ میں ہوں رمز آشنا سب موسموں کا
۸۔ بپینے کار پرداز انِ فطرت
۹۔ بدلنے لگتے ہیں جب اپنی رنگت
۱۰۔ تو بہتا چڑھا ندھتا ہے مجھ سے پیمان محبت
۱۱۔ مجھے ڈستی ہے یہ وحشی وراثت
۱۲۔ مرے چھونے سے (کیا طرفہ ستم ہے)
۱۳۔ بدل جاتی ہے پتھر میں ہر اک شے

۳، ۴ میں قافیے کی کھنک اور ۸، ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں قافیے کی بحر کی ہم آہنگی اور پھر آخری دو مصرعوں کی صوتی کھنک قابل داد ہے۔

"مٹھی میں ریکھا" (افسانے) ________ منظر کاظمی

سائمہ پبلی کیشنز۔ جونڈی صفحات ۱۳۸ قیمت: ۱۰۰/-

منظر کاظمی کے ۱۷ افسانوں کا خوبصورت اور بہت ہی خوبصورت چھپا ہوا یہ مجموعہ انسان کے اندر درندگی اور شائستگی کے کشمکش کی داستان ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف شکلوں میں دہرائی جاتی ہے۔ بار بار منظر کاظمی کی کہانیاں انسان کے اس حیوانی وجود کی واپسی کا ذکر رنگا رنگ علامتوں کے ذریعے کرتے ہیں کہیں جنگل کی طرف واپسی ہے، کہیں آسمان کی کائی میں پٹا ہوا چاند ہے، کہیں فرقہ وارانہ فسادات ہیں تو کہیں چری ہوئی ٹانگیں۔ یہ پارہ پارہ شخصیت اسی اشرف المخلوقات انسان کی ہے جو کہیں طوطوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تقریریں، قصے یہاں نہیں ہیں، اور اگر ہیں تو بکھرے ہوئے اس بکھراؤ کے پیچھے احساس کا کرب البتہ نمایاں ہے۔

(م۔ خ)

• برف زار (شعری مجموعہ) ——— عبدالقوی ضیا
پاکستان کلچرل سوسائٹی سٹر بری (کناڈا) صفحات ۱۶۰ قیمت: -/۰

کناڈا میں رہ کر اردو کی کلاسیکی غزل کی تمام روایتوں، لطافتوں اور نزاکتوں کو ملحوظ رکھ کر شعر کہنے والے مورخ شاعر عبدالقوی ضیا کی غزلوں کا یہ مجموعہ احساس اور جذبے کی ہلکی ہلکی آنچ سے روشن ہے اور غزلوں میں لہجے کی چمک بھی ہے اور انداز بیان کی طرفگی بھی۔

محبت تھی فروزاں درد کا احساس تھا جب تک
ہوئی انسانیت رخصت تو انسانوں کو نیند آئی

مگر کہے نئے گوشے بھی ہیں (کچھ نہیں ہے تو یہ ہوتا کیسا کہیں نئے استعارات پیکر ہیں (کوئی ٹوٹا ہے کوئی آئینہ کیا) غرض "برف زار" کا مطالعہ رنگا رنگ کیفیات سے گزرنا ہے اور کلاسیکی مزاج کے قاری کے لیے کیف اور لطف سے بھرپور۔

• جمع و خرچ وفا (مجموعۂ کلام) ——— راشد آذر
سوما جی گوڑہ۔ حیدرآباد صفحات ۱۴۴ قیمت: -/۱۶

راشد آذر دور حاضر کے کامیاب اور نامور نظم نگاروں میں ہیں۔ گو اس مجموعے میں چند غزلیں بھی ہیں مگر ان کا آرٹ بنیادی طور پر نظم کا آرٹ ہے وہ ذاتی تجربے میں وسیع تر تہذیبی اور انسانی صورت حال کو پیش کرتے ہیں اور دردمندی سے پیش کرتے ہیں ان نظموں پر کبھی کبھی محض عشقیہ یا ذاتی اور واردِ ذاتی ہونے کا شبہ ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے وسیع تر معروضی حقیقتوں کا تانا بانا بڑی خوبی سے بُنا گیا ہے۔ رشتۂ ماضی و حال کے یہ مصرعے دیکھیے:

وہی ہے آج بھی ماضی و حال کا رشتہ
دروغ مصلحت آمیز حاکم دوراں
صداقت آج بھی ہے سینہ چاک و تشنہ دہن....

حیات گھوم رہی ہے زمین کے محور پر
افق کے پار کسے دیکھنے کی ہمت ہے۔

یہی انداز" یہ کیا غضب ہے" "شب فسانے تھے" "اور" دار و تہہ دام"
" پیرِ تسمہ پا" میں نمایاں ہے اور شاید سب سے زیادہ بے محابا طور پر "خوابوں
کے رشتے" میں منظوم ہوا ہے:

وہ خواب جو میری زندگی تھے
وہ کب کے ردی کی ٹوکری میں
پڑے ہوئے ماندگی کے وقفے کے منتظر ہیں
کہ میں کبھی کارزارِ ہستی میں شور و غل سے
تھکوں تو بس ایک لمحہ رک کر
انھیں اٹھالوں۔

راشد آذر کی نظموں کا کثیر الجہتی انداز اور اس کے ساتھ ان کے احساس
کی صلابت نے اختر الایمان کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

"بین کرتا ہوا شہر" (مجموعہ کلام) ——————— عتیق اللہ

اردو مجلس یتیم پورہ، دہلی ۳۴ صفحات ۱۲۸ قیمت: ۳۲/۰۰

بائیس نظموں اور اکیاون غزلوں کا یہ مجموعہ صلابتِ احساس سے
بھرپور ہے۔ عتیق اللہ تلازموں کی نئی فضا لے کے آئے ہیں۔ التماس کی سوکھی
شاخوں پر ٹنگے ہوئے صبر کے چیتھڑے، ابتدا کی ہولناک دھند، دلدل میں
پھنسا ہوا چاند، بے بیان واپس جاتے ہوئے رسول، یہ سب تلازمے اور ترکیب
ایسے چوٹ کھائے ہوئے احساس کا پتہ دیتے ہیں جو درد سے چور ہے مگر
ابھی تک کسی آسودہ بخش حل تک نہیں پہنچا ہے۔ "دوسرے درجے کا شہری" اور
"اب" مجموعے کی اہم نظمیں ہیں۔ ایک اندھی آندھی ہے جس کے تلاطم ان نظموں
میں بار بار محسوس ہوتے ہیں عتیق اللہ اس آندھی کو نظم کے استعاروں میں

ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں گو اس میں مین کا لہجہ غالب نظر آتا ہے اور اس زہر کے اندر سے اُبلتا ہوا شعوری کیفیت کا اثر کہیں کہیں مدھم پڑجاتا ہے عتیق اللہ احساس اور فکر کو پیکر تراش تخیل کی سطح پر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

برہنہ دیویاں ننگے سیاہ رو اصنام
کسی کسی کے تو سر پر اُگے ہوئے ہیں سینگ
کسی کسی کی تو پیشانیوں پہ آنکھیں ہیں
کوئی پہاڑ اٹھائے ہوئے ہے شانے پر
کسی درخت کے نیچے پڑا ہوا ہے کوئی
کسی کے ہاتھ میں آدھا بدن ہے انساں کا
کسی کے پاؤں کے نیچے کوئی تڑپتا ہے
ہزار پا کوئی مصروف بادیہ پیما
کسی کے پاؤں تلے معبدوں کے مینارے
کسی کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی صلیبیں ہیں (ص۴۹)

عتیق کی نظمیں البتہ ایک جھٹکے کے ساتھ اچانک ختم ہو جاتی ہیں۔ شاید ان کے اختتامیے زیادہ توجہ چاہتے ہیں۔ یہ مجموعہ ہلا شبہ راشد اور اختر الایمان کی روایت کو آگے بڑھانے والی نظموں سے عبارت ہے گو ان نظموں کی تعداد کم ہے اور نصف سے زیادہ حصہ غزلوں نے گھیر لیا ہے غزلوں میں کئی اچھے، بے جا اور بے ساختہ شعر ہیں۔ مثلاً

اُلٹ پڑی ہے زمین سر پہ کر زیر پا کوئی آسماں ہے
ترے غبارِ نفسوں سے نکلا ہوا وہ سیارہ اب کہاں ہے

خون کی دھار تیز رو ہے بہت
اک گماں سا ہے ابر کا بیات کم

ایک اور صرف ایک قیمت   ایک سے زیادہ ہو تو تم ذکر

ہم سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب ہم نے قدم رکھا یہ خاکداں ویراں تھا

سبھی کے ہاتھ کٹے ہیں بریدہ سر ہیں سبھی
یہ کس طرف سے نکلنے کا اتفاق ہوا

صحرائے اعظم (ڈراما) ———— زاہدہ زیدی
سر سید نگر علی گڑھ   صفحات ۱۴۳   قیمت ۱ ۰/۷۰

سیموئیل بیکٹ کے ڈرامے "گودو کا انتظار" کے دو مرکزی کردار گوگو اور دیدی (دلادی میر) کے گرد زاہدہ زیدی نے خلیجی جنگ میں عراق اور امریکا اس کے اقوام متحدہ والے حلیفوں کے ٹکراؤ اور کمزور ملکوں کی بے بسی کو تمثیلی پیرایے میں ڈھالا ہے۔ شہنشاہ کیلکس گویا صدر بُش کا دوسرا نام ہے اور اس کے گرد منڈلاتے والے امرا اور نواب ——— شاہ خرگاں، شاہ طلائی، شاہ جوہری (خلیجی) عرب ممالک ہیں اور نواب خلافت، نواب مخاصمت اور نواب مباشرت امریکہ کے دیگر حاشیہ نشیں ملکوں کے نام ہیں ——— راجہ جے شنکر (ہندستان کے چندر شیکھر ہیں) اور نواب غریب نواز (پاکستان کے نواز شریف ہیں)۔

گوگو اور دیدی دنیا کے عوام کے نمایندہ ہیں اور بہرام (صدام حسین کے ڈرامائی روپ) کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں۔ جنگ تو وہ نہیں روک سکے مگر وہ آخر میں طے کرتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا اور سنا ہے وہ دنیا بھر کو اسے ڈرامے کی شکل میں دکھائیں اور سنائیں۔ (ص ۱۳۴)

ڈرامے میں سبھی واقعات اور کردار گویا استحصال کا ننگا روپ ہیں۔ مکالمے طویل ہیں اور کردار تجریدی ہیں اور بر ملا طور پر علامتی ہیں اور ڈرامے کا طرزِ بیان

ہوا دست ہے ۔ مقالے کہیں کہیں بہت طویل ہو گئے ہیں لیکن کویت پر قبضہ
عراق اور پھر اس قبضے سے خلیجی جنگ کے شعلے بھڑکے، امریکا کے نئے عالمی
نظام کے ظہور اور سوویت روس کی بے بسی کے پیچھے کارفرما عناصر کا زیادہ
گہرا اور زیادہ تجزیاتی مطالعہ ڈرامے کو کہیں زیادہ موثر بنا سکتا تھا۔

● "کچے گھڑے" ——— یوگیندر پال طائر
ہما پبلی کیشنز جموں صفحات ۱۳۶ قیمت: ۲۵/-
طائر کی غزلوں کا یہ مجموعہ ایک حساس شاعر کی مختلف کیفیات کا آئینہ ہے
عرش صہبائی کے شاگرد رشید ہیں اور کلام میں دردمندی اور طرفگی موجود ہے۔

● "سحر نشاں" مجموعۂ کلام ——— سید احمد سحر
خلیل غربی، شاہ جہاں پور صفحات ۱۷۵ قیمت، ۵۰/-
غزلوں، نظموں اور قطعات کا یہ مجموعہ قومی اور عالمی واقعات سے متاثر
ہونے والے حساس شاعر کے جذبات کا مرقع ہے جس میں شاعر کی ذات اور
اس کا عہد دونوں جلوہ گر ہیں۔

● "مٹی کا قرض" (ناول) ——— اظہار صہبائی
بازید خیل، شاہجہاں پور صفحات ۱۸۱ قیمت ۵۰/-،
مجاہد آزادی اشفاق اللہ خاں کی سوانح پر لکھا ہوا یہ ناول قومی اور
مذہبی جذبے سے سرشار ہے۔ پورا ناول فلیش بیک میں لکھا گیا ہے اور
اشفاق اللہ خاں کی گھریلو زندگی، ان کی انقلابی مہمات، نیپال، دہلی اور
کاکوری کے ان کے سفر اور پھر جیل کی سرگزشت، خوبی سے بیان کی گئی ہے
ناول نگار نے اشفاق اللہ خاں کے کردار کو ملک کے مجاہدانہ رنگ روپ
کے پس منظر میں کامیابی سے پیش کیا ہے وہ بھی ایک ایسے دور میں جب
کہ ان مجاہدوں کو تیزی سے بھولتا جارہا ہے۔

(م۔ ح)

• "اکتساب نظر" (مضامین) ــــــــــــــــ راہی فدائی

ابو الحسان اکادمی۔ کڑپہ (اے پی) صفحات ۱۱۲ قیمت: -/۳۰

اس مجموعے کے بعض مضامین اردو دنیا کے لیے نئی معلومات فراہم کرتے ہیں خاص طور پر مثنوی یوسف زلیخا کا نو دریافت مخطوطہ و شارم میں اردو اور سب سے بڑھ کر اختر کڑپوی کی مثنوی در مدح ٹیپو سلطان شہید والا مضمون توجہ کا مستحق ہے۔

• "اردو شاعری میں دوہے کی روایت" ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی

اردو بک سنٹر۔ علی گڑھ صفحات ۳۰۳ قیمت: -/۸۰

دوہا، عروض، لہجے اور شعری لوازم کے اعتبار سے برج بھاشا اور اودھی میں منفرد صنف ہے۔ اردو میں دوہے لکھتے وقت عام طور پر ان لوازم کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا اسی لیے اردو کے دوہوں میں سے اکثر ہندی دوہوں کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ سمیع اللہ اشرفی نے دوہے کی روایت سے تفصیلی بحث کی ہے اور ڈنگل ہندی اور اردو کے عروض سے واقفیت فراہم کی ہے اردو میں دوہا لکھنے والوں کے نمونے جہاں تک ہو سکا ہے مصنف نے فراہم کرائے ہیں۔ دوہے پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب اہم ہے اور اس کے بغیر اردو دوہے کا کوئی مطالعہ مکمل نہیں ہوگا۔

• "ڈگر پنگھٹ کی" (ڈرامے) ــــــــــــــــ رفعت سروش

نورنگ کتاب گھر۔ نئی دہلی ۱۸ صفحات ۱۶۰ قیمت: -/۶۰

رفعت سروش کے چھ ڈراموں کا مجموعہ۔ پہلا ڈراما امیر خسرو پر ہے دوران کے زندگی، دور اور شاعرانہ کمال کو تمثیلی رنگ میں پیش کرلیے بمصور بگولے اور غنچہ پھر لگا کھلنے اور زندگی کی طرف ریڈیائی ڈرامے ہیں اور مختلف سماجی، فنی اور نفسیاتی مسایل کو پیش کرتے ہیں ان میں سب سے کامیاب ڈراما "زندگی کی طرف" ہے جس میں بلراج کی ذہنی الجھنوں کو تحلیل نفسی

کا طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ڈرامے کا فنی پہلو مجروح نہیں ہوا ہے

* تابوت کی صدا ___ شاعر: نرگسن پاڑسی

مترجم: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

کامران پبلی کیشنز، رحمت بلڈنگ، دیوان بازار کٹک ۷۵۳۰۰۱

صفحات ۹۶ قیمت: ۳۰/-

نرگسن پاڑسی کی موت اور موت کے پس منظر میں تصورِ حیات پر مربوط اُڑیا نظم حفیظ اللہ نیولپوری نے بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کی ہے ترجمہ شستہ اور رواں ہے اور نظم خیال انگیز اور فکر خیز۔

* سورج کو روک لو ___ مقصود ایس اے حسنی

المنیر فیروز پور روڈ۔ لاہور صفحات ۹۶ قیمت: ۴۰/-

مقصود ایس اے حسنی کی نثری غزلوں کا مجموعہ جس میں غزلیت کم ہے مگر اپنے دور کا دکھ درد غالب ہے۔

(م۔ح)

* ہندستانی معاشرے میں مسلمانوں کے مسائل مترجم: ڈاکٹر اشفاق محمد خاں

پیٹریاٹ پبلشرز، بہادر شاہ ظفر مارگ۔ نئی دہلی صفحات ۳۰۰ قیمت: ۷۰/-

یہ کتاب ہندستانی مسلمانوں کے سماجی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی مسائل اور معاملاتِ زندگی سے متعلق ۳۹ مضامین کا مجموعہ ہے جو گراں قدر نامور ادیبوں اور دانشوروں نے ان مسائل پر لکھے ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ ان میں ہندستانی مسلمانوں کے متنوع مسائل کو منفرد اور معروضی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ بظاہر تو اس کا موضوع ہندستانی مسلمانوں کا احاطہ کرتا ہے لیکن درحقیقت اس کتاب کا دائرہ کار بہت وسیع ہے جو مذہب اور سیاست، تاریخ اور اقلیتی تہذیب کے مسائل سے جڑا ہوا ہے۔

(اطہر فاروقی)

۔ بے دلی پوشیدہ..... ________ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں
صفحات قیمت

ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کے ۸ مضامین اور ۳ تراجم پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جو ادب اور تنقید، سماج اور سیاست، مذہب اور تہذیب سے متعلق کچھ نئے رجحانات، فکر انگیز خیالات اور تازہ معلومات سے ہمیں متعارف کرتی ہے خاص طور پر قلیم گنج کی تہذیبی زندگی پر شہر نامہ قابل قدر ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ہے۔

(اطہر فاروقی)

۔ ٹوٹا ہوا آدمی ________ ڈاکٹر خالد سہیل
ناشر۔ ۱۲۹۶، بلور اسٹریٹ ویسٹ۔ ٹورنٹو (کناڈا)
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، لکھنؤ صفحات ۲۳۰ قیمت: ۸۰/-

ڈاکٹر خالد سہیل ایک ماہر نفسیات ہیں۔ انھوں نے اپنے اس ناولٹ میں ایک نفسیاتی مریض کی اذیتوں کا تجزیہ کیا ہے۔ غریب الوطنی کے کرب کو قاری تک پہنچانے کے لیے انھوں نے کناڈا کی زندگی کا انتخاب کیا ہے جہاں وہ خود رہتے ہیں اور اس زندگی کو قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک نوجوان شہزاد ملک والدین کے ساتھ کناڈا آجاتا ہے مگر گھر کی مشرقی تہذیب اور باہر کی بے فکر فضا اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ بات بات پر غصہ کرتا ہے جس کی وجہ سے گھر کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور باہر کے لوگ اسے برداشت نہیں کر پاتے ہیں لیکن بیوی کی ہمدردی اس کی زندگی کے رُخ کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ شہزاد تمام تر تلخیوں کا زہر اپنے حلق سے اتار لیتا ہے۔ لیکن کناڈا کا قانون، جو جذبات سے عاری ہے، بیوی کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح مصنف نے مشرق و مغرب کی قدروں کی کشمکش پر گہری چوٹ کی ہے۔ شہزاد کی الجھنوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے لیکن بالآخر ہم ...

ایک بھٹکے ہوئے انسان کا کردار ہے جس نے دنیا دیکھی ہے اور ہر پہلو سے دنیا سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شہزاد کو صحیح راہ دکھاتا ہے اور شہزاد ٹھوکر کھانے سے بچ جاتا ہے۔

اس ناولٹ میں مغربی طرزِ زندگی کے جن پہلوؤں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے وہ قاری کے لیے کسی عجوبے سے کم نہیں ہیں۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کا اپنے مریض سے شادی نہ کرنے کا قانون۔

جنسی بے راہ روی کی تصویر کشی اتنی رواں اور برجستہ ہے کہ کہانی کا ایک اہم اور ضروری حصہ محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ پڑھتے وقت قاری چونکے گا ضرور لیکن کہانی کا بہاؤ رکتا نہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف کی تہذیبی جزئیات پر گہری نظر ہے۔ وہ ایک دانش ورانہ شعور رکھتے ہیں بعض حصے قاری کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتے ہیں۔

اظہارِ خیال کی بے باکی ناولٹ کی حقیقت کے دائرے میں لاکھڑا کرتی ہے اور مصنف جو کچھ کہنا چاہتا ہے بلا کم و کاست کہنے میں کامیاب ہے۔

خالد سہیل کا شوخ طرزِ تحریر ان رومان پرور فضاؤں اور جنسی لذت کو بے باکی سے پیش کرنے میں کبھی واضح اور کبھی مبہم اشارے نہایت دل چسپ پیرائے میں کرتا ہے۔ ان کے اس اندازِ بیان میں دل کشی ہے اور کہانی پن قاری کے ذہن کو محیط کیے رہتا ہے اور اس وقت کہانی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح مصنف نے مغربی تہذیب کی ظاہری اور باطنی تصویریں بہت نفاست اور دردمندی سے کھینچی ہیں۔

آخر میں جج اپنا فیصلہ سناتا ہے تو مصنف کا مرکزی نقطۂ نگاہ پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے اور شہزاد کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ جج کے فیصلے کا احترام کرے۔

شہزاد ملک اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہے جسے مصنف نے بہت خوبصورتی

سے تراشا ہے۔ اس کردار کے ذریعے کناڈا کی اُس سوسائٹی کی کی نہیں مغرب اور مشرق کی اقداری کشمکش کی بڑی عبرت ناک عکاسی کی ہے۔ جیوٹی کا کردار بہت صحت مندانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ بہت نڈر ہے کسی کے آگے جھکتی نہیں ہے وہ، وہ کرنا پسند کرتی ہے جو اسے اچھا لگتا ہے مگر قانون کے سامنے مجبور ہو جاتی ہے، ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ اس ناولٹ کا بہت مثبت پہلو ہے۔

جگہ جگہ ناولٹ میں انھوں نے غالب کے اشعار کا برمحل استعمال کیا ہے بعض اشعار کے ٹکڑے بھی اپنے جملوں میں استعمال کیے ہیں جو اسلوب بیان کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ناولٹ کے ابواب کے عنوانات بھی غالب کے اشعار کے مصرعوں پر رکھے ہیں جو کہانی سے بہت مطابقت رکھتے ہیں۔

ہارون ایوب

"مقدس جیل" ــــــــ ڈاکٹر خالد سہیل

ناشر۔ ۱۲۹۶، بلور اسٹریٹ ویسٹ۔ ٹورنٹو (کناڈا)

ملنے کا پتہ:۔ نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ۔ لکھنؤ

دوسرا ناولٹ "مقدس جیل" دراصل ایک طویل افسانہ ہے عرب ممالک کے رہن سہن پر ہے اور وہاں کی عورتوں کی حالت پر گہرے اور تیکھے طنز کیے ہیں موضوع وہی مشرق و مغرب کی اقداری کشمکش ہے جن کے دو پاٹوں میں فرد کی زندگی پس کر رہ جاتی ہے۔

وارنیکا ایک ایسی لڑکی ہے جو پلی بڑھی تو کناڈا میں مگر خدمت خلق کے جذبے سے نرس کی حیثیت سے عرب آجاتی ہے مگر یہاں کی تنہائی سے اکتا جاتی ہے کیونکہ باہر کی زندگی میں عورتوں پر بڑی سخت پابندیاں ہیں۔ وہ آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتی ہیں یہاں تک کہ بازار بھی نہیں جا سکتی ہیں۔ وہ خدمت خلق کا کام پابندیوں کی وجہ سے پورا نہیں کر پاتی اور تنگ آ کر واپس

اپنے ملک چلی جاتی ہے۔

موضوع نیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا مصنف خالد سہیل خود اس ناولٹ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"میرا اس کہانی کو لکھنے کا مقصد کسی کے مذہبی یا روحانی جذبات کو مجروح کرنا نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ماحول اور معاشرہ یہاں لاکھوں انسان، انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کی روشنی حاصل کرنے جاتے ہیں۔ ان شہروں کی گلیوں اور بازاروں میں آج بھی انسان ظلم کے اندھیروں میں زندگی گزار رہے ہیں:"

یہ حقیقت ہے کہ عرب ممالک کے موضوع پر اردو ادب میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جب کسی مصنف نے قلم اٹھایا بھی ہے تو جذباتیت سے مغلوب ہو کر قصیدہ خوانی پر اتر آیا ہے۔ وہاں کے انسانی حقوق کی بات کسی نے نہیں کہی ہے۔ وہاں کی عورتوں کے مسائل پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اس موضوع پر خالد سہیل کا یہ چھوٹا سا ناولٹ ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔

کہانی کو پیش کرنے کا انداز دوسرے طویل افسانوں کے مقابلے میں مختلف ہے۔ ایک کردار داز نیکا کے سہارے بہت سے چھوٹے چھوٹے کردار تراشے ہیں جو قاری کے ذہن پر ایک غیر فانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

اس ناولٹ "مقدس جیل" میں سماج اور عورتوں کی بہبود کا مذہب ہے، دوستی کی رفاقت ہے، انسانی دوستی کا گہرا رنگ ہے، ایثار ہے غرض ناولٹ بہت دل چسپ اور موضوع کے اعتبار سے بہت نرالا ہے۔

(تبصرہ نگار: ہارون ایوب)

صبح کا ستارہ (مجموعہ کلام) ——————— احتشام اختر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی ۲ صفحات ۱۰۳ قیمت

شروع کی غزلوں میں گو ردیف غزلوں پر غالب آگئی ہیں لیکن دھیرے دھیرے یہ مجبوری دور ہوئی ہے اور احتشام اختر کی غزلوں میں لہجے کی طرفہ نے جگہ پائی ہے۔ ؎

مجھے مٹانے کی کوشش فضول ہے یارو
میں مثل موج صدا ہوں مجھے زوال کہاں

اور اس لازوال آواز کی لہروں میں ایسے شعر بھی ہیں۔ ؎

پیسے والے نیند سے محروم ہیں — جھونپڑی میں سو رہے ہیں آدمی
رات کو چلنا مجھے مشکل ہوا — راستے میں سو رہے ہیں آدمی

دل میں رہتے ہیں تصور کانٹوں کی طرح — جسم تھا جن کا گلابوں کی طرح

احتشام اختر جدیدیت سے وابستہ ہیں لیکن دیباچے میں انھوں نے شاعری میں سماجی اور سیاسی شعور کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور یہ اعتراف محض لفاظی نہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار اس حیثیت اور اس سیاسی اور سماجی دردمندی کے گواہ ہیں اور سچ بھی تو ہے کہ ؎

اڑنا یہ ڈال ڈال پہ اچھا تو ہے مگر
پرواز کا مزہ تو میاں آسماں میں تھا

احتشام اختر اپنی غزلوں میں نغمگی اور دردمندی کے آمیزے سے کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اسی لیے ان کی بعض غزلوں میں قافیہ ردیف اور زمینوں کی بھی ندرت ہے اور لہجے اور لحن کی بھی ؎

دل کے اوراق پہ لکھتا رہا برسوں جن کو
وہی افسانہ ہواؤں میں اڑاؤں گا میں آج

خاص طور پر ہندی کے عام فہم اور شیریں الفاظ نے غزل کو سجا تا ان
کیا ہے۔ ؎

تمہیں ارپت یہ میرے شعر یری کلپنا کے ہیں
کہ جیسے آرتی میں پھول یہ آرادھنا کے ہیں

سادہ انداز بیان اور بے ساختگی کے ساتھ نظم ہونے والے مضامین نے
ان کی بعض غزلوں کو دلکش اور وجد آفریں بنا لیا ہے۔ مثلاً ؎

گگن پر دل کے جو چھایا بہت ہے
اسی بادل نے ترسایا بہت ہے

۱۰۴ صفحات کے اس مجموعے میں جگہ جگہ ایسے دلنشیں اشعار دامن دل
کھینچتے ہیں اور احتشام اختر کے شعری سفر سے توقعات وابستہ کرنے کی دعوت
دیتے ہیں۔ (م۔ ح)

"اردو ان ٹو ویکس" (URDU IN TWO WEEKS)

مصنف: ڈاکٹر نصیر احمد خاں

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷ صفحات ۱۱۲ قیمت: ۵/-

انگریزی میں اردو کی یہ نئے طرز کی کتاب ہے جس میں انگریزی حروف
کے ذریعے ۲۱ اکائیوں میں اردو کے حروف، ان کی آوازیں اور ان کے املا
اور ان کو ملا کر لکھنے کے ضابطے سکھائے گئے ہیں لکھنے کی مشق کے لیے ۔
صفحات مخصوص کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب گو صرف ایسے ہندی داں حضرات ۔
لیے ہے جو انگریزی جانتے ہوں مگر دوسروں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی
اردو سکھانے کا یہ حیات اللہ انصاری کے "دس دن میں اردو" کے بعد سب
سے کم وقت میں اردو سکھانے والا قاعدہ ہے اور اپنے سائنٹیفک طریق کار
اور لسانیاتی شعور کے اعتبار سے قابل تعریف ہے۔

(م۔ ح)

• فکرِ اقبال کی سرگزشت • ———— از: ڈاکٹر عبدالحق (دہلی یونیورسٹی)
ناشر: رحمان منزل، بلوا گھاٹ۔ جون پور (یوپی) صفحات ۱۶۹ قیمت ۲/

عبدالحق صاحب ماہر اقبال کی حیثیت سے اب معروف ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے میں اقبال پر ان کے دس مقالے شامل ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری مقالہ یعنی اقبال کا شعری آہنگ' اور' فکرِ اقبال کی سرگزشت' کو محل سرسبد کی حیثیت حاصل ہے۔

اقبال کے آہنگ کی تشکیل کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق نے فلسفیانہ جہت، جوش و خروش، نغمگی، تکرارِ صوت، مترنم اور غیر انفی آوازوں کے ساتھ خوش آہنگ قافیوں اور ردیفوں کے استعمال، اجزِ خوانی اور سیال صفت ہونے کو بڑی اہمیت دی ہے لیکن اس کی نشان دہی بھی شاید ضروری تھی کہ یہ اقبال کی پوری شاعری کے سبھی ادوار پر محیط نہیں۔ مختلف ادوار میں ان خصوصیات میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے ہاں فکر و اسلوب دونوں سطح پر شاعر اور ملا کی کشمکش مبلغ اور فن کار کی کشمکش جاری رہی ہے اور اس نے ان کے آہنگ کو بھی متاثر کیا ہے۔

فکری سرگزشت میں جو بات سب سے زیادہ متاثر کن ہے بحیثیت انسان اقبال کی زندگی کے حوادث کا تطابق ان کے فکری اور فنی ارتقا سے (ص ۲۸/۲۹) اس پہلو میں ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے نظر یات کے ردو قبول میں اقبال کی ذاتی (اور سماجی) زندگی کے محرکات کا مطالعہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

اسی مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے ڈاکٹر عبدالحق نے مجموعے کے آخری مضمون میں اٹھایا ہے اور بغیر لگی لپٹی رکھے صاف لفظوں میں منظفر برنی صاحب کی علی الرغم کہہ دیا ہے کہ وطن دوستی فکرِ اقبال کی ابتدا ہے انتہا نہیں (۱۳۵) گو وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ "(اقبال کے نزدیک) ہندستان کو غلامی سے نجات دلانے کا ایک فکری راستہ یہ بھی تھا کہ عالم اسلام کو بیدار کیا جائے اور اس کی طاقت کو یہاں کی جابرانہ حکومت کے خلاف استعمال کیا جائے" ص ۱۳۹

غرض اس مجموعے میں اقبال کے شعری، مذہبی اور سیاسی جہات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اقبال کے شارحین پر اور مترجم اقبال پر جا بزبانی اور تحریاتی مضامین بھی شامل ہیں۔

البتہ مصنف نے اقبال سے ذرا آگے بڑھ کر ان پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی ہے اور اقبال کے کمزور گوشوں سے خود اقبال کے لفظوں میں آسان گزر گئے ہیں ضرورت یہ بھی ہے کہ اقبال کی فروگذاشتوں کی نشان دہی بھی کی جائے تاکہ اقبال پرستی کی جگہ صحت مند اور معروضی اقبال شناسی عام ہو۔

رسالہ "شاعر" اقبال نمبر بمبئی (جلد اول) ـــــ مرتب: افتخار امام

صفحات: ۶۳۹ ۱۹۸۸ء قیمت: -/۵۰

اقبال پر اتنا کچھ لکھا اور چھاپا جا چکا ہے کہ اس موضوع پر کچھ نئی بات کہنا دشوار ہے مگر آفریں صد آفریں افتخار امام کو کہ انھوں نے بالکل نئے انداز کا "اقبال نمبر" مرتب کیا مضامین تو اس میں بھی ہیں مگر زاویہ نظر کی تازگی ہر مضمون میں موجود ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقبال پر چار نایاب کتابیں اور بعض نایاب خطوط اور مضامین اس نمبر میں چھاپے گئے ہیں۔ مظلوم اقبال اور قادیانیت کے بارے میں اقبال کے بدلتے ہوئے رویوں کی داستان پہلی بار "شاعر" کے "اقبال نمبر" میں مبسوط انداز سے ہندوستان پہنچی ہے۔ محمد امین زبیری کی خدوخال اقبال بھی نئی معلومات فراہم کرتی ہے۔ غرض "شاعر" کا "اقبال نمبر" میں ایسی متعدد روشنیں لیے ہوئے ہے جن کی بدولت اقبال شناسی اس نمبر کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔

رسالہ "فن اور شخصیت" بمبئی گنیش بہاری طرز نمبر ـــــ مرتب: صابر دت

قیمت: -/۱۰

صابر دت جب کبھی فن اور شخصیت کا خصوصی نمبر شائع کرتے ہیں وہ ادبی دنیا کا اہم واقعہ ہوتا ہے۔ اس بار انھوں نے ایک ایسے شاعر کو خاص نمبر کے لیے چنا

جس کا مجموعۂ کلام ابھی شائع نہیں ہوا اور گنیش بہاری طرز کے منتخب کلام ادارہ
پر منتخب مضامین شائع کر کے حق ادا کر دیا

"عام سار و عمل" (مجموعۂ کلام) ________ شارق کیفی
ناشر: ۱۳۲، گلڑھی راؤ بہادر سنگھ۔ بریلی صفحات ۱۳۳ قیمت: ۵/-
۱۹۷۸ء سے اب تک کی غزلوں کا یہ انتخاب مزے دار اور لطیف اشعار سے
خالی نہیں۔ غزلوں میں بعض جگہ ردیفوں نے مزے میں اضافہ کر دیا ہے جیسے

روز کا اک مشغلہ کچھ دیر کا اس گلی کا راستہ کچھ دیر کا
پھر مجھے دنیا میں شامل کر گیا خود سے میرا واسطہ کچھ دیر کا

بعض جگہ غزل میں نئے زاویے بھی اُبھرے ہیں۔

حقیقتوں کو جاننے کی کوششیں فضول ہیں
حقیقتیں یہی نہیں رہیں گی انکشاف تک

کہیں امیجری اور فضا نے غزل کو نیا لہجہ دے دیا ہے۔

غلط بیان دلا تو دیے تھے اشکوں سے
مگر یہ لوٹنے والے گواہ کس کے ہوئے

شارق کی غزلوں میں رسیلا پن اور انوکھا پن موجود ہے۔ احساس اور پیرایۂ
بیان دونوں کی تازگی ہے اور ان کی غزلوں سے نئی کیفیات کی توقع کی جا سکتی
ہے بشرطیکہ انھیں تقلید کے بھیڑیے نہ اٹھا لے جائیں۔ چلتے چلتے بعض مزے کے
شعر سنتے چلیے: تمام شہر نہ جینے میں ہے نہ مرنے میں
یہ اس طرح کے ادھورے گناہ کس کے لیے

کھڑے تھے دیر سے بس یوں کہ تیرے شہر کا نام
کہیں لکھا تھا جسے بار بار پڑھتے رہے

شارق کی شاعری سے اردو غزل کو امیدیں وابستہ ہیں۔
تبصرہ نگار: م۔ ح

"شاخِ مرجان" (مجموعہ کلام) ———————— وارث کرمانی

زیادہ تر نظموں کے تین حصے ہیں: تشبیہ، تمہید، گریز اور زیادہ تر مختصر تقابلیہ جو کبھی کبھی رجو نکا دیتا ہے۔ لیکن "نیا آدمی" "اکتوبر کا مہینہ" "ایک تین سال کی بچی" دوسرے انداز کی ہیں۔ تصورات پہ ماضی پرستی اور زندگی کی شکست و ریخت کا تاثر غالب ہے۔ مگر عصری آگاہی اور انسانیت دوستی کی رو بھی جگہ جگہ نمایاں ہو جاتی ہے (نیا آدمی، درد آشنا نگاہیں)

"شاخِ مرجان" کی نصف درجن نظموں میں یادِ ماضی اور تخیل کی ملاوٹ سے ایک خوابوں کا جہاں تعمیر ہوتا ہے اور پھر وقت کے بکھرے ہوئے طوفانوں کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں "ندیمِ تنہائی" کا امتیاز یہ ہے کہ شاعر صرف منصوبے بناتا ہے جہانِ تصور کے تانے بانے جوڑنے کے، اور اس میں اس کی نِدا کے ساتھ رنگ بھرنے لگتا ہے

ع اے صبا، اے ندیمِ تنہائی!

"خادمہ" میں نفسیاتی پہلو ہیں اور خود احتسابی ہے اُس برہنہ ذہن کی جسے زُہد کی چادر ہی لباس عطا کرتی ہے۔

بیان کے پیرائے کلاسیکی ہیں۔ ع "ہونٹوں پہ ہنسی، رخ پہ حیا یاد رہے گی۔ ع "شہر میں پھر نہ ہیں مہماں آج کل" جیسی مسلسل غزلیں سماں باندھ دیتی ہیں۔
تبصرہ نگار: سعید الظفر حقانی

"جینے کی ادا کا شاعر" ———————— منظر شہاب

منظر شہاب کے وجود کا کوئی لازمی حصہ ان کی ذات سے ٹوٹ کر جدا ہو گیا ہے۔ مگر جدا ہونے کی یادوں کے دائرے میں گردش کرتا رہتا ہے۔ پانے اور کھونے کی اسی لذت اور اذیت سے منظر شہاب کی شاعری کا منظر نامہ ابھرتا ہے۔ مگر اس ٹوٹے ہوئے رشتے

کو گرفت میں لینا اس لیے دشوار ہے کہ ساحری یوں بھی تحریک ہے ... ایک چاہت کئی محبوب میں بٹ جاتی ہے۔ اور یوں بھی منظر شہاب "زندگی اور ادب کو معلوم سے نامعلوم کے دو طرفہ اثباتی اور منفی سفر" کا عمل سمجھتے ہیں اور زندگی ہی کی طرح ادب کو بھی کسی مخصوص رنگ میں مقید نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک دھنک رنگ کیفیت ابھرتی ہے۔

بنیادی طور پر ان کے شعری کردار کی تعمیر رومانی عناصر سے ہوئی ہے۔ مگر انھیں وہ ذہن بھی نصیب ہے جو علل کو معلول سے جدا کر کے دیکھنے کا عادی نہیں ہے انھوں نے زندگی کو "اختلافِ معانی شے کے حوالے سے سمجھا ہے اور فن کار کو حرف کی جادوگری اور آہنگ کی عشوہ طرازی کا رمز شناس ہونا" لازمی مانا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کا یہ بھی یقین ہے کہ "ایسے موضوعات جو سماجی ارتقا میں مارج ہوں تخلیقی ادب کی سطح کو پست کر دیتے ہیں" یہی وجہ ہے کہ منظر شہاب نے کبھی "ذات کے محبس اور انانیت کی قبر کو جائے عافیت نہیں سمجھا۔ وہ سرخ پھولوں کی چاہت میں زرد پتوں کی طرح بکھر کر بھی اپنی انگنائی میں تلسی کا ایک ننھا سا پودا لگانے کی تمنا کرتے ہیں اور تیغِ ستم سے حنا حنا ہو کر بھی درد کا لمحہ زرنگار کر سکتے ہیں۔ ان کی آنکھیں درد کی شاخوں میں بھی پھولوں کے چراغ دیکھتی ہیں۔ شاید اسی لیے منظر شہاب اس وقت بھی ذات اور کائنات سے وابستہ رہے جب کہ ان کے اکثر ہمعصر نے جدیدیت کی چکاچوند میں اپنے چہرے بدل لیے۔ یہ حقیقت اپنے آپ میں کچھ کم دلنواز نہیں کہ زندگی کو جیل تر بنانے کے خواب ان کی آنکھیں کبھی نہیں بھولیں اور یہ خواب کبھی معشوقِ ستم شعار اور کبھی حسنِ بہار کی صورت ان کے دل میں پرورش پاتے رہے۔

"پیراہنِ جاں" منظر شہاب کے بیالیس سالہ ذہنی سفر اور شعری تجربات کا حاصل ہے جس میں کل ۴۳ نظمیں، ۴۴ غزلیں، ۲ گیت، ۳ آزاد قطعات اور کچھ رباعیات ہیں۔ ظاہر ہے اتنی طویل مدت کے پیشِ نظر یہ سرمایہ کچھ زیادہ ...

قیں۔ اسنے عرصے میں تو ان کے بعض ہم عصروں نے کوئی نصف درجن مجموعے شائع کرلئے ہیں۔ گویا منظر شہاب کو کارزمانے نے بیانِ شوق کا موقع بہت ہی کم دیا۔

منظر شہاب کو پیکر تراشی اور فضا آفرینی سے ایک فطری لگاؤ سا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نظم "چاندنی رات" بھی ایک خوبصورت مثال ہے۔ اس میں بھی ایک دلکش طلسماتی رات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ رات کا عالم ہے، ہر طرف سیلِ نور جاری ہے، کائنات جیسے کنول میں سمایا ہوا ساگر ہے۔ دور نیل گگن میں چاندنی کی کشتی بہشت کا مانجھی کھے رہا ہے، کہیں کہیں روئی کے گالوں کی طرح شفاف ابر کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے ہیں، جھومتی گاتی زمزمے سناتی دھرتی کی گود میں کھٹولے پر ایک معصوم چاند کا ٹکڑا سو رہا ہے، پاس ہی ماں اپنا سمٹا سمٹا وجود لیے لیٹی ہے جس کا آنچل اوس میں بھیگا ہے اور نینوں میں کاجل پھیلا ہے۔ ماں کے اس تقدسِ حسن اور بچے کی معصومیت نے حسنِ کائنات میں رفعت اور ربودگی پیدا کر دی ہے۔ ایسے میں کوئی شخص اگر کوئی آرزو کر سکتا ہے تو یہی کہ ؎

گردشِ وقت کاش تھم جاتی صبح ہوتی نہ کوئی شام آتی

عشقیہ جذبات کی حامل نظموں میں "مشورہ" "لہجے کی شوخی" برجستگی اور چھچھورپن کی عمدہ مثال ہے۔ زیریں لہروں میں ایک گہری اذیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ شاعر نے اپنی محرومی کو چھپانے کے لیے شاید شوخ لہجہ اختیار کر لیا ہے ؎

تم بھی گستاخ اداؤں کو سکھاؤ تہذیب
شوخ جذبات کو سنجیدہ بنالوں میں بھی
معتدل تم بھی بناؤ بت کافر کا مزاج
عقل کی راہ، محبت کو دکھاؤں میں بھی

"[illegible] جاں" کا پہلا حصہ نظموں کا ہے۔ پھر رباعیات، آزاد قطعات

اور ۲ گیت ہیں، سب سے آخر میں غزلیں ہیں۔ ان کی غزلیں جو ۱۹۶۹ء تا ۱۹۶۰ء تک کے عرصے پر محیط ہیں، دانشوری کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں اقبال کی آواز بھی چمک اٹھتی ہے۔ ؎

وہ سفید خواجگی تھی، یہ سیاہ خواجگی ہے وہ طریقِ گمرہی تھا، یہ طریقِ رہزنی ہے
نہ محبتوں کا حاصل، نہ صلہ ہے محنتوں کا کہ متاعِ کوہکن پر روشِ جبرِ خسروی ہے
ضمیرِ عشق میں میری نوا سے گرمیِ شوق بلا کشانِ محبت کی آبرو ہوں میں
مرے جنوں نے سکھائی ہے بےخودی سب کو بلا سے رند نہیں غیرتِ سبو ہوں میں

یہ اقبالیت فکر کی کم، اسلوب کی زیادہ ہے۔ لیکن جب کبھی منظر شہاب دانشوری کے آسمان سے اُتر کر وادیٔ دل میں آتے ہیں تو ان کی غزلوں میں کہیں جذبات کی شوخی اور شدت، اور کہیں درد اور المناکی کی کسک پیدا ہو جاتی ہے۔ ؎

جانے کیوں آج بھی ویرانۂ دل تک آ کر اکثر آواز ترا دیدۂ تر دیتا ہے
لذتِ زخم مجھے موت سے برگشتہ کر کر پھر کوئی دعوتِ پیکان نظر دیتا ہے
فریب کار سہی دل کا غم گسار تو تھا وہ اک خیال جو برسوں رہا گماں کی طرح
درد مندی بھی ہو گئی رسوا جبر کا کیا گلا کرے کوئی
خود ہی رونا ہے، خود ہی چپ ہونا درد کب ساتھیوں نے بانٹا ہے

منظر شہاب لفظوں کے رمز شناس ہیں۔ ان کے یہاں خنجر، لہو، رہگذر، رات، راگنی، شجر، جنگل، آواز کی تصویر، دھوپ، خواب، پہاڑ، آگ، بگولا، وغیرہ کبھی زندہ پیکر، کبھی بامعنی نشانات بن کر اُبھرتے ہیں۔ ؎

سرورِ صبح تلک بارشیں ہوئی ہوں گی اداس آنکھ کا آنگن دُھلا دُھلا سا ہے
قاتل نے پھر لکھا ہے خنجر پہ نام میرا جو دوستی تو ربط باہم نہیں رہا
سراغِ قتل، شہادت، ثبوت سب گم تھے لہو خموش تھا، خنجر بھی بے زباں نکلا

اب تک یہ سنا اور مانا جا رہا تھا کہ "جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا" مگر نو دولتیوں کے اس عہد نے وہ قانون جنم دیا ہے کہ زبانِ خنجر کی طرح لہو بھی گنگ ہو کر رہ گیا۔

ہے۔ مگر شعر و شباب اس پر یقین رکھتے ہیں کہ زمین چاہے ہی آسمان کی طرح ظالم و ستم ظریفی اختیار کر لے۔ غم تسلسل بلائے جان بن جائے اور حالات کی آندھیاں تیز تر ہو جائیں لیکن جینے کی ادا سلامت رہنی چاہیے۔ ؎

پیراہنِ جاں چاک رہے، تیز ہوا میں
طوفان میں جینے کی ادا چاہیے یارو

تبصرہ نگار: سید احمد تسیم

عبدالرحیم خانخاناں ———————— شیخ سلیم احمد

ناشر: خسرو کتاب گھر۔ ۱۵ بستی نظام الدین، نئی دہلی ۱۳ ۱۹۹۰ء صفحات ۱۸۲ قیمت ۱۰/-

عبدالرحیم خانخاناں کی شخصیت کئی حیثیتوں سے نہایت ممتاز ہے۔ وہ بہا امیر جس کی تعریف میں اتنی زبانوں کے اتنے معروف شاعروں نے نظمیں کہیں اور قصیدے لکھے اور ان شاعروں میں عرفی جیسا شاعر بھی تھا جو بادشاہان وقت کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ شیخ سلیم احمد نے اس بھولے بسرے امیرزادے، فوجی جنرل، وزیر، علم دوست، ادب اور ادب نواز شاعر کو پھر سے زندہ کر دیا ہے اور ۱۸۲ صفحات میں اس کی شخصیت اور کارناموں کا تعارف پیش کر دیا ہے۔ اس سے شاید اندازہ ہو کہ خانخاناں کو بھلا کر ہندستانی تہذیب نے اپنی دھنک کا ایک بیش قیمت رنگ ضائع کر رکھا ہے۔ ان کی کوشش قابل داد ہے البتہ برشا کو ہندی کہہ کر صفحہ پر زیادتی کی ہے یہی زیادتی ص۱۲۰ اور ص۱۵۹ پر بھی ہوئی ہے اور اسے "ہندوی" کہا گیا ہے۔ جنگوں اور معرکوں سے زیادہ سروری وہ نظریاتی کشاکش تھی جو ابوالفضل اور فیضی کی روشن خیالی اور ملا بدایونی اور دوسرے رجعت پسند اور کٹر مذہبی عناصر کے درمیان جاری تھی جس کا عکس ص۴۳ پر ہے۔

یہ کتاب شیخ سلیم احمد بڑے سلیقے سے لکھی ہے۔ خانخاناں کی شخصیت کے سبھی پہلو [illegible] میں اور ان کے دور کے سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آئے ہیں [illegible] شستہ اور رواں ہے اور کتاب میں ناول کی سی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے

قیمت کچھ زیادہ لگتی ہے مگر ان دنوں انسان کی جان کے علاوہ اور کون سی شے سستی ہے کہ خون جگر سے لکھی ہوئی کتاب ہی کی گرانی کا شکوہ کیا جائے

(م ۔ ح)

۱۔ تحرک :۔ شاعر شاہد کلیم کے ۱۳۲ صفحات پر پھیلے ہوئے آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو حق شناس پبلی کیشنز سنگر لولی، پٹنہ ۴ سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ قیمت تیس روپے بعض مضامین خیال انگیز ہیں گو جدیدیت کے اثرات نمایاں ہیں۔ گو نئی نظم کا قاری کا یہ مرکزی استدلال محض اردو قاری پر یہ الزام کردہ سہل پسند اور تن آسان ہے نظم کی ناکامی کا عیب سا جواز لگتا ہے۔

۲۔ "موسم موسم روپ"۔ شاہد کلیم کا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۹۰ء میں محلہ دودھ کشورہ آرہ سے شائع ہوا۔ ناشر ہیں ثروت پبلی کیشنز، پھلواری کوٹھی۔ دریا پور، پٹنہ ۴ صفحات ۱۲۸، قیمت ۴۰/- بیس نظمیں ہیں باقی غزلیں۔ جدید شاعروں کے اکثر مجموعہائے کلام کی طرح یہ بھی حمد سے شروع ہوتا ہے۔ شاعری شادابی اور تازگی سے خالی نہیں ہے۔ نظموں میں قنوطیت اور گہری اداسی کے بجائے امید اور حوصلے کی جھلکیاں ہیں خاص طور پر سرحد دشت پر، ریگتی پرچھائیاں اور عجیب لوگ اور اس کا یہ مصرعہ بھی۔

عجیب لوگ تھے وہاں
دعائیں مانگتے تھے آفتاب کے زوال کی

قابل توجہ ہیں۔ غزلوں میں کہیں عصر حاضر کے شاعروں کی طرح میں گونج اٹھتی ہیں۔ پھر بھی شاہد کلیم کی شاعری محض تکرار اور تقلید نہیں ہے۔ دو شعر ان غزلوں کی دردمندی کے ثبوت ہیں ؎

سناٹے سے پوچھیں شاید سناٹا ہی بولے
شہر کا اک اک شخص ہوا ہے پتھر کیسے کیسے

سلگتی ریت پر سبزہ اُگا دیا میں نے   کہیں تو خون کی برسات معتبر ٹھہری

شو گھرواپس ہوگئے (ڈرامے)۔ کمال احمد کے دو ڈرامے گھرواپس اور پیاسا سمندر ۱۳۵ صفحے کے مجموعہ میں شامل ہیں۔ ناشر ہیں شاداب کتاب گھر ڈی ۱۸/۲۲۷ سر سید احمد روڈ کلکتہ ۱۴۔ قیمت ۱۶/- سال اشاعت ۱۹۸۸ء دونوں ڈرامے بار بار اسٹیج ہو چکے ہیں۔ ڈرامے آج کی حقیقتوں پر طنز ہیں اور ان سے متاثر ہونے والے مختلف طبقوں کے لوگوں کی سرگزشت پیش کرتے ہیں۔ مکالمے مختصر، بلیغ اور موثر ہیں کہیں کہیں فلمی انداز زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ دوسرا ڈراما تمثیلی ہے اور ایک ایسے ملک کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں فرقہ وارانہ نفرت، لوٹ مار اور پیسے کے لالچ انسانوں پر غلبہ پا لیا ہے اور لیکیا تری وہاں یہ سب برائیاں پھیلاتا ہے اور انھیں تہذیب کا نام دیتا ہے۔ ڈراما موثر اور مختصر ہے۔

۴۔ شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ۔ مصنف: ڈاکٹر شیخ عبدالرحیم انصاری (ڈنڈیلہ کلاں، ڈاکخانہ رہلہ ضلع پلاموں ۸۲۲۱۲۴) ۱۹۹۰ء صفحات ۲۳۲

قیمت: ساٹھ روپے

محنت سے لکھی ہوئی کتاب ہے جس میں مذہبی، علمی، ادبی، تعلیمی اور فلسفیانہ مقالات کا جائزہ معدی لیا گیا ہے۔ آخر میں شبلی کے اسلوب پر ایک باب ہے اور شروع میں احوال و آثار پر۔ تنقیدی مقالات میں شبلی کے خیالات کا تجزیہ نہایت اہم ہے اور مصنف نے اس جائزے میں دیانت دارانہ معروضیت قائم رکھی ہے۔ اس کا ایک ضمنی مگر اہم فائدہ یہ ہے کہ شبلی کے زمانے میں جو اہم موضوعات اور تصورات توجہ طلب تھے ان سب کا احاطہ ہو گیا ہے اور شبلی اور ان کے معاصرین کے رویے اس باب میں واضح ہو گئے ہیں۔

● عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر ——————— ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

۱۹۹۰ء، ناشر مصنف (کوہسار، بارہ پور، بھاگلپور) صفحات ۱۱۲ قیمت ۳۶/-

شرر پر ادھر کئی کتابیں چھپی ہیں مگر مناظر عاشق ہرگانوی نے ناول نگاری اور نثر کی تنقید سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے اور ان کی شاعری پر مدلل اور تفصیلی بحث کی ہے اس موضوع کی نئی اہمیت سے ان کی اہمیت ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے اس نئے موضوع پر

لیے میلنے سے لکھا ہے۔ شہر کی معری نظموں کے علاوہ مثنوی [illegible]
ڈرامے طور پر بحث خیال انگیز ہے۔ (صفحہ ۱۳۴)

۶۔ متاعِ آخرِ شب (مجموعہ کلام) ________________ محسن زیدی

ترتیب: محمود سعدی، طابع نرائن راز، ۱۹۹۰، صفحات ۲۴۰، قیمت ۲۰/-

کلاسیکی مزاج کی پھبن کے ساتھ سادہ اور دل نشین پیرائے کی غزلیں اس مجموعے کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان میں احساس کی طرفگی بھی ہے اور ردیف قافیے اور دل کش اور کیف آگیں بحروں کی سحر آفریں کھنک اور گونج بھی ہے جو پڑھنے والے پر دیر تک چھائی رہتی ہے۔ خوبی اس شاعری کی یہ بھی ہے کہ کرتب بازی اور رواج زدگی سے خالی ہے۔ سیدھی سادی باتیں ہیں، دل سے نکلتی ہیں، دل میں بیٹھتی ہیں۔ اونچی اڑان یہاں نہیں ہے، ہاں شناسا کیفیتوں کی دل آسائی ہے اور اسی میں محسن زیدی نے اپنے شاعرانہ تیور پیدا کیے ہیں۔ مثال کے لیے چند شعر کافی ہیں گو بعض غزلیں ایسی مرصع ہیں کہ ان میں سے کسی شعر کا انتخاب دشوار ہے۔ (مثلاً ہر چند یہ حق میں مرے اچھا نہیں ہوگا والی غزل) بہرحال چند شعر جن کی جھنکار دیر تک گونجتی ہے :

محسن زمانہ میرا مخالف تو تھا مگر — میرا بھی تھا قصور میں سرکش ہی ایسا تھا

ہمیں جتنی ہے ان کی اب خبر پہلے نہ ہوتی تھی
وہ ہم سے اب ہیں جتنے بے خبر ایسے نہ ہوتے تھے

چلے آتے تھے طائر لوٹ کر اپنے بسیروں میں
نکل کر گھونسلوں سے دربدر ایسے نہ ہوتے تھے

تم ساتھ ہوا کرتے ہو ہنگامِ سخن بھی — ہم شعر بھی کہتے ہیں تو تنہا نہیں [illegible]

گیسۂ زر سے سبھی بولتے منہ بند ہوئے
اب کسی منہ سے بھی حق بات نکلنے سے رہی

سوچنا اور اداس ہو جانا — حال ہے دل کا آج [illegible]

[illegible] اٹھا لو اب بھی جو ادراق مل جائیں — جلدی کرو [illegible]

۷۔ گھر جانے سے پہلے (ادبی و تنقیدی مضامین) ______ سید خورشید عالم
ناشر مکتبہ دانیال کراچی ۱۹۹۰ء صفحات ۱۵۲ قیمت ۶۵/-

سید خورشید عالم کشتی کے رو ڑے ہیں کناڈا میں ایک مدت سے مقیم ہیں لیکن ذہن کے دریچے کھلے رکھتے ہیں اور اردو کے قدیم اور جدید ادب سے گہری وابستگی ہے ان کے آٹھ مضامین کا یہ مجموعہ ان مباحث سے عبارت ہے جو دورِ حاضر کی چٹ پٹے اور سرسری تنقیدی مضامین لکھنے والوں کے لیے اجنبی ہیں۔ تہذیب، جمالیات، مذہب اور حقیقت، جبر آمریت اور آزادیٔ اظہار کے ادبی رشتے، ان کی توجہ کا خاص مرکز ہیں۔ ان سبھی مباحث میں سید خورشید عالم نے ایک متوازن مارکسی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہے اور مختلف مسائل کی جدلیاتی اور طبقہ واری نوعیتوں کو واضح کیا ہے۔

دو مضامین البتہ سوانحی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ وات کی بات میری جان اور بلادِ کے قبرستان پہنچتے ہیں، دونوں میں ہندستانی مہاجر کی سرگزشت بیان ہوئی ہے مگر تناظر محض پاکستان اور ہندستان کا نہیں بلکہ دور قدیم تک پہنچتا ہے اور عالمی تاریخ پر چھا جاتا ہے۔ لیکن اس تنوع کے باوجود ہر مضمون اور مقالے میں گہری وابستگی کے نشانات ملتے ہیں جو اپنے زمانے کو اور اس کے پیدا کردہ ادب کو اس کے سبھی متعلقات کے ساتھ سمجھنا چاہتی ہے۔

۸۔ زندگی کا رقص (افسانے) ______ م م راجندر
۱۹۸۵ء صفحات ۳۲۲ قیمت ۴۵/-

"زندگی کا رقص کے افسانے پڑھتے وقت عجیب تازگی کا احساس ہوا ایسی تازگی جو مدتوں سے اردو افسانے سے غائب ہو چکی ہے آج کل کے اکثر افسانے کو پڑھتے وقت دماغ پر ایسا بوجھ اور اعصاب پر ایسا تناؤ ہوتا ہے جیسے ہڈیاں چٹخ رہی ہوں مگر زندگی کا رقص کے افسانے سچ مچ نشاط کار ہیں۔ یہ لذت اردو افسانے سے جانے کہاں اور کیوں رخصت ہو گئی۔

[illegible] نے اپنے [illegible] کہ م م راجندر اتنے اچھے قصہ گو اور ایسے منجھے ہوئے

افسانہ ظاہر ہونے کے باوجود کیوں ممتاز رشید احمد کی تشبیہ مجموعے پہلے افسانے اول میں جگہ دی ہے۔ جواب مکار وعیان کی ٹائپس اور نوعیس کی وضاحت کی ان کے قلم کو تازہ دیکھنے دیا اور ان کے مشاہدے اور فکر کو محروم کر دیا۔

بہرحال ان کہانیوں میں انسانی رشتوں کا بڑی لطافتوں، نزاکتوں اور خلوص کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ 'ایک بار ایک جیت' میں جذبے تکلف دوست ایک مجذوب سے جوئے میں جیتتے والا ممبر بار جیتنے کی سعی کرتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں مگر اس شکست کے اوراق کیسی یگانگت اور بے تکلفی کے رشتے ابھرتے ہیں اور کہانی پڑھنے والے سرشار کر جاتے ہیں۔ اسی طرح تین چہرے تین تاثر کہانی میں تہذیبی فضا کا اکھلا پن دل موہ لینے والا ہے کہ یہ کہانی مشرقی ہندوستان کے آخری لمحات سے گی۔ بلی اور لاڈلی بنی جاتیوں کی زندگی کے ارد گرد بُنی گئی ہے۔ شاید مجموعے کی سب سے نئی کہانی "الجھن" ہے جس میں عنفوان شباب میں ایک لڑکی کی نفسیات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ غرض "زندگی کا رقص" دل دوز اور نشاط انگیز کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

۹۔ رنگ ہزاروں خوشبو ایک (مجموعہ کلام) —————— بیکل اتساہی

ناشر: اردو اکادمی۔ دہلی ۱۹۸۹ء صفحات ۱۴۹ قیمت ۲۸/-

بیکل اتساہی شاعروں کے بے حد مقبول شاعروں میں ہیں۔ اس مقبولیت میں ان کے ترنم ہی کو دخل نہیں ہے ان کی لفظیات اور پیرایۂ اظہار کو بھی دخل ہے انھوں نے ہندی اردو ملواں زبان استعمال کر کے اسے اپنے گیتوں میں نئی مٹھاس اور گھلاوٹ عطا کی ہے۔ موضوعات بھی وطن پرستی اور انسان دوستی کے ہیں۔ قومی رہنماؤں پر لکھی نظموں سے قطع نظر ان کی نظمیں اتحاد اور یک جہتی کے سلسلے میں پُر خلوص اور دردمند احساسات کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ محرموں کی پہچان کے قائل نہیں ہیں، ہاں خوشگوار انسانی رشتوں کے خواہشمند ضرور ہیں۔ بھر وطن پرستی کی جو لے ان کے یہاں ملتی ہے وہ شاید اردو شاعری میں اور کہیں اس قدر والہانہ پن کے ساتھ اور کیسی وارفتگی کے ساتھ دیکھنے کی ہر چند وہ وطن دوستی کے زمزمے گاتے ہوئے اہل وطن کی باہمی منافرت

[illegible] کہیں کہیں ذکر تو کر دیا گیا ہے مگر اس کے ذمہ داروں کے چہروں پر نقاب ہی [illegible] رہنے دیئے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو ان نقابوں کی رنگا رنگی کی توصیف بھی کر جاتے ہیں۔ بہر حال گیت کو ایک نئی زبان دینے اور شعری مزاج کو ہندستانیت سے قریب تر کرنے کے لحاظ سے یہ مجموعہ اہم ہے۔

+ ابوالکلام آزاد۔ ایک ہمہ گیر شخصیت ——————— مرتبہ رشید الدین خاں
ناشر ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی ۱۹۸۹ء صفحات ۶۸۴ قیمت ۵۸/-

ابوالکلام آزاد پر مضامین کا یہ مجموعہ چھ عنوانات پر مشتمل ہے :۔ ذہن اور فکر، تفسیر و تفہیم (قرآن)، صحافت اور ادارت، انشا و اسلوب، سیاست اور قیادت، شخصیت اور کردار۔ ہر عنوان کے تحت ۲ سے ۸ تک مقالے شامل ہیں۔ رشید الدین خاں متوازن اور معروضی انداز میں مولانا آزاد کی شخصیت اور خدمات کا جائزہ لیا ہے اور ان کی زیادہ مقبول نہ ہونے کے اسباب اور خود ان کی شخصیت کے تضاد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ دونوں اقتباسات توجہ طلب ہیں۔

> "مولانا آزاد سے ناواقفیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے زمانے اور عہد میں ایسے لوگ کم ہیں جو ان کی اردو کے اسلوب اس کے زور بیان اس کے استعاروں اور الفاظ کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ عام طور پر یہ احساس نہیں ہے کہ ہندستان میں اردو زبان سے اجنبیت ہمارے عہد کا ایک نہایت اندوہناک المیہ ہے جس کے باعث ہم اپنی اور قومی تحریک کی بھی وراثت کے ایک معتبر حصے سے محروم ہو گئے ہیں۔" ص ۳۶

ابوالکلام آزاد کی فکر و عمل کی کاوشوں کی ناکامیابی کی اس سے بڑی دلیل [illegible] کیا ہوگی کہ جو زبان و ادب صدیوں کی ملواں تہذیب کی تخلیق تھا اور جسے آزاد نے [illegible] آزادی کا وسیلہ بنایا آزاد ہندستان میں اجنبی ہو گیا۔

[illegible] بھی قابل [illegible] ہے۔

"پھر مولانا آزاد کی دل آویز شخصیت میں بھی موجود یہ تضاد
موجود تھے۔ ایک طرف یہ کوشش تھی کہ مذہبی استعاروں اور
اصطلاحوں کی مدد سے مسلم عوام کے شعور کو فروغ دیا جائے اور
دوسری طرف ان میں مشترکہ قومیت کا احساس پیدا کیا جائے
جس کا مطلب تھا مسلم فرقہ پرستی، تنگ نظری اور علیحدگی پسندی
کی سیاست کے خلاف جد وجہد" ص ۳۵

دراصل یہی وہ تضاد تھا (بلکہ ہے) جو مولانا آزاد ہی کو نہیں گاندھی اور نہرو سے لے کر آج تک کے قومی رہنماؤں کو درپیش رہا اور اسی بنا پر ہندوستان میں سیکولرازم کا راستہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار ہو گیا ہے۔

اکثر مضامین میں ابوالکلام آزاد کے مذہبی اور سیاسی افکار میں تضاد کا ذکر ملتا ہے اور خاص طور پر مشیر الحق مرحوم اور انور معظم کے مضامین میں اس تضاد کا خیال انگیز تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ظفر احمد نظامی نے بڑی خوبی سے یہی تضاد جنگ آزادی میں آزاد کے مختلف رویوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ تضاد ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ مذہبی، سیاسی اور تہذیبی تشخص اور متحدہ قومیت کے دھارے میں ملنے کا تضاد ہے جو آج بھی ہندوستان میں سیکولرازم کی راہ روکے ہوئے ہے۔ مذہب کو سیاست سے الگ کیے بغیر اس رکاوٹ کو دور کرنا ممکن نہیں اور برِعظیم کے ملک میں بورژوا اور جاگیردارانہ طبقے مذہب کے سیاسی استعمال سے باز رہنے کی وسعت نظر پیدا نہیں کر سکتے۔ آزاد بھی اسی طبقہ واری مجبوری کا شکار ہیں جو تضاد کی طرح ان کے یہاں ابھری ہے خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان کا تعلق ہندوستان کی اقلیتی فرقے سے تھا اکثریتی فرقے سے، ہوتا تو یہی کمزوری قوم پرستی کہلاتی بہرحال یہ مجموعۂ مضامین آزاد شناسی کے سلسلے میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے

موصولات

۱۔ نجیب محفوظ کی کہانیاں	ڈاکٹر عبدالحق۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
۲۔ نجیب محفوظ کی کہانیاں (جائزہ)	ایضاً
۳۔ غزل پارے	شجاع خاور
۴۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم	مرتبہ عتیق اللہ
۵۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	مرتبہ تنویر احمد علوی
۶۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ	مرتبہ قمر رئیس
۷۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل	مرتبہ عنوان چشتی
۸۔ نوراللغات (حصہ اول و دوم)	شائع کردہ ترقی اردو بیورو
۹۔ ادبی تجزیے	صابر سنبھلی
۱۰۔ CONTEMPERORY URDU VERSE	راجندر سنگھ ورما
۱۱۔ MUSLIMS IN INDIA	شائع کردہ وزارت خارجہ حکومت ہند
۱۲۔ ٹوٹا ہوا آدمی	خالد سہیل کے دو ناولٹ
۱۳۔ رات کے آخر ہوتے ہوتے (مجموعہ کلام)	عین تابش
۱۴۔ سیل وجود (مجموعہ کلام)	ساجدہ زیدی
۱۵۔ دھنک احساس کی (مجموعہ کلام)	راج نرائن راز
۱۶۔ اکیلی ایضاً	بلراج کومل
۱۷۔ منظر پس منظر	ڈاکٹر نکہت ریحانہ خاں
۱۸۔ فکر و تحقیق (سہ ماہی)	ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی
۱۹۔ زمین (مجموعہ کلام)	اخترالایمان
۲۰۔ چاندنی بیگم (ناول)	قرۃ العین حیدر
۲۱۔ گردش رنگ چمن	قرۃ العین حیدر

مکتوبات

میں تو آپ کو لکھنے والا ہی تھا۔ عصری ادب کے اس شمارے میں شیخ عبداللہ کی کتاب سے متعلق کمال احمد صدیقی کا طویل تبصرہ دیکھا۔ انھوں نے یہ توضیح لکھا ہے کہ اس کی زبان دیکھنے کا کام میرے سپرد ہوا تھا۔ مضمون سے سروکار نہ تھا۔ میٹنگ کے ذریعے میرے پاس ابواب آتے رہتے تھے اور میں اُن میں حسب ضرورت صحت کر کے واپس کر دیتا تھا۔ کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ اکثر و بیشتر جگہ غلطیاں رہ گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اُس کاپی سے کتابت نہیں ہوئی جو میں نے دیکھی تھی یا پھر کاتب نے غفلت برتی ہے کتاب کی اشاعت میں خاصی تاخیر بھی ہوئی۔ یہ کام ۱۹۸۱ء کے نومبر میں میں نے ختم دیا تھا۔ شیخ صاحب کا انتقال ستمبر ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ یہ کتاب تو ۱۹۸۶ء کے شروع میں شایع ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ کم سے کم ایک باب حذف کیا گیا ہے مثلاً اندرا گاندھی پر بہت تلخ تبصرہ تھا وہ کتاب میں نہیں ہے۔ کمال احمد نے بہت سی پتے کی باتیں کہی ہیں اس لیے ان کا تبصرہ بہرحال اہم ہے۔ میں بھی اس پر کسی وقت لکھوں گا۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ چند صفحے آپ کے 'عصری ادب' کے لیے ہی لکھ دوں۔

آل احمد سرور۔ سری نگر

"عصری ادب" کا تازہ شمارہ دیکھا۔ ایوب مرزا اور کنول نین پرواز کی تحریریں بہت دل چسپی سے پڑھیں۔ وحید اختر کی نظم بہت خوب صورت ہے۔ ناظمین جو حمید بیگم کی شہادت کا حوالہ ہے اس سے تو آپ واقف ہیں۔ ایک بار ملا تھا کہہ رہے تھے لیکن اب انھوں نے پھر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے

یہ معلوم تھا کہ آپ شاعری بھی کرتے ہیں اور نیم دستاد ستہ...

لکھی ہیں۔ اس شمارے کی جان "آتش چنار" پر کمال احمد صدیقی کا بے لاگ تبصرہ ہے۔ کشمیر کی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے اور اس عہد کے بیشتر واقعات کے وہ عینی شاہد ہیں۔ ان کی تحریر کی روشنی میں شیخ صاحب کے متعدد بیانات مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ بعض امور جن کا ذکر ضروری تھا شیخ صاحب نے مصلحتاً ان سے احتراز کیا ہے۔ بعض بیانات میں مبالغے کی بھی جھلک ہے۔ کمال صاحب کے تبصرے کی غالباً یہ پہلی قسط ہے۔ اگر ایسا ہے تو دوسری قسط کا انتظار رہے گا۔

مختار الدین احمد۔ علی گڑھ

۱۔ مضمون سے پہلے ایک مختصر سا تعارف نامہ شائع کرنے سے مضمون کی افادیت بڑھ جائے گی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے رسالے کے پڑھنے والوں میں ہر شخص کا علم، معلومات اور عمر یکساں نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر مجھے بلراج ساہنی کی عظمت بالکل معلوم نہیں۔ یہ تعارف نامہ مصنف کا بھی ہو۔

۲۔ مضمون نگار کا مکمل پتہ (ڈاک کا پتہ) ضرور شائع کیا جائے۔

۳۔ آپ ایک موضوع دے کر ایک علمی مباحثہ تحریری طور پر شروع کریں۔ موضوع کے چناؤ کے لیے بھی آپ ایک اعلان نکال دیں اور پڑھنے والوں سے ایسے موضوع مانگیں جن کا صرف اردو زبان سے بلکہ زندگی سے بھی تعلق ہو۔ انیس و دبیر، مومن و غالب سے دنیا عاجز آ چکی ہے۔ یا یوں کہیے کہ گراموفون کی سوئی اپنے بزرگوں کی تعریف پر ہی اٹک کر رہ گئی ہے۔ آپ کے رسالے کا نام تو عصری ادب ضرور ہے لیکن (کم از کم) اِن دو شماروں میں ماضی ہی ماضی نظر آتا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو آپ کا موقر رسالہ اس سوئی کو آگے بڑھا سکتا ہے۔

اس مباحثے سے ایک دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ نوعمر اور غیر ادیب بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے۔

الفاظ کی تعداد محدود کر دیں یعنی صاحب مضمون کو لازم ہو جائے کہ [illegible] میں بند کیے!

۴۔ میں ایک موضوع تجویز کرتا ہوں:
"اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے رومن رسم الخط لازمی ہے"
میرا مضمون جو موضوع کے حق میں ہے تیار ہے۔ اگر آپ منظور کریں تو اسے میں فوراً بھیج دوں گا مگر میرے مضمون کے ساتھ کم از کم ایک مضمون رومن رسم الخط کے مخالفین کا بھی ہونا شرط ہے۔

محمد نعیم اللہ۔ لندن

'عصری ادب' کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کے پچھلے خط کا کچھ ایسا مغموم تاثر رہا تھا کہ کچھ کہنے یا لکھنے کا یارا ہی نہ رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جن امور کی نشاندہی آپ نے کی تھی وہ سب ہی سو فی صدی کی حد تک حقیقت پر مبنی تھے۔ اب عصری ادب دیکھ کر بہت ہمت بندھی اور خوشی ہوئی کہ "ہم اپنی وضع کیوں بدلیں" کے بمصداق آپ مصروف جدوجہد بلکہ مصروفِ جہاد ہیں۔

زبان کے سلسلے میں خاص طور پر عمل استعمال اور املا کے باب میں، ظاہر ہے استنادی حیثیت آپ ہی اہل علم اور اہل قلم کی ہے۔ روشنی ہم ایسے بے بضاعت لوگوں کو آپ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ میری ساری بساط دو تین کتابوں کی مرہون منت ہے۔

۱۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول 'شریف زادہ' اور 'امراؤ جان ادا' کے نسخے مولوی نورالحسن علوی نیر کاکوروی کو پیش کیے تھے۔ نیر کاکوروی ان دنوں [illegible] اور ایٹہ میں وکالت کرتے تھے اور نوراللغات کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اسی زمانے میں ان کے سگے بھانجے امیر احمد علوی نیمچ چھاؤنی میں مجسٹریٹ تھے چونکہ ان کا بھی مشغلہ ادبی و علمی تصانیف تھا اس لیے نیر کاکوروی نے بہت سی کتابیں امیر احمد علوی کو دے دیں ان کے بڑے صاحبزادے مشیر احمد علوی (والد مرحوم) نے کاکوری میں ایک اچھا کتب خانہ قایم کیا اور جو کتابیں [illegible]
[illegible]

کتابیں دالدمرحوم کی ذاتی لائبریری (الٰہ آباد) میں لگی رہتی ہیں میں نے والد اور دالدہ کی بہار کے ساتھ بہت ہی بچپن میں دونوں ناول کئی کئی بار پڑھے۔ دونوں برتاؤ اور نئی چل کے نشانات جگہ جگہ تھے۔ والد مرحوم نے بتایا کہ ان دونوں کتابوں کے محاورات اور ترکیب کوثر کاکوروی نے بطور سند استعمال کیا تھا مولوی نیر کاکوروی کے بعض نوٹ "مکھنؤ میں مستعمل ـــــ دہلی میں نامقبول" وغیرہ وغیرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ان ہی شذرات کے ذریعے اردو زبان سے کچھ شد بد ہوئی۔

۲۔ دوسری کتاب، وہ بھی بہت ہی بچپن کا تاثر ہے۔ میرضامن علی (جلال لکھنوی) کی تصنیف "سرمایۂ زبان اردو" تھی۔ اس میں مذکر و مونث کی بحثوں کے علاوہ بعض ترکیبوں، ضرب الامثال اور محاوروں کے استعمال پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ مثلاً اب تک یاد ہے کہ انھوں نے "من گھڑت" پر زور دیا ہے اب لوگ اس کو من گھڑت لکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے دل سے لوگ بعض باتیں گھڑ لیتے ہیں جو گڑھنا، یعنی وضع کرنا جیسے سنار زیور گڑھتے ہیں یا لوگ افواہیں گڑھتے ہیں۔ مگر اب میں خود بھی جب کوئی چیز لکھتا ہوں تو باوجود تاکید کے اکثر رسائل گڑھنے کے بجائے گھڑنا لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً "افکار" میں میں نے لکھا تھا "یہ بات انھوں نے برجستہ گڑھی تھی" چھپ کر وہ جملہ اس طرح ہوگیا "وہ بات انھوں نے برجستہ گھڑی تھی"۔

۳۔ تیسری کتاب جس نے زبان سیکھنے میں مدد کی ڈاکٹر عبدالحق کے خطبات و مقالات کا ایک جامع مجموعہ تھا۔ یاد نہیں کس نے کہاں چھاپا تھا مگر الٰہ آباد میں والد کی لائبریری میں بہت نمایاں رکھا رہتا تھا اس میں زبان آسان سے آسان لکھنے اور املا کو عربی و فارسی کے اثرات سے پاک کرنے پر زور دیا گیا تھا ... کہا گیا تھا لوگ اِشاعت کو اشاعت لکھا کریں مگر مدیران جرائد نے ہمیشہ اس ... وغیرہ۔ لکھتا ہوں مگر لوگ اس کو وطیرہ کر دیتے ... میں خلاف نہیں کی۔ چنانچہ زبان و بیان کے

بارے میں کوئی توجیہات ہی نہیں ہیں۔ جب لوگوں میں لندن [illegible]
ٹائمس میں ایک ہی لفظ کو مختلف املا سے لکھتا ہوں جب کہ کارکنان اور [illegible]
میں وہی لفظ دوسرے املا — اور اکثر تو دوسرے معنوں میں استعمال کرتا [illegible]
میں نے خود کبھی MOSLEM نہیں لکھا مگر سنڈے ٹیلی گراف میں یہی املا استعمال
کرنا پڑتا ہے جب کہ ٹائمس تک میں MOSLEM رائج ہو گیا ہے چونکہ انگریزی کے
اخباروں کے گھریلو انداز HOUSE STYLE مختلف ہیں اس لیے مدیران [illegible]
(یا کاتب حضرات) کی تصحیح پر جھنجھلانا بالکل چھٹ گیا ہے میرا خیال ہے کہ آپ
خود جو طرز فغاں ایجاد کریں گے وہی اہل گلشن (اگر اس نام کی کوئی چیز باقی
بچی) کی "زبان ٹھہرے گی" پھر ہم یا ہمارے بعد آنے والے مستند آپ ہی کو مانیں گے
اور حوالے بھی آپ ہی کے طرز استعمال کے دیں گے۔ ندامت یہ ضرور ہے کہ میرے
ایسے کم علم کی رائے کو آپ نے اہمیت دی حقیقت حال یہ ہے کہ "من آنم کہ من دانم"

ہاں اب یہ ذکر بھی ہو جائے۔ شیخ عبداللہ کی سوانح حیات پر کمال احمد صدیقی کا
وقیع اور بہت ہی قابل غور تبصرہ پڑھا۔ کچھ ایسا اشتیاق ہوا کہ آتش چنار کے حصول
کی کوشش شروع کر دی بالآخر فاخر حسین صاحب کے ذریعے حاصل ہو گئی اور
پڑھی .... ہم نے اور بھائی نے مل کر .....

معاف فرمائیے۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد — کمال احمد صدیقی کے جامع
تبصرے کے بعد — اور ہندوستانی سیاسی افق سے تھوڑی بہت واقفیت کے بعد
بھی یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ مرحوم تھے کیا؟ محب وطن تھے کہ غدار؟ شیر کشمیر تھے یا
صداقت آشرم کی بکری؟ مجاہد ملت تھے کہ ننگ قوم؟ صاحب ایمان و یقین تھے یا
بے ایمان و ننگ دیں؟ شیخ حرم تھے کہ ابن دیر؟ مرحوم نے ساری عمر سرکاری
مہمان خانوں ہی میں گزاری۔ خواہ وہ جنوبی ہند کے جیل خانے ہوں یا [illegible]
میں وزیراعظم کی قیام گاہیں۔ وہ کس حیثیت سے کس جگہ مہمان [illegible]

دیوبند جب تک یہ نہ طے کیا جائے کہ شیخ مرحوم کہاں تھے۔ بطور تیسودیا ہوں کے تہا اس کاروں اور دیوبند کے شیوخ الہند سے حضرت کے ساتھ اس وقت تک جاری تو رہنے ہے کہ سوانح عمری کسی دستاویز نوعیت کے زمرے میں شامل نہ کی جاسکے گی۔ یوسف ٹینگ صاحب کا اصرار ہے کہ کتاب کے تمام جملے اور فقرے خود شیخ مرحوم کے فرمودہ ہیں۔ تاہم بقول کسے ثبت است بر جریدۂ عالم..... وغیرہ والی بات کہاں؟

قیصر تمکین۔ لندن

گوشہ مشتاق یوسفی تو پسند تھا ہی، پڑھنے سے پہلے کیونکہ میں نے ان کی سب کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ لیکن آپ نے ان پر مضمون بہت خوب لکھا ہے۔ آپ کی رائے حرف بہ حرف درست ہے۔ آپ نے ان کے طرز تحریر کو پیرا ہن یوسفی خوب کہا ہے۔ اس کے کئی پہلو اور معنی تہ در تہ بات ہے۔ واقعی انھوں نے نثر کو آرٹ بنا دیا۔ "ہر جملے کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے" کیسا فکر انگیز جملہ لکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب، آپ نے بھی ایک ایسا جملہ لکھا ہے جو میں یہاں نقل کر رہا ہوں "ہر عظیم صورتی کا صحیح ردعمل اس کا مقابلہ اور تجزیہ نہیں بلکہ سپردگی ہے۔" مشتاق یوسفی نے جو بات ضیاء محی الدین کے لیے کہی ہے کہ 'لفظ کا مزاج' وہ جانتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جو منظر کشی اجنتا ایلورا کی نقاشی اور سنگتراشی کے سلسلے میں وصل نا آشنا ان ترسے برہم چاریوں اور بھکشوؤں، جن پر بھوگ بلاس حرام تھا۔ اور جو عورت کے جسم کو صرف سپنے میں دیکھتے تھے۔ یہ ان کی ہنر مندی اور صناعی کی اپنی مثال آپ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی کام اردو نثر میں [illegible] سے وہی بڑا کام یوسفی صاحب نے لیا ہے یعنی الفاظ سے لہو کی گردش اور بوب عجب الاؤ کھڑا کیا ہے۔

TC :EE LIPE [illegible] ساتھ

مرزا عظیم بیگ چغتائی پر ان کے صاحبزادے کا مضمون پڑھا زندگی کے ایک نئے پہلو سے آپ نے آشنا کر دیا۔

ملزاج ساحنی پر بھی ایک اچھا مضمون تھا مجھے ادھورا سا لگا۔ آپ نے بیکل اتساہی کی دو تصویریں ایک ہی شمارے میں شائع کی ہیں اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

آپ کا اعلان برائے اشاعت "تذکرہ شعرائے ہند" بھی پڑھا یہ تو بہت بڑا کام ہے انسائیکلو پیڈیا کی طرز کا کام ہے۔ یہ تو بہت بڑا منصوبہ لگتا ہے۔ آپ نے پہلے بھی بہت بڑے بڑے کام کیے ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ اس کو بھی مکمل کریں گے۔

' باعث تاخیر' میں آپ نے بہت خوبصورتی اور اختصار سے کیا ہے کہ وہ بات جو میرے اور آپ کے درمیان اکثر ہوتی تھی کہ اب دنیا پر بیسرونن اور منشیات فروشوں کی اجارہ داری ہے۔ اور اب ان لوگوں نے ادب اور آرٹ کی بھی سرپرستی شروع کر دی ہے فلمی حلقوں میں تو ان کا بہت اثر ہے۔ مدر ٹیگن کی بلیہ محترمہ کا بھی تذکرہ آپ نے خوب ذکر کیا ہے۔ لندن میں نعیم اللہ صاحب کی فکر انگیز بات کو بھی آپ نے لکھا ہے ہم حال کے نئے سائنسی تقاضوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں —

' معصری ادب' کو اس بارے میں پہل کرنی چاہیے ایک گوشہ اس کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں دوسری زبانوں کے تراجم بھی ہو سکتے ہیں۔ اردو میں طبع زاد لکھنے والے مشکل سے ملیں گے۔ جب کوئی مضمون طبع ہو گا تو اس میں دل چسپی لینے والوں کا ایک نیا حلقہ ضرور پیدا ہو گا۔

لیاقت حسین۔ دہلی

" معصری ادب ۲۰۰۰ کے صفحہ ۱۳۳ پر ایک نظم " بدلتے سائے " کے عنوان سے شائع ہوئی جو میرے نام سے ہے شاید کتابت کی غلطی ہوئی یا ترتیب دینے میں کسی اور شاعر کے بجائے میرا نام چھپ گیا ہے۔ نظم پڑھنے کے بعد میں ...

کسی بات میں تلاش کرتا یا کسی نظم میں ملی، یہ نظم میری نہیں ہے کسی اور کی ہے غلطی سے شائع ہو گئی ہے۔

بیکل اتساہی۔ نئی دہلی

آئینے تیرے آئینے دیکھ لیے۔ جو کچھ آپ نے کہا حرف بحرف صحیح ہے۔ لیکن اس وبا کو روکا کیسے جائے۔

خوشامدی ادب کے علاوہ اب تو بکاؤ ادب بھی تخلیق کیا جا رہا ہے یعنی پیسہ پھینکو اور افسانے لکھوا لو، ناول لکھوا لو، نقاد خرید لو، مبصر اور تبصرہ خرید لو۔

پھر بھی اجالے کی کرنیں کہیں نہ کہیں سے تو پھوٹتی ہی رہتی ہیں۔

شفیقہ فرحت۔ بھوپال

جنوری ۱۹۹۲ء کا "عصری ادب" ملا۔ بلراج ساہنی والے مضمون کو چھوڑ کر پہلے سے آخری صفحے تک پڑھ ڈالا۔ لکھنؤ اور دریا آباد کے سفر سے آج ہی صبح پانچ راتوں کے بعد لوٹا ہوں۔ کتاب بیوی کے ساتھ آنے کی یاد داشت سے لکھ رہا ہوں۔

مشتاق یوسفی کی چاروں کتابیں گرمیوں میں پڑھ چکا ہوں۔ آپ کی ستائش بہت پسند آئی مصنف کے کھلے ذہن، دردمند شعور، عام طور پر بھی جمہوری اور ترقی پسند رویے کو آپ نے بالکل صحیح طور پر سراہا اور اس کا حق ادا کیا ہے۔ میں خود ان پر لکھنا چاہتا تھا مگر اس کے لیے مجھے دوبارا در پڑھنا پڑے گا اور اتنی فرصت کہاں سے لاؤں۔ آپ کی نگارش بہت قابل [illegible] ہے۔ بلکہ ان کے بعض محاوروں، اکثر انگریزی کی غیر ضروری یورش [illegible] ہے۔ آپ [illegible] میں پہلا مضمون بھی تھوڑی کوشش سے جیسے [illegible] وہی [illegible] تا ورد کلاں ہیچ کا پیچ دوبارہ بیان کرتے کوئی [illegible] ہو جائے۔ ورنہ اس حالت میں مشرقی [illegible]

ہوتا ہے۔ پہلو ئے ذم اکثر ۷۵ ہے اس سے انھیں بچنا چاہیے۔

انٹرویو سے ان کے ادبیانہ رویوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور انھوں نے اپنے مجلے کے آخر میں جو مزاح کا پہلو نکالا ہے خوب نہیں بہت خوب ہے۔

عظیم بیگ پران کے صاحبزادے کا مضمون دل کو چھوتا ہی نہیں، زخمی کر جاتا ہے۔ کیسے باہمت اور صاحب الارادہ تھے! ہمارے معاشرے میں زیادہ تر تو مظلوم ہی رہے ہیں اور "سیانے" ہمیشہ بے وقوفوں پر ہی زندہ رہے ہیں۔ حالانکہ یہاں مزاح نگار اہل قلم انسانی ہمدردی کا مرقع تھا مضمون ذرا کھردرا ہے مگر یادگار رہے گا۔

آپ کے اداریے بہت معلوماتی ہیں۔ بس حالاتِ حاضرہ کے خاتمے پر اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے ؏ ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے۔

تیسرے اہم کتابوں پر ہیں، لائبریری میں منگاؤں گا کہ خود اتنی دولت کا مالک نہیں۔

سعید الظفر چغتائی۔ علی گڑھ

"عصری ادب" جنوری ۹۲ء موصول ہوا تسلسل میں گو چند ماہ کا تعطل ہو آیا، مگر اب یوں لگتا ہے کہ پرچہ اپنی پچھلی آن بان اور دلکشی کے ساتھ فکر و عمل کے نئے راستوں میں آگہی اور بصیرت افروزی کی شمعیں روشن رہے گا۔

زیر نظر شمارے کے آرٹیکلز تیرے آئینے میں ہمارے عکسی پیکر اتارتے ہوئے نئے مسائل کو تہہ آب سے سطح آب تک لے آیا ہے۔ علم و ادب کی توقیر اگر قائم رکھنا ہے تو ایسے رجحانات کو شکست دینا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

ہاں صاحب! ہمارے لندن کے کرم فرما نعیم اللہ صاحب نے اردو والوں کی جس طرف توجہ مبذول کرائی ہے وہ مسائل یقیناً موجود ہیں اور ان پر ہلکے

بہت ذی قدر دانشوروں ادیبوں اور شاعروں اور تخلیقی تنقید لکھنے والوں کو محدود فکر کرنے کی تلقین بے جا ہوگی لیکن سرے سے ہمارا ادب ان حسیات سے عاری ہے، یہ کہنا شاید غلط ہوگا۔

بات نکلی ہے تو یہ عرض کر دینے میں مضائقہ نہیں کہ آپ کے نامہ نگار نے اپنے منتخب مجموعہ مضامین ——— گر یہ چاہے بے خرابی جو ۹۰-۱۹۸۹ء میں طبع ہوا اس کے صفحہ پر "ادب کے نو بس کا مسئلہ" زیر بحث لاتے ہوئے تقریباً ویسے ہی سوالات اٹھائے ہیں جن کا ذکر آپ کی اور نعیم اللہ صاحب کی گفتگو کا موضوع ہے۔

اردو زبان و ادب ایک مخصوص تاریخی عہد، تہذیب اور کلچر سے اپنا خمیر اٹھا کر یہاں تک آئی ہے اور کم و بیش پچپن سال سے آزادی انسانی، ترقی پسند فکر اور حقیقت پسندی و سچائی کا پرچم اٹھائے معاشرے میں عدل و انصاف، فرقہ پرستی اور نسلی و لسانی بربریت کو اپنے اشعار نثری شہ پاروں، ناولوں افسانوں کی سپر پر روک رہی ہے اور دنیا سے ظلم اور ناہمواری کی شطرنجی بساط کو الٹ دینے کی [illegible]

خورشید عالم۔ کناڈا

Registration No
21887-71

[illegible]
07 [illegible]

ASRI ADAB

D 7, Model Town DELHI-9

پروفیسر محمد حسن کی تصانیف

۱. ادبی تنقید
۲. ہندی ادب کی تاریخ (طبع اول [illegible])
۳. مطالعۂ سودا
۴. اردو ادب میں رومانوی تحریک [illegible]
۵. ملال لکھنوی
۶. عرضِ ہنر
۷. معاصر ادب کے پیش رو
۸. جدید اردو ادب
۹. شناسا چہرے
۱۰. دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر [illegible]
۱۱. مشرقی تنقید
۱۲. ادبی سماجیات
۱۳. ادبیات شناسی
۱۴. ہیئتی تنقید (ہمدرد بک انٹرنیشنل)
۱۵. زنجیرِ نغمہ (شاعری)
۱۶. میرے اسٹیج ڈرامے
۱۷. موہنجوداڑو (ڈرامے)
۱۸. تماشا اور تماشائی (ڈرامہ)
۱۹. پیسہ اور پرچھائیں (ڈراما)
۲۰. ضحاک (اردو اور کنڑ ترجمہ)
۲۱. کہرے کا چاند (ڈراما)
۲۲. زلفیں زنجیریں (ناول)

۲۳. [illegible]
۲۴. [illegible]
۲۵. [illegible]
۲۶. [illegible]
۲۷. [illegible]
۲۸. [illegible]
۲۹. [illegible]
۳۰. [illegible]
۳۱. [illegible]
۳۲. [illegible]
۳۳. [illegible]
۳۴. [illegible]
۳۵. [illegible]
۳۶. [illegible]
۳۷. [illegible]
۳۸. [illegible]
۳۹. [illegible]

انگریزی میں

۴۰. [illegible] اقبال
۴۱. [illegible]
۴۲. اقبال [illegible]

ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹ [illegible]